سیلون کے ساحل
ہند کے میدان

سلمٰی اعوان

دوست پبلی کیشنز
اسلام آباد۔لاہور۔کراچی

انتساب

کولمبو وائی ڈبلیو سی اے کی اُن لڑکیوں اور عورتوں کے نام جو محبت سے بھری ہوئی تھیں۔ جنکا ذہنی افق بلند، پھیلا ہوا اور کشادہ تھا۔ جنہوں نے دل کی باتیں کیں اور میرے اوپر سری لنکا کی معاشرتی اور ادبی زندگی کے دروازے کھولے۔

تیئیس 23 سالہ دہشت گردی کی جنگ کے تحفے

خون میں بھیگا ہوا
اُس کا سفید لبادہ
کیا ملین پانی کے قطرے
اس کے دھبوں کو دھو سکیں گے
آنسوؤں اور درد سے بھرا ایک چہرہ
ماتم کناں ہے
ایک روشن چمک دار شعلے نے
پل بھر کیلئے لمبی سانس کھینچی
موت نے خاموش کر دیا

کیسا بھیانک کام
کتنی بڑی قیمت
درد کتنا گہرا
گالوں پر بہتے آنسوؤں کی بوچھار
ایک ماں کا بچہ چھن گیا
نڈھالی بڑھ گئی
خوشیوں نے منہ موڑ لیا
مہیب خاموشی بہت لمبی ہو گئی
ایک باپ اپنی لخت جگر کیلئے
ماتم کناں ہے
خیالوں میں اُداسی کا ڈیرہ ہے
کھانے کی میز پر وہ جگہ خالی ہے
جہاں امیدیں، خواب اور خواہشیں
اب کبھی میسر نہ ہوں گی۔

(ایودھا بندرا پریرا)

خراج تحسین

میں شہزادیوں کی تعریف کیلئے تو پیدا نہیں ہوا
میں شاہی محل کی آراستگی کیلئے پیدا نہیں ہوا
میں شاہوں اور ملکاؤں کی ثنا کیلئے بھی پیدا نہیں ہوا
لیکن
میں تو خوشبو پھیلانے کیلئے پیدا ہوا
ایک دلیر سپاہی کی موت پر سلامی دینے کیلئے
جس نے اپنی قیمتی زندگی وطن پر نثار کی
اُس کی آج کی بے حد اہم زندگی

ہمارے کل کو خوبصورت بنانے کو تھی۔ **(پیٹریشیا میز گالیکا)**

زندگی سیکنڈوں میں ختم ہوتی ہے

پیدائش کی ایک چیخ
کتنی جلدی موت کے نوحہ میں ڈوب جاتی ہے
جوانی کا ایک جوشیلا قہقہ
دراصل بڑھاپے کی جانب کا ایک بہاؤ ہے
نہ کہیں کوئی ٹھہراؤ اور نہ ہی واپسی
ہوا سے تیز چلتی ہے
وہ تمہاری اور میری زندگیاں ہیں

(ٹمنی شابندو)

اس لڑکی کیلئے جس نے مزاحمت کی

اُس کی برداشت کو بھولنا نہیں
اس کی بہادری پر کبھی شک نہیں کرنا
اس کی جدوجہد کے جذبے کو سراہنا
بعد موت چہرے پر پھیلی چمک کو
آنکھ کا تارا جاننا
ہر جاگتے لمحے میں
اُس کا نام یاد رکھنا **(ایودھا بندرا پریرا)**

امن کو دُنیا میں پھیلنے پھولنے دو

جب تم اسے دنیا میں پھیلانے کی کوشش کرتے ہو
تب نفرتیں تو کہیں منہ چھپا لیتی ہیں
اور محبت راج کرنے لگتی ہے

جب تم امن کو زندہ رکھنا چاہتے ہو
تب تم سفید فاختاؤں کو پرواز کی اجازت دیتے ہو
جب تم امن کا دروازہ کھولتے ہو
تب امن زندگیوں کو خوش آمدید کہتا ہے
جب تم امن کو پا لیتے ہو
تب یہ تمہارے ساتھ رہنا شروع کر دیتا ہے **(روی ساتسوم)**

باب نمبر:۱ لاہور سے سری لنکا جانے کی روداد

۱۔ زمانہ قدیم کے سیاحوں اور ماضی قریب کی یورپی قوموں نے اِس جزیرے کو رنگا رنگ ناموں سے نوازا۔

۲۔ نگمبو قدیم تہذیب میں سانس لیتا لنکا کے ساحلوں کا ایک

خوبصورت شہر۔

۳۔ بچے دو۔ سیکنڈری لیول تک تعلیم لازمی۔ کتابیں یونیفارم سب مفت

سچی بات اب آپ سے تو کوئی پردہ نہیں۔ دل کے دُکھڑے پھو لنے پھر و لنے کو بھلا کس کے پاس جانا ہے ہمیں۔ آپ ہی کے پاس نا۔ تو کہنے دیجیے کہ سری لنکا جیسے دیس کا سیر سپاٹا تو اوپر والے نے ہماری جھولی میں کچھ جھونگا سٹائل سے ہی ڈالا تھا کہ جو دراصل اُس کی اپنی فطرت کا غمّاز نہیں۔ بھئی اسکی خوبی تو بندہ جوڑے پلی پلی اور رام لنڈ ھائے کُپا سے جڑی ہوئی ہے۔ ہاں اِسے ہم اپنے محلے کی ہٹی والے پھاشیدے کے کھاتے میں ڈال سکتے ہیں کہ جسے مولا نے اپنے وصف کا پھورا سا (تھوڑا سا) عنایت کیا تھا کہ وہ محلے کے کبھی بچوں کو چھولے والے چونگے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کھٹی میٹھی اضافی مچھی والی گولی بھی عنایت کرتا تھا۔ تو یہ بھی بس ویسی ہی عنایت تھی۔

اب جس عزیز رشتہ دار نے سُنا۔ ناک بُھوں چڑھایا۔

''لو انگلینڈ جاتیں۔ امریکہ کا ٹکٹ کٹاتیں۔ اٹلی کا چکر لگاتیں۔ تمہاری قسمت میں تیسری دنیا کے پاکستان کی طرح دہشت گردی کے مارے یہ سستے سے ملک دیکھنے ہی رہ گئے ہیں۔''

بڑا دل خراب ہوا۔ منہ پھاڑ کر جوابی حملہ تو کیا۔

''ارے تم بدذوقوں کو کیا پتہ۔ کیسا فطرت کی رعنائیوں سے بھرا پُرا دیس ہے۔''

ساتھ ہی سانپ کے پھن کی طرح اِس سوال نے بھی سر اٹھایا کہ ''لو میاں یہ اوپر والا تو ہمارے ساتھ ہاتھ کر گیا ہے۔ ماٹھے سے، غریڑے سے لوگوں کو اپنے مزاج کے برعکس بس چونگے پر ہی ٹرخا گیا ہے۔ پر اب کوئی زور زبردستی تھوڑی تھی اس کے ساتھ۔ چلو شکر جو بھی وہ دے۔ سو بسم اللہ۔''

پروگرام میں اونٹ گھوڑے جوتنے والی مشقت کا بھی ذرا دخل نہ تھا۔ بس کمرے میں بیٹھے بیٹھے ساری معلومات اور مہر النساء سے گٹ مٹ ہوئی۔ اٹھے۔ پیسے کھیسے میں ڈالے اور ٹریولنگ ایجنسی کے دفتر جا دھمکے۔ ٹکٹ ہاتھ میں آیا تو رشک آیا۔ بے اختیار ہی ہونٹوں سے نکلا۔

''ارے کیا ہی اچھا ہو اگر دنیا کے دوسرے ممالک بھی ایسے ہی فیاض بن جائیں۔کمبخت ماروں نے اپنے ملکوں پر کتنے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ایسے ایسے بھاری بھرکم قفل اُنکے بوتھوں پر چڑھا دیئے ہیں کہ بس بندہ تو انہیں کھولتا کھولتا ہی ہوہان ہو جاتا ہے۔

اب طے تو یہی ہوا تھا کہ پہلا پڑاؤ کولمبو میں ہوگا کہ مرکزی شہر ہے۔مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔پی آئی اے کی فلائٹ سے کراچی پہنچے۔

کراچی ائیر پورٹ کی چھوٹی سی رنگ رنگیلی دنیا نیشنل جیوگرافک چینل کی کسی سکرین کی طرح نظر آئی تھی جس پر جیسے ایک botanical پروگرام چل رہا ہو۔اُس کے پستہ قد پودوں پر تروتازہ طوطے رنگے گراس ہوپروں کیطرح ائیر لنکا کی چار فضائی میزبانیں جب اچانک ہنستی کھلکھلاتی اُچھلتی پُھدکتی سبز پھولدار ٹخنوں کو چھوتے تنگ سے سکرٹ پہنے نمودار ہوئیں تو پھر میرے جیسی تماشہ بین کیلئے کہیں ممکن تھا کہ وہ اپنی چھوٹی سی گردن پر ٹکے سر کی دو حیرت زدہ آنکھیں اُنکے تعاقب میں دُور تک دوڑاتی نہ جائے۔میں یہی کام کر رہی تھی۔جب ایک شوخ سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ہرگز ہرگز اتنی خوبصورت نہیں ہیں کہ جنہیں یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا جائے۔''

اس درجہ بے تکلفی سے یہ بات کہنے والا خوش پوش اور خوش شکل سا ایک نوجوان تھا جو میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اپنی چمکتی آنکھیں میرے چہرے پر جمائے مجھ سے خاموش زبان میں پوچھتا تھا۔

''بوجھیں تو ذرا میں کون ہوں؟''

خوشگواری حیرت میری آنکھوں اور چہرے پر پھیل گئی۔مگر یاداشتوں کے پٹارے میں تیز رفتاری سے ہاتھ چلانے کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔شناسائی کے کسی سرپیر کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔خوش طبع لڑکا بھی مجھے زچ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔پھر اُسنے راستہ دکھانا شروع کر دیا اور جیسے آناً فاناً میرا چہرہ ہنسی کی پھوار میں بھیگ گیا۔

''تو تم ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور کنیز اعجاز کے بیٹے ہو۔''

اب یہ جاننے پر کہ میں سری لنکا جا رہی ہوں اُسنے معلومات کا انسائیکلوپیڈیا کھول دیا۔

''پہلے نگمبو جایئے۔قدیم تہذیب میں سانس لیتا ایک خوبصورت ساحلی شہر۔ائیر پورٹ کولمبو اور نگمبو کے عین درمیان میں ہے۔''

چلیے ٹرین کا کانٹا بدلا گیا۔

ایر لنکن فلائٹ کا وقت تو گیارہ بجے تھا۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی تو بیچاری کولمبو سے کراچی آنے والی ہواؤں کے شانوں پر لہراتی راستے کے پینڈے مارنے میں مصروف ہے۔ یوں ٹیک آف کوئی ایک بجے ہوا۔ کولڈ ڈرنک کے بعد جو کھانا دیا گیا وہ نہ قبول صورت تھا اور نہ ہی قبول سیرت۔ بس کانٹے چمچے کے ساتھ شور شرابا کرنے والی بات تھی۔ جہاز میں بہت سی سیٹیں خالی تھیں پر ہر قطار میں کوئی نہ کوئی سر نظر آتا تھا۔ اس لیے کہیں لیٹ کر تھوڑی سی نیند لینے کی عیاشی کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔

شب کے آخری پہر بندرانائیکے ایئر پورٹ پر میرے قدموں نے سمندروں میں گھری اس پُراسراری سرسبز زمین پر قدم رکھتے ہی مدھم سی زرد برقی روشنیوں میں لپٹے اجنبی سے آسمان پر ایک خاموش نظر ڈالتے ہوئے کہیں دل میں عجیب سے ہیجان آمیز احساس کی اثر آفرینی کو محسوس کیا۔

کلیرنس کے مراحل تھکا دینے والی بوریت والے تھے کہ سارے میں آبنوسی رنگ بکھرا ہوا تھا اور پیتھو گلیے قسم کے نقش و نگار اُن پر براجمان تھے۔ کہیں کوئی نظر نواز چہرہ دامن دل کو نہیں کھینچتا تھا اور آنکھ مایوس ہو ہو کر پلٹتی تھی۔

جب جہاز لینڈ کر رہا تھا اور منظر اتنا خوبصورت تھا کہ میری یادوں کی پٹاری سے ماریگنولی Marignolli کے احساسات کے نمائندہ یہ اشعار فوراً ہی نکل آئے تھے۔

میں سمندروں کے پانیوں میں محوِ سفر تھا
میری بصارتوں میں ایک پہاڑ ابھرا تھا
عظمتوں کے پیرہن زیبِ تن کیے ہوئے
میں سیلون کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوا
جنت اور سیلون میں کتنا فاصلہ ہوگا
بس تھوڑا سا ہی شاید چند قدموں کا
شاید یہ بھی جنت کا ہی کوئی ٹکڑا ہو
ہواؤں کے دوش پر بہتی
چند مترنم آوازیں
لگتا ہے یہ کسی آسمانی فوارے کا دل کش گیت ہے

جو میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے
یہ کائنات کا کیسا دل کش ٹکڑا ہے

زمانوں بعد اس وقت میں بھی کچھ ویسی ہی کیفیت میں تھی۔ مگر اب مجھے ہنسی آرہی تھی۔ ہائے ماریگولی نے یہ سب نہیں دیکھا تھا۔ صرف ساحلوں اور نظاروں پر مرمٹا تھا۔

کرنسی بدلوائی تو سو ڈالر نے پرس کو گویا گلے گلے تک رجا دیا۔ نو ہزار آٹھ سو چھیانوے روپے۔ عیش ہوگئی۔

گھڑی نہ میرے پاس تھی نہ مہرالنساء کے پاس۔ کسی سے پوچھنے پر پونے چار کا پتہ چلا۔ اندھیرے میں رکشوں، ٹیکسی میں سفر کرنے کی بجائے ہم نے پو پھٹنے کا انتظار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

اب سوچا کہ نماز پڑھ لوں۔ ایک دو سے جگہ کے بارے استفسار سے مجھے اپنے احمق ہونے کا شدید احساس ہوا۔

دس بارہ فیصد مسلمان اقلیت والا ملک بھلا ایسے مفت کے رولے رپوں میں کیوں پڑے گا۔ ایک خالی کمرے میں گھس کر قبلے کا تعین کیے بغیر اللہ اکبر کہتے ہوئے نیت باندھ لی تھی۔ اور جب دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تھے یہ سوال میرے ذہن سے نکل کر میری ہتھیلیوں پر بکھرتا میرے سامنے مجسم ہوگیا تھا۔

عرب تاجر صدیوں سے جنوبی ایشیا کے ان دور اُفتادہ جزائر کے ساحلوں پر اپنے سمپان (جہاز نما آبی کشتیاں) میں لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہ قول کے سچے اور وعدے کے پکے لوگ تھے۔ انکی ناپ تول کے پیمانے صحیح اور پورے ہوتے تھے۔ انکی چیزیں خالص اور ستھری ہوتیں۔ مقامی آبادی اُنکی آمد کی منتظر رہتی تھی۔ تو انہوں نے اسلام کے پھیلاؤ کے لیے کیوں کام نہیں کیا؟ آج یہاں 10, 12% مسلمانوں کا وجود تو کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔

جب واپس آئی مہرالنساء کا لہجہ گلے گلے تک تلخی سے بھرا ہوا تھا۔

''باہر نکل کر جائزہ لو۔ اب یہیں سڑنے کا ارادہ ہے کیا۔''

Exit والی لمبی راہداری میں قدم دھرتے ہی مجھے احساس ہوا جیسے انجانے میں میرا ہاتھ کہیں شہد کی مکھیوں کے چھتے پر پڑ گیا ہے اور میں چاروں طرف سے انکے حصار میں گھر گئی ہوں۔

ہوٹلوں کے ایجنٹوں اور ٹورسٹ گائیڈوں نے مار حشر کر دیا۔میری" ایوریج ایوریج" کی تکرار کچھ اِس شدت سے ہوئی کہ سمجھ لیا گیا کہ جس سے ماتھا پھوڑ رہے ہیں نہایت غریبڑی سی پارٹی ہے۔

چلو اچھا ہوا بیچاروں کو حقیقی چہرہ نظر آ گیا اور گھنیرے بادلوں کی طرح چھائی بھیڑ چھپٹ چُھٹا گئی۔اب نگمبو کے لیے 10 ڈالر پر کمرہ اور 500 سری لنکن روپوں پر سواری کا طے ہونے پر ہم سامان اُٹھا کر عمارت سے نکل آئے۔

باہر ایک ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔گاڑیوں کا شور اور سری لنکن پولیس کے خونخوار چہرے دہلائے دیتے تھے۔فضا پر ابھی بھی اندھیرے کا کہر سا چھایا تھا۔

"اللہ ان کی صبح کس موڑ پر بیٹھی ہے کہ نمودار ہونے میں نہیں آرہی ہے۔"

گاڑی میں بیٹھتے ہی ہماری آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔اسوقت صرف اور صرف بستر کی طلب تھی۔جب گاڑی رُکی تو نیند کے غبار سے اٹی ہوئی آنکھوں نے کمرے کو کُھلتے خود کو اس میں داخل ہوتے اور بیڈ پر گرتے ضرور دیکھا تھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی تھی۔

یہ نغمگی سے بھرپور کسی پرندے کی دل کو موہ لینے والی چہکار تھی جس نے مجھے جگا دیا۔مدہوش سی کیفیت سے جب ذرا نکلی تو جست لگا کر اُٹھی اور باہر آ گئی۔

کس قدر نکھری ہوئی صبح تھی۔پام، ناریل کے قد آور جھومتے درختوں پر سورج کی روشنی کسی دل پھینک عاشق کیطرح واری صدقے ہو ہو جاتی تھی۔اجنبی دیس کی ہواؤں کے روم روم میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔فضا ہریالی اور سبزے کے گہرے رنگوں سے جیسے دُلہن کیطرح سجی تھی۔لان میں بانسوں سے بنے شیڈ کے نیچے غیر ملکی جوڑے ناشتہ کرتے تھے۔

فضا کے اس الوہی حسن نے مجھے بے چین کر کے رکھ دیا۔جاگرز پہن کر میں باہر نکل آئی۔

"رندھایا Randiya ہوٹل۔"

میں نے زیرلب نام دہرایا۔اردگرد کی نمایاں چیزوں کو ذہن میں محفوظ کیا سڑک کا نام پروٹوتا Porutota روڈ چند بار دہرایا۔ذرا آگے جا کر احساس ہوا تھا کہ ہوٹل کا کارڈ لینا چاہیے تھا۔بہرحال آنکھوں اور دماغ دونوں کو چوکس کیا۔تھوڑا سا ڈپٹا بھی کہ دھیان

رہے وا پسی تیر تکلے کی سیدھی سیدھی ہونی چاہیے۔ بھٹکنے کی کوئی رعایت نہیں۔
چھوٹے چھوٹے بچے صاف ستھری یونیفارم میں اپنی ماؤں کی چھتر چھاؤں تلے سکولوں کیطرف رواں دواں تھے۔ بغیر آستین کے بلاؤزاور اونچے کھلے سکرٹ پہنے عورتوں کی مسکراہٹ دوستانہ تھی۔ مگر عجیب بات تھی پاؤں بیشتر عورتوں کے ننگے تھے۔
نےگمبو کی مین سڑک کی کیا بات تھی۔ لشکارے مارتا اسکا سیاہ چہرہ ہر قسم کے داغ دھبوں سے پاک دو رویہ درختوں کی ہریالی کے غازے اور شاندار ہوٹلوں، دوکانوں اور مکانوں کے زیورات سے سجا سنورا کیسا دلکش نظر آیا تھا۔ ساتھ ساتھ کچے راستے ماہی گیروں کی بستیوں کیطرف نکلتے تھے جن میں داخل ہو کر قدرت کا پُر ہیبت شاہکار سمندر نظر آتا تھا۔
میں سحر زدہ سی پیازی مائل ساحلی ریت پر چلتی گئی۔ دودھیا جھاگ اُڑاتی شور کریں مارتی لہریں اندر ہی اندر روٹیں بناتی کناروں پر آ کر پانیوں میں تحلیل ہو جاتیں۔
تاحد نظر پھیلے ہوئے اس سبزی مائل سلسلے پر جھکے ہوئے نیلے آسمان میں بیٹھا ہوا کوئی کتنا زبردست ہے کہ جب تک اس کا جی چاہے ان مچلتی، تڑپتی لہروں کو اپنی حد میں رہنے کے لیے نکیل ڈالے رکھے اور جب تماشا دیکھنے کا موڈ بنے تو ان کی رسی ڈھیلی کر دے۔
کون جانے کتنی صدیوں سے یہ اکھاڑ پچھاڑ کا کھیل جاری ہے۔ صورت گری نے کیا کیا روپ آپنائے۔ تیرھویں صدی کی آخری دہائی کا وہ اطالوی جہاں گرد مارکو پولو جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنوب مغرب کے اِن سمندروں میں پھرتے پھراتے ایک دن انہی ساحلوں کی طرف آ نکلا تھا۔ اپنی کتاب "Book Of Wonders" میں لکھتا ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی تو گنگ کھڑے قدرت کے اِس شاہکار کو دیکھتے تھے۔
زمانہ آج کا ماڈرن ہو یا ماضی بعید کا انسان کے اندر ہمیشہ کائنات کے اسرار کھوجنے، اُسے تسخیر کرنے کے رجحانات رہے۔ کشتیوں میں ہی چینی سیاح آئے، پھر یونانی آئے۔ پہلے نے اِسے خزانوں کی زمین کہا دوسرے نے "لال یاقوتوں کے جزیرے" کا نام دیا۔ ایسی ہی کسی منچلی قوم نے اِسے تمبا پانی Tamba panni کا نام دیا۔ اس کا مطلب اس کے ساحلوں کی تانبے رنگی مٹی سے تھا۔
"سراندیب جیسا" جیسا نام عربوں نے دیا، قریبی زمانوں کے سیاح کم، قبضے اور لوٹ مار کرنے والی بدنیت قومیں زیادہ تھیں۔ یہ پرتگیزوں کو بھی بڑا بھایا تھا۔ سیلوو Ceilao نام اُنکا تھا۔ زیلین Zeilan خیر سے ڈچ قوم اور سیلون انگریزوں کے عطا کردہ تھے۔

1948 میں اس کے اصلی باسیوں نے آزاد قوم بن کر 22 مئی 1972 کو اسے سری لنکا بنا دیا۔

ناموں میں کیا رکھا ہوتا ہے۔ جو کہتے ہیں قطعی غلط ہے۔ جنہوں نے اِسے نام دیئے۔ سوچ سمجھ کر اس کے اوصاف دیکھتے ہوئے دیئے اور بھئی کیا خوب دیئے۔ جزیرہ تو واقعی ایسا ہی ہے۔

پُروا میں خنکی تھی۔ ماحول میں حُسنِ فطرت کا رس تھا اور میری آنکھیں عقیدتوں کے اظہار کے لیے بند تھیں۔ پھر جیسے آوازوں اور قہقہوں کے شور نے جگا دیا۔ چینی یا جاپانی جان پڑتے تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں۔ ہیلو ہائے ہوئی۔ سب جاپانی طالب علم تھے۔ لڑکیوں کے گال یوں جیسے پکی ملائی کے لیپ میں ڈوبے ہوئے۔ نازکی کا وہ حال کہ مانو پھونک مارو تو اُڑ جائیں۔ سب یار دوست جزیروں کے باسی ایک اور جزیرے میں موج میلہ کرنے آئے تھے۔ محبت بھری باتیں اور انداز بھی من موہنے تھے۔

اب ناشتے کی طلب واپسی کے لیے بضد تھی۔ ماہی گیروں کے گھروں میں جانے اور عورتوں مردوں سے گپ شپ کرنے کا ارادہ پھر پر رکھتے ہوئے ہوٹل چلی آئی۔ برآمدے میں کرسی پر بیٹھی نک سُک سے تیار مہر النسا مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے غصے کے کھولتے کڑاہے میں کود پڑی تھی۔

''سویرے سویرے تمہاری مٹر گشت شروع ہوگئی ہے۔ یہاں بُھوک سے دم نکلا جا رہا ہے۔''

میں نے جیسے کانوں میں کڑوا تیل ڈال لیا اور چپ چاپ چلتی بانسوں کے شیڈ کے نیچے جا کر بیٹھ گئی۔ بیرا رشتے دار نکلا یوں کہ باپ پاکستانی اور ماں سری لنکن تھی۔ ناشتے میں انناس کے دو قتلے، سلائس، جیم اور مکھن ملا۔ قہوہ کپ میں انڈیلا تو لگا جیسے پتی کا تو بچ ہی دیا گیا ہو۔

''میاں ہم تو چائے کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ بھاپ اُڑاتی خوشبوئیں بکھیرتی وہ چائے کدھر ہے، جس کا 'اے حمید' دیوانہ ہے اور جس کے تذکرے پڑھ پڑھ کر ہم بھی سری لنکا بھاگے چلے آئے ہیں۔''

ڈٹ کر ناشتہ کیا گیا۔ نئی بنائی گئی چائے کے دو کپ پیئے۔ پھر چھاتے ہاتھوں میں پکڑے اور چل پڑے۔

سری لنکا کو اگر دنیا کے نقشے پر دیکھا جائے تو یہ کسی نازنین کے رُخسار پر گرے کسی خوبصورت آنسو کی صورت دکھائی دیتا ہے اور اگر اسکی صورت گری کا مشاہدہ اسکی ملکی سطح پر کیا جائے تو لگتا ہے جیسے یہ کسی ماہ جبین کے کان کا وہ بُندہ ہے جسے بنانے والے نے بہت مہارت اور محنت سے نچلی گولائی کے ساتھ ساتھ بالائی حصے کی باریکی کو ڈیزائن کرتے ہوئے تراشا ہو۔

نگمبو سری لنکا کے مغربی ساحل کا ایک حد درجہ خوبصورت فشنگ ٹاؤن اور کاروباری مرکز ہے۔ہلکی سی ایک جھلک نے ظاہری حُسن کو تو آشکارہ کر دیا تھا۔ پر ناک نقشے سے تفصیلی آشنائی ابھی باقی تھی۔

آسمان نیلگوں نیلاہٹوں کے ساتھ اس درجہ شفاف تھا کہ اسکی طرف دیکھتے ہوئے ایک پُر ہیبت سے اسرار کے رگوں میں دوڑنے کا احساس ہوتا تھا۔دھوپ کی کیفیت کسی مٹیار کی نوخیز چیختی چنگھاڑتی جوانی کی طرح ہی تھی۔ یوں اسکے ساتھ ساتھ کبھی سراٹے مارتی، کبھی گدے ڈالتی اور کبھی لہریوں کی صورت ہوائیں بھی کسی تک چڑھی مٹیارن کیطرح جواپنی حریفوں کو تالیاں بجاتے ہوئے ٹھینگے دکھاتی ہیں جیسی تھیں۔

چھاتے ضرور رکھولے تھے پر بند کرنا پڑے کہ تیز بُلھے کی ایک ہی مارنے اُنکے حُلیے بگاڑنے کی پوری کوشش کی تھی۔ بیچارے لاہور جیسے شہر کی مست خرام ہواؤں کے عادی ایسی مار دھاڑ کو کب برداشت کرنے کے موڈ میں تھے۔

نگمبو کا سی سٹریٹ کا علاقہ Lewis palace کہلاتا ہے۔اسکی تنگ سی سڑک پر تین میل تک چلتے رہے۔ عالیشان ہوٹل، کیتھولک چرچ، ریسٹورنٹ، گھریلو دستکاریوں کی دُکانیں سرخ ڈھلوانی چھتوں والے پینٹ ہوئے گھروں کے مناظر نظروں میں یوں نمایاں ہوئے تھے جیسے املتاس کے پھولوں کا رنگ ایکدم آنکھوں میں کُھب سا جاتا ہے۔کہیں کسی کسی دوکان پر ہم نے تانکا جھانکی بھی کی۔

ساحلی علاقوں کی خاص سوغات ڈاب اپنے اندر توانائی کا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ سُن رکھا تھا کہ اور پڑھا بھی تھا کہ تھکن بلاٹنگ پیپر کیطرح چوس لیتی ہے۔اب ایسے میں دو دو پیا تو ضروری ہو گیا تھا۔کھوکھے والے کے کاٹنے کا انداز پاکستانی فلموں جیسا بڑھکیں مارنے والا ہرگز نہ تھا۔ سچ مچ ہی بڑا جارحانہ تھا کہ گنڈاسے کے ایک ہی وار سے کھوپڑی اُڑا کر دس قدم دُور پھینکی تھی۔

اب صرف کچے ناریل کا پانی پینے پر ہی اکتفا نہ تھا۔ بلکہ قریب ہی سیمنٹ کی ایک تھڑی پر بیٹھ کر اسکا اندرونی گودا شہدوں کیطرح یوں کھرچ کھرچ کر کھایا کہ جیسے اسے کھا کر جوان ہی تو بن جانا ہو۔

''چلو فشنگ ولیج چلا جائے۔'' میں نے کہا۔

یہ مچھیروں کی بستی جدھر سے ہم آئے تھے اُس طرف تھی۔اب بس میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔بس کیا تھی جیسے کینکارڈ طیارہ ہو۔تنگ سی سڑک پر گولی کی طرح بھاگی جاتی تھی۔ سٹیرنگ تو ظالم کے ہاتھوں میں جیسے کھلونا سا بنا ہوا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ ایسے سر پھرے اور من چلے تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں۔یہ سانولا سلونا ساتحفہ بھی انہی میں سے ایک ہوگا۔پر نہیں جی بعد میں جب سری لنکا کے مختلف شہروں کی سڑکوں پر بس پیمائی کی تو عقدہ کھلا کہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔کوئی آدھ انچ بھی دوسرے سے کم نہیں ہاں زیادہ ہی ہوگا۔ایسے ویسے من موجی اور آپ پُھدرے سے پاکستانیوں کو بھی پیچھے چھوڑ بیٹھے تھے۔کمبختوں کا بس نہیں چلتا تھا کہ بسوں کو بگٹٹ بھگاتے بھگاتے سمندر میں ہی جا کر دم لیں۔

جہاں اُترے۔وہیں سے کئی راستے مچھیروں کی بستیوں کیطرف نکلتے تھے۔ سرکیوں اور پلاسٹک کی چادروں سے بنے شیڈوں کے نیچے آبنوسی رنگت والے مرد اور عورتوں کا ایک ٹولہ بات بات پر ٹھٹھے لگاتا لمبے چوڑے جال کی ڈوریوں کو گانٹھنے میں لگا ہوا تھا۔موٹی موٹی عورتوں کے گالوں کی اُبھری ہڈیوں پر اندرونی صحت مندی کی چمک کا ایک لشکارہ سا تھا جو فی الفور آنکھوں پر گرتا تھا۔گدازننگی پنڈلیاں اور سڈول ننگے بازو سامانِ وحشت نظر تھے۔

جب پاس بیٹھے تو پتہ چلا کہ مرد کیا یہ بظاہر بھدی بھدی سی ناک والی عورتیں بھی ٹوٹوں میں انگریزی بول کر اپنا آپ ظاہر کر سکتی ہیں۔بڑا کھلا ڈلا ماحول تھا۔قہقہے اور چہلیں تھیں۔قریب رکھا ٹرانسسٹر زور شور سے بج رہا تھا۔ابھی موبائلوں والا عروج نہیں آیا تھا۔

شاید کوئی نیا گانا شروع ہوا تھا۔جیسے وہاں طوفان سا آگیا۔عورتیں چٹکیاں بجاتے ہوئے بولوں کو دہرانے لگیں۔بڑے مزے کا منظر تھا۔کچھ دیر بعد جب میں نے گیت کے بارے پوچھا تو پتہ چلا کہ محبت کرنے والا اپنی محبوبہ سے معافی مانگ رہا ہے۔اُسے آنسو پونچھنے کیلئے کہہ رہا ہے۔اُسے ترغیب دے رہا ہے کہ وہ اُسے اپنے ساتھ

کہیں لے جائے۔

میں پھنس پڑی۔

''یہ تو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔تمہارے ہاں کیا ایسا ہوتا ہے؟''

عورتیں کھلکھلا کر ہنسیں۔بڑے ٹھسّے سے گالی نکالی اور مردوں کی ماں بہن ایک کردی کہ یہ ہوتے ہی کمینے ہیں۔یہ سب گانوں میں ہے۔عملی زندگی میں ایسا کہاں؟کیسی دھڑلے والی عورتیں تھیں۔

مجھے اپنے وطن کے شمال کا ایک واقعہ یاد آیا تھا۔شاہراہ ریشم کے ایک ضلع چلاس میں اپنے سیر سپاٹے کے دوران ایک گھر کے سامنے ایک بہت خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔خوبانی کے پیڑ تلے بیٹھی بابو سر ٹاپ اپنے گرمائی مستقر جانے کیلئے سامان پیک کررہی تھی۔باتیں ہونے لگیں۔بچوں کا پوچھا۔جواب تھا بچہ نہیں ہے بارہ سال ہوگئے ہیں۔شوہر کے رویے اور سلوک بابت بات کی کہ دوسری شادی کرنے کا تو نہیں کہتا۔میں تو حیران رہ گئی تھی اس کا جواب کیسا کرارا تھا کہ مانو جیسے میرے بوتھے پر کھلا (جوتا) پڑے۔

''ارے بچہ نہیں ہوا تو مولا کی مرضی۔بندے کا کیا قصور؟ہاں بھڑوا نیا بیاہ کرے گا تو میرے لیے بندوں کی کیا تھوڑ۔''

واہ کیا بات تھی۔یہ اعتماد ہم جیسی پڑھی لکھی عورتوں میں کہاں تھا؟میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''کتنا کما لیتے ہیں روزانہ؟''

سوال پر ایک بڑا قہقہہ اور ہاتھ کا بڑا سا پھیلاؤ اُن جھونپڑیوں کی طرف ہوا جو ساحل کے ساتھ ساتھ تا حدِنظر تک پھیلی تھیں۔موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پر ہنسی کے ساتھ ساتھ آنکھوں نے کہا۔

''دیکھ لیجیے کتنی کمائی ہے۔''

ذرا فاصلے پر مچھلی بیچتی اور عورتیں بھی دوکانداری چھوڑ کر شیڈ تلے آگئیں۔تھوڑی سی گپ شپ اُنکے ساتھ رہی۔رنڈی رونے تو ایک جیسے ہی تھے مہنگائی کے،عورتوں کا وہی پرانا پسندیدہ گلہ شکوہ۔

بچوں کی تعداد پوچھنے پر پتہ چلا کہ حکومت کی خاصی سختی کے باوجود بھی نمبر اکثر بڑھ ہی جاتا ہے۔بڑی کمبختیں تھیں۔سیاہ مسوڑوں سے جھانکتے موتی جیسے دانتوں اور

چمکدار آنکھوں سے چھلکتی معنی خیز مسکراہٹیں بہت سے فسانے سُناتی تھیں۔
تعلیم، یونیفارم اور کتابوں کی فراہمی سب حکومت کی ذمہ داری ہے۔ بچے کو ہر صورت سکول جانا ہے۔حکومت کا حکم ہے۔
اس حکم کی پاسداری کا کتنا خیال رکھا جاتا ہے؟ جاننا چاہا اور جواب تھا۔ فائدے اور بھلے کی بات کیوں نہ مانیں۔
کہیں سینے میں "کاش" کی ہوک اُٹھی تھی۔ مجھے یاد آیا تھا حکومت نے ضلع چلاس اور اس کی تحصیلوں میں بچوں کے لیے ضروری سکول جانے اور وظائف کے اجراء کا اعلان کیا اور اس کی تکمیل کے لیے زور زبردستی بھی ہونے لگی۔ایک دن ایک مقامی نوجوان لڑکا ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔
''تم کو سکول لگانا ہے تو لگاؤ۔پر شام کو لگاؤ نا بابا۔یہ سویرے سویرے کا سلسلہ تو ہم کو مافق نہیں۔''
ہیڈ ماسٹر نے رسان سے کہا۔
''سکول تو صبح ہی ہوتا ہے نا بیٹے۔''
بیٹے کا بچہ لڑکا تلملا کر بولا۔
''ہم سویرے کو ادھر سکول آئے گا تو اُدھر بکریاں تمہارا باپ چرائے گا۔''
دیسی پیاز کی بیرونی پرت جیسے رنگ والی ریت پر کھڑی یہ بستی خوشحالی اور غریبی دونوں طبقوں کی عکاس تھی۔غریب جھونپڑیوں میں کیا کھانے پکانے کی جگہ اور کیا سونے کی یہ دیڑ دیڑ ریت ہی ہر جا پردان تھی۔ہاں البتہ پھولوں سے سجے آنگن اور پلاسٹک کی شیٹوں سے ڈھپے فرش اور کمروں میں میز کرسیوں اور کھانے پینے کے برتن بھانڈوں اور جام چٹنیوں کے جار بتاتے تھے کہ یہاں مکین کھاتے پیتے بھی ہیں۔
پر یہ کیسے لوگ تھے۔پھولوں، پودوں سے محبت کرنے والے موسیقی سے پیار کرنے والے کہ ہر جھونپڑی اور ہر گھر میں ٹرانسسٹر بجتا تھا اور گیت فضاؤں میں بکھرتے تھے۔پوری بستی میں ایک بھی جھونپڑی ایسی نہ تھی جہاں بوگن ویلیا کی بیلیں نہ ہوں۔شیشوں کی بوتلوں اور جاروں میں منی پلانٹ کی بیلیں نہ سجی ہوں۔
گھروں میں جھانکتے، مردوں عورتوں سے باتیں کرتے، مچھلی کی بُو سونگھتے کتنا فاصلہ طے کر آئے تھے۔پھر ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے پڑی آرام دہ کرسیوں

پر ڈھے گئے۔

میرے سامنے لامحدود وسعتوں والا سمندر تھا۔ سانپ کیطرح بل کھا کھا کر چلنے والی ہواؤں کی خنکی اور مستی تھی۔ شوریدہ سر لہروں کا بہت دور سے وٹیں بنا بنا کر آگے تک بڑھنے اور پھر واپس لوٹ جانے کا ایک مسلسل عمل تھا۔

یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے میں صرف یہی سوچے چلے جارہی تھی کہ اگر یہ لہریں کہیں غضب میں آجائیں تو چٹائیوں، بانس، ناریل کے گھاس پھونس اور مٹی گارے سے بنے والی یہ جھونپڑیاں اور اُنکے مکین کتنی دیر مزاحمت کریں گے؟

''ڈمبیلی پئیں گی؟'' ریسٹورنٹ کے سولہ سترہ سالہ لڑکے نے پاس آکر پوچھا۔

''ڈمبیلی؟ استفہامیہ انداز میں اُسے دیکھا گیا۔

اُس نے آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سے میری پشت پر ناریل کے قد آور درختوں سے لٹکتے گولڈن پھل کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا تو یہاں یہ ڈمبیلی ہے۔ بنگلہ دیش میں ڈاب ہے۔''

ہم سے تھوڑے فاصلے پر ایک جرمن فیملی کی عورت اور لڑکیاں چڈیوں اور ننھی مُنی سی براہ میں سمندر میں غوطے مارنے، ریت پر ستانے اور ڈمبیلی پینے میں جُتی ہوئی تھیں۔ نہ انہوں نے ہمیں منہ لگایا اور نہ ہی ہم نے چاہت میں اُچھل کود کی۔

دور اُفق اور سمندر کو ملتے دیکھتے، ہواؤں کے جھلاروں میں مستی سے بے خود ہوتے گھونٹ گھونٹ ڈمبیلی پیتے پیتے ''گیارہ بجے ہیں'' کا سن کر حیرت زدہ سے ہو گئے۔

''لو نور پیر کے ویلے سے جنگل خواری میں جُتے ہیں اور ابھی صرف گیارہ ہوئے ہیں۔ یہ اجنبی جگہوں پر سمے تو جیسے پیر ہی پسار لیتا ہے۔ سمٹنے میں ہی نہیں آتا۔

''ہائے یہ تو ٹی ٹائم ہے۔ اچھی سی چائے کا کپ۔ یار بہت طلب ہو رہی ہے۔ چلو کہیں چلتے ہیں۔''

خدا کا شکر ہی تھا کہ مہرانساء میری طرح اچھی چائے کی شوقین نہیں عادی تھی۔ اب اِدھر اُدھر چھوٹے موٹے ریسٹورنٹ کی تلاش ہوئی۔ پھر سوچا ہوٹل چلتے ہیں۔ وہاں درختوں کے نیچے بیٹھ کر اچھی سی چائے کا لطف اٹھائیں گے۔ تھوڑا آرام بھی ہو جائے گا۔ رکشے میں بیٹھے اور ہوٹل آ گئے۔

چائے تھوڑا سا آرام اور پھر آوارہ گردی۔

باب نمبر:۲ نگمبو

۱۔ شہر میں بکھرے تعمیراتی حُسن کے نادر نمونے اعتراف تھے کہ ان چور اُچکی یُورپی قوموں نے جنوبی ایشیائی ملکوں کو اگر لوٹا ہے تو کچھ دیا بھی ہے۔

۲۔ جب اکثریتی طبقہ اقلیتوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے گا تو پھر احتجاجی تحریکیں اور گولی کی سیاست رواج پکڑتی ہے۔

۳۔ سری لنکا مذہبی لحاظ سے چار خانوں سنہالی (بدھ)، تامل (ہندو)، مسلمان اور عیسائیوں میں بٹا ہوا ہے۔

پروٹوٹا روڈ پر چنسری جم اور جیولرز کا بورڈ دیکھ کر کیسے ممکن تھا کہ مہر النساء اندر نہ جاتی۔ پانچ مرلے کا گھر جس میں رہائش اور کاروبار دونوں زوروں پر تھے۔ برآمدے میں دُبلی پتلی عورت لوہے کے سٹینڈ پر Chess کی گوٹوں جیسی چیزوں اور پنوں کے ساتھ پون انچ چوڑی لیس بنانے میں مصروف تھی۔ لیس کا ڈیزائن اور نفاست دونوں ہی پھڑکانے والے تھے۔ بھاؤ تاؤ پچیس اور پندرہ روپے فی گز کی بحث وتکرار کے بعد بیس پر فائنل ہو گیا۔ سارا ایٹرن ہی خالی ہو گیا تھا۔

مہر النساء خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی کہ اُسنے ایسی شاندار ہینڈ میڈ چیز کوڑیوں کے مول خرید لی ہے۔ سوٹ پر لگے گی تو وہ لشکارہ پڑے گا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں تو بس پہلے ہلّے میں ہی زخمی ہو جائیں گی۔"

لہجے میں فاتحانہ غرور کا جوش غالب تھا۔ تبصرہ فضول تھا۔ اب بھلا مجھے کیا ضرورت

تھی کہ میں اُسے اپنے رازوں میں شریک کرتے ہوئے کہتی کہ ایسی چیزیں تو ہمارے صدر کے لنڈے بازار میں ٹکے ٹوکری مل جاتی ہیں ۔مزے سے اُسکا کھیسہ ہلکا ہوتے دیکھتی رہی ۔ہنستی رہی ۔دل میں خود کو شاباشی دیتی رہی کہ دیکھو کیسی سیانی ہوں؟

پھر یوں ہوا کہ جیسے ہی اُس عورت نے ملحقہ چھوٹے سے کمرے میں سری لنکا کی کانوں سے نکلنے والے قیمتی پتھروں کو سونے اور کوپر جیسی دھاتوں کی آمیزش سے ملا کر بنائے گئے زیورات کے چند نمونے دکھائے تو آنکھیں تو گویا پھٹنے والی ہو گئی تھیں ۔ایسے سُبک اور منفرد کہ جو ہاتھ میں پکڑو اسی پر دل مچل مچل جائے ۔ایسے ہنر مند ہاتھ کہ جنھوں نے ایک تولہ سونے کو گلے ہاتھ اور کانوں کی زینت بنا ڈالا تھا۔

اسی (80) ہزار روپے کا سن کر دھیرے سے اپنے ہاتھ میں پکڑا آرٹ کا شاہکار بریسلٹ مجھے خوش رنگ، خوشنما کوبرا سانپ جیسا لگا تھا۔ڈبے میں فوراً رکھ دیا تھا کہ معاملہ خطرناک ہے۔میرے سوال پر خاتون نے بتایا تھا کہ اُسکا شوہر بناتا ہے۔

''اللہ ایسے آرٹسٹ کے تو ہاتھ چومنے چاہئیں۔''عورت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ہمارے دائیں ہاتھ بے حد مختصر سا کچن تھا۔ایک نوعمر سی لڑکی ایک چھوٹی سی مشین پر کچے ناریل کو کش کر رہی تھی ۔اندر جانا اور وہاں کھڑے ہو کر پکنے والی چیزوں کا مشاہدہ نہ کرنا کتنی غلط بات تھی؟ سو سب سے پہلے تو چولہے پر رکھی اُس مٹی کی ہنڈکلیا کا ڈھکن اُٹھایا جس کے نیچے ابھی آگ نہیں جلی تھی ۔اندر گول گول پتلے پتلے کٹے ٹینڈے گولائی میں قطار در قطار رکھے ہوئے تھے ۔درمیان میں نمک مرچ ہلدی پیاز ٹماٹر اور میتھرے کا آمیزہ رکھا ہوا تھا۔یہ سبزی ناریل کے دودھ میں پکنی تھی۔اُبلے ہوئے چاول کے ساتھ ناریل کے دودھ میں پکنے والی سبزیوں کا سالن مقامی زبان میں ہوٹ کہلاتا ہے۔

ایک چھوٹے سے سٹول پر چھلے ہوئے نیم پختہ آموں کی لمبی لمبی قاشوں کی صورت والا آمیزہ پلیٹ میں دھرا رکھا تھا۔جس کے بارے میں خاتون خانہ کا کہنا تھا کہ ناریل کے دودھ میں بقیہ مسالوں کے ساتھ پکنے والی یہ ڈش امبا مولیوا کہلاتی ہے۔یہ کلاسیکل سنہالی ڈش ہے جو پانچویں صدی میں سگریا کے بادشاہ شاہ کسیاپا کے دسترخوان کی زینت بنتی تھی۔

''اللہ اب بھلا ایسے شہنشاہی سالن کی اجزائے ترکیبی جاننا کتنا ضروری تھا؟ سو فوری طور پر یہ کام کیا۔

پتہ نہیں کیسے یہ بات میرے اندر سے نکل کر میرے ہونٹوں پر آ گئی ۔ میں نے دوپہر کا کھانا انکے گھر اُنکے ساتھ کھانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور اسکے لیے پے منٹ کی پیشکش بھی کی ۔ دراصل میں معاشرتی تہذیب کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے کی خواہشمند تھی ۔ کاروباری عورت تھی ۔ چند لمحوں کی سوچ کے بعد سر اثبات میں ہلا گئی ۔

پر مہر النساء نے ہی ایڑی نہ لگنے دی ۔

''ارے کیا باؤلی ہو گئی ہو ۔ انکی ان ہنڈکلیوں میں پکا ہوا کھانا ۔ کیا نگی نہائے اور کیا نچوڑے گی والی بات ہو گی ۔ ہمارا تو حلق تالو بھی نہ گیلا ہو گا کہ انکی یہ مُنی مُنی سی ہانڈیاں خالی بھی ہو جائیں گی ۔''

اُسکی بات دل کو لگتی تھی ۔ چلو خیر پھر کہیں اور سہی ۔

اب ظہر کی نماز پڑھنی تھی ۔ مسجد کے بارے میں جانکاری ہو چکی تھی کہ کہاں ہے؟ دھوپ کے جوبن کا یہ عالم تھا کہ اگر پل بھر کے لیے ہوا رک جاتی تو یوں لگتا جیسے کسی تنور میں گر پڑے ہیں ۔ چلتے چلتے ہانپنے لگے جب کہیں مسجد کی صورت نظر آئی ۔

اجنبی جگہوں پر سجدوں کے لیے میں ہمیشہ مری جاتی ہوں ۔ شاید نہیں یقیناً نئی جگہ پر جسم کو خم دیتے ہی سر پر کیا روح بھی مکمل سپردگی کی مہکتی لپیٹ میں آ کر عبودیت اور عجز کے ایک ایسے فیز میں داخل ہوتی ہے جہاں آنکھوں سے بہتے آنسو اندر کا گند دھو کر وجود کو ہلکا کر دیتے ہیں ۔

ہلال کے چمکتے نشان ، مینار اور پُر شکوہ سی اس سفید عمارت کو دیکھتے ہی اندر سے اپنایت کے سوتے اُبل پڑے ۔ صحن سے برآمدے میں آئے جس کے ایک طرف پانی سے لبا لب بھرا تالاب تھا ۔ یہی وضو کے لیے جگہ تھی ۔ وضو میں کچھ ایسا ہی اہتمام تھا جیسے دھوبی گندے کپڑوں کی پھینٹائی سے قبل اُنہیں سوڈے کے کھارے پانیوں میں ڈبوتا ہے ۔

پر جب پٹڑے پر چڑھنے لگے تو روک دیئے گئے کہ دو لمبی داڑھیوں والے راستے میں حائل ہو گئے تھے ۔

''آپ لوگ عورتیں ہیں ۔ اندر نہیں جا سکتیں ۔''

''انہیں مسئلہ کیا ہے؟'' مہر النساء تلملانے لگی ۔

''عورتیں ہی ہیں نا بھئی ۔ کوئی نجس چیز تو نہیں ۔ آپ کے اور ہمارے نبی کی پسندیدہ مخلوق ۔''

مجھے بھی سخت تپ چڑھی تھی جو میرے منہ سے گرم اور زہریلی سی پھنکار کی صورت باہر نکلی تھی۔

''کہا نا آپ اندر نماز نہیں پڑھ سکتیں۔''معمر مرد نے ذرا ترشی سے کہا۔

''دین کی یہ ٹھیکیداری کن لوگوں نے آپ کو دی ہے یا یہ خدمات آپ خود ہی انجام دینے لگے ہیں۔خدا تو اپنے گھر میں کھلے عام سب کو دعوت دیتا ہے۔آپ پابندیاں لگاتے ہیں۔ہاں نماز تو ہم نے یہیں پڑھنی ہے۔''

اشارہ مسجد کے اندر کی جانب تھا۔

ہمارے ہٹیلے پن نے بیچارے کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

بڑے جزبز ہوئے تھے۔تا ہم پھر اشارہ کیا کہ اسطرف برآمدے میں پڑھ لو۔

''چلو خیر۔''

زیادہ تکرار ہم نے بھی فضول سمجھی۔تا ہم طبیعت سخت مکدّر رہوئی۔

برآمدے کی بیرونی دیوار کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے سمندر کے اوپر سے تیر کر آتی ہواؤں کے پنکھوں نے لطف دیا اور سر جھکانے کا مزہ آیا۔

اب بھوک کے مارے بلبلاتے پیٹ کو بھرائی کی ضرورت تھی۔رکشے میں بیٹھے۔ کیا مزے کا رکشہ تھا۔ڈیزائن تو قدرے ہمارے ہاں جیسا ہی تھا پر سیٹیں کیسی کشادہ اور آرام دہ،چاہے ٹانگیں پسارو،چاہے سمیٹو۔چھت بھی مضبوط کینوس کی تھی۔

کچھ کچھ پگوڈا سٹائل کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائینز چکن رائس اُڑایا۔چکن وکن تو کہیں نظر نہ آیا۔ہاں البتہ ذائقہ ٹھیک ہی تھا۔

ساری سہ پہر اور شام پُرتگیزوں کی یادگاروں کے نظارے کرتے گزاری۔ایک پرانے کھنڈر بنے ڈچ فورٹ اور نہایت خوبصورت،شاندار رومن کیتھولک چرچوں کو دیکھنے اُن میں عبادت کرتے لوگوں کو سُننے،کولونیل دنوں کو یاد کرتے اور ان سب کے پس منظر کے تناظر میں خود سے کہتے کہ یارا دامن دل کو کھینچتی ان شاندار عمارات اور گرجا گھروں کی رعنائیاں وزیبائیاں بتاتی ہیں کہ مغربی اقوام کی ان چور اُچکی ولندیزی پرتگیزی اور برطانوی قوموں نے جنوبی ایشیا کے ان ملکوں کو اگر لوٹا ہےتو کچھ دیا بھی ہے۔

کہیں رات ڈھلے واپسی ہوئی۔

رات کو جب سونے کے لیے لیٹے تو جہاں پروردگار کے حضور اس بات کی شکر

گزاری تھی کہ اُس نے رات آرام کے لیے بنادی ہے۔وہیں ٹانگوں میں اینٹھن بار بار اس غلطی کا احساس دلاتی تھی کہ زبردستی ان بے چاریوں سے انکی اوقات سے زیادہ مشقت لی گئی ہے۔پر اب اسکا کیا کیا جائے کہ آنکھ پھر بھی نور پیر کے تڑکے ہی کھُل گئی تھی اور میں بھی ڈھیٹ ہڈی کہ اُسی وقت باہر جانے پر آمادہ کہ ناشتہ بھی کہیں کسی دوسری جگہ ہی ہو۔

مہر النساء چیخی تھی۔

''کمبخت تیرا کونسا کڑوں پر مکھن سُوکھ رہا ہے۔کہیں حاضری دینی ہے تو نے۔ چائے کے بغیر میری تو ہڈیاں نہیں ہلنے کی۔چپکی بیٹھو۔تفریح کے لیے آئے ہیں جان کو عذاب میں ڈالنے نہیں۔''

اب چڑیوں کی چہچہاہٹ سُنتے تھے۔ہُد ہُد کی آوازیں دل کو زیرو زبر کرتی تھیں۔ بستر پر آنکھیں بند کر کے فراغت سے تھوڑی دیر لیٹنا اور ذہن کو ہر قسم کی سوچ سے خالی کرنا بھی خاصی بڑی عیاشی ہے سو ہم نے پورا ڈیڑھ گھنٹہ یہ عیاشی کی۔

خاصے بھاری بھرکم ناشتے کے بعد اپنے اندر جس توانائی کا احساس ہوا تھا اُس پر یقیناً مہر النساء داد کی مستحق تھی۔

بس نے ہمیں نگمبوٹی کے آخری سٹاپ پر اُتارا۔وسیع وعریض جھیل پر اُسوقت سناٹا سا تھا۔کشتیوں اور لانچوں میں شام والی چہل پہل مفقود تھی۔کشتی رانی سے خوب جی بھر کر لطف اندوز ہوئے۔اور جب مہر النساء دوکانوں میں مقامی مصنوعات دیکھتی تھی۔ملحقہ کشادہ گلیوں نے جیسے مجھے آواز دی۔

''آؤنا کچھ گپ شپ ہمارے باسیوں کے ساتھ بھی تو ہو۔''

خوشدلی سے لبیک کہا۔فٹ فٹ دبیز پیازی رنگت والی کہیں کہیں جگنوؤں جیسے لشکارے مارتی ریت سے بھری گلیاں خاصی کشادہ تھیں۔اِن میں چلتے ہوئے مجھے اپنا وہ شاعر یاد آیا تھا جس نے اپنے محبوب کو اپنے گھر آنے کی دعوت بڑے رکھ رکھاؤ اور وقار سے دیتے ہوئے کہا تھا۔

انہی پتھروں پر چل کر اگر ہو سکے تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

میں نے سوچا تھا کیا سنہالی یا تامل زبانوں کے کسی شاعر نے بھی اپنے محبوب کو کوئی ایسی ہی دعوت دیتے ہوئے کہا ہے کہ میرے گھر آنے کیلئے تو تمہیں کبھی تپتی،کبھی بھیگی

اور کبھی ڈوبی ریت کے میدانوں سے گزر کر ہی آنا پڑے گا۔

بہر حال اِس ریتیلے سمندر میں ڈھنتی دھنساتی چلتے چلتے ایک ایسے گھر کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس کے دروازے شاید میرے انتظار میں ہی کُھلے ہوئے تھے۔ گھر نچلے متوسط طبقے کا نمائندہ تھا۔ چھوٹے سے صحن سے آگے کشادہ سا پکا کمرہ تھا جس کے پلاسٹک کی شیٹ بچھے فرش پر ایک نوجوان نیم دراز ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔

ایک اجنبی عورت جو یقیناً کسی دوسرے دیس سے بھی تھی کو دیکھ کر پہلے قدرے حیرت زدہ اور پھر یک دم سیدھا ہو بیٹھا۔ تعارف وغیرہ کے مراحل طے ہوئے۔ یہ ایک ہندو گھرانہ تھا۔ لڑکا تجوا کمار کمپیوٹر سائنسز میں گریجوایٹ تھا۔ چنائے یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کیلئے درخواست دینے کے بعد وہاں سے بُلاوے کا منتظر تھا۔ چھوٹے موٹے کام بھی ساتھ کرتا رہتا تھا۔

دہشت گردی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے میں نے وجہ جاننا چاہی لڑکا تو جیسے غبارے کی طرح بھرا بیٹھا تھا۔ میرے سوال کی سوئی کیا چُبھی ایک دھماکے سے جیسے پھٹ پڑا۔ مہذب سی گالیاں بھی جیسے تیز بوچھاڑ کی صورت برسیں۔

جب اکثریتی لوگ اقلیتوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالیں گی اور اُنہیں اپنا غلام بنانے کی پوری پوری کوشش کریں گے تو ذرا بتایئے کہ پھر احتجاجی تحریکیں نہیں بنیں گی اور گولی کی سیاست نہیں چلے گی تو کیا امن کے پھریرے لہرائیں گے۔

میری معلومات کے مطابق اکثریتی گروپ سنہالی بدھ مت کا پیروکار، طبعاً شریف اور امن کا پرچار قبیلہ ہے۔ سوالی روشنی میں یہ جواب تھا۔

تجوا تو جیسے بھڑک اٹھا۔ ناک کو سکوڑتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

''کیا بات ہے اُن کی امن پسندی کی۔ ایک تو آپ سیاح اور صحافی لوگ اونگیاں بونگیاں بڑی مارتے ہیں۔ حقائق کا آپ کو علم نہیں ہوتا۔ ایک دو لوگوں سے بات کی اور رائے قائم کر لی۔''

''چلو تو تم کچھ بتاؤ۔''

''اِس قوم میں اب انتہاپسندی کا رجحان بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ بدھا کی تعلیمات بس اب پڑھنے پڑھانے کی خیالی باتیں ہیں۔ عملی زندگی میں ان کے رویے یکسر مختلف ہیں۔ 1954 کی پارلیمنٹ نے سنہالی کو سرکاری زبان قرار دیا۔ بھلا کیوں آخر؟''

''ارے بیبا حقائق کو کیوں مروڑ تے ہو۔ 70% آبادی بھلا اپنی زبان کی حوصلہ افزائی نہ کرے گی تو آٹھ نو فی صد بولنے والی تامل کو پرموٹ کرے گی۔''

''نہ کرے پر اُسے اُس کا جائز مقام تو دے۔ہاں یہاں میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔''

میرے لیئے یہ مقام حیرت تھا کہ جب اندر سے ایک سیدھی سادھی خاتون جس کے بالوں کا کس کر بنا ہوا جوڑا اس کے ماتھے کی کشادگی کو کچھ زیادہ ہی نمایاں کرتا تھا ہمارے پاس آ کر بیٹھی اور اُس نے یہ بات نہایت شُستہ انگریزی لہجے میں کی۔میں اندر بیٹھی آپ لوگوں کی باتیں سُن رہی تھی۔میں کولمبو یونیورسٹی میں سنہالی زبان کی اُستاد ہوں۔دراصل ساری بات رویوں کی ہے۔سنہالی اکثریتی طبقہ جس سیاسی، معاشی اور آئینی قدم کو اپنے مفادات کے ساتھ ٹکراتا ہوا دیکھتا تھا۔اس پر پرتشدد رویے کا اظہار کرتا۔سالومن بندرانائیکے جیسے متوازن سوچ رکھنے والے ایک ہر دلعزیز لیڈر کو انہی بدھ انتہا پسندوں نے قتل کیا۔

عورت بجیوا کی کی بھاوج تھی۔ساتھ والے گھر میں رہتی تھی۔جونہی وہ خاموش ہوئی۔بجیوا نے اِس بار ذرا متانت سے بات کی۔

زبان کا مسئلہ تو ایک چھوٹا ایشو ہے۔سماجی سطح پر جب برتر اور کمتر والا طرز عمل ہوگا۔سیاسی سطح پر نمائندگی سے محرومی ہوگی۔تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کے چانس نہیں ہوں گے۔یہی بندرانائیکے میتھو،سوریا مار کر جیسے خاندان غریبوں کے مونڈھوں پر سوار اور پردھان منتری بنے رہیں گے تو پھر یہی کچھ ہوگا جو ہو رہا ہے۔

مجھے لگا جیسے میرے ملک کا کوئی غریب بلوچی،سندھی یا پختون اِن چیموں،چٹھوں،ملکوں،زرداریوں کا ستایا ہوا ہاری اپنے دل کا زہر اُگل رہا ہے۔

تیسری دنیا کے خوفناک المیے۔

لڑکا پکا پکا مجھے علیحدگی کا حامی اور سنہالیوں کا بیج مار دیا جانا چاہیے جیسی آرزو کا پالنے والا جان پڑا۔تھوڑی سی ماضی کی جانکاری سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں نسلی گروہوں کا تعلق بنیادی طور پر ہندوستان سے ہے۔سنہالی شمالی ہندوستان سے کوئی چھٹی صدی میں جزیرے پر آئے جبکہ تامل جنوبی حصّوں سے تین صدی قبل مسیح کے یہاں ڈیرے ڈال بیٹھے تھے۔سنہالی عقیدے کے اعتبار سے بدھ جبکہ تامل ہندو تھے۔دونوں گروہ غلبے کیلئے ہمہ وقت جنگ و جدل میں جُتے رہتے تھے۔

پہلے پرتگالیوں نے پھر ڈچ قوم نے اوراس کے بعد انگریزوں نے جزیرے کو غلام بنالیا۔1948 میں آزادی کے بعداقتدار کی رسہ کشی پھر شروع ہوگئی۔

سری لنکا پر ہلکی پھلکی باتیں ہونے لگی تھیں۔مذہبی لحاظ سے یہ چار خانوں میں بٹا ہوا ہے۔بدھ۔ ہندو۔ عیسائی اور مسلمان۔سرکاری مذہب بدھ ہے۔تامل اور سنہالی اہم زبانیں ہیں تاہم انگریزی ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔مسلمان آبادی کا تقریباً %10 ہیں۔اور خاصے بااثر ہیں۔

مقامی لوگوں کے لباس بھی تقریباً ان کے مذہبی عقائد کے مطابق ہیں۔بدھ عورتیں عام طور پر اپنی قومی ائیر لائن کی ائیر ہوسٹس جیسا ٹخنوں کو چھوتا تنگ سا کسی قدر ساڑی نما پہناوا پہنتی ہیں۔عیسائی عورتیں بلاؤز اور سکرٹ۔ہندو عورتیں ساڑھی اور مسلمان عورتیں شلوار قمیض اور حجاب۔ہندو عورت کی ایک واضح نشانی اسکی بندیا بھی ہے۔جو بدھ عورت نہیں لگاتی۔

نگمبو میں بوڑھے لوگوں کی اکثریت پیدل چلتی دیکھنے میں آئی تھی۔اسکے بارے میں پوچھا کہ یہ کسی مذہبی عقیدے کے مطابق ہے یا اسکی وجہ غربت ہے۔

''کہہ لیجئے تھوڑی سی عادت اور کہیں تھوڑا سا عقیدہ۔''

چائے آ گئی تھی اسکی پیشکش میں گھر کی معمر عورت کی محبت شامل تھی جس نے زبردستی بسکٹ کھلائے اور میرے نہ نہ کرنے پر بھی ڈیڑھ کپ چائے پلا دی۔

مجھے خاصی دیر ہو گئی تھی۔اجازت لے کر سڑک پر آئی یہ بھی مقام شکر تھا کہ مہر النساء ڈکانوں میں ہی گھومتی پھر رہی تھی۔

لنچ کا صرفہ مارا۔بس گولڈن ناریل کے پانی اور اُبلے ہوئے سٹے پر خود کوٹرخایا۔

پھر بس میں بیٹھ کر نگمبو سٹی سے کوچیکیڈ تک گئے۔ساری شام ساحل کی نذر کی۔سورج کا الوداعی نظارہ کس قدر حیرت انگیز تھا۔سبز درختوں میں جیسے آگ سی دہک اُٹھی تھی۔کرنوں نے پانیوں پر جو زرفشاں بکھیری اس منظر نے آنکھوں کو ساکت کر دیا تھا۔

ڈنر شاندار تھا۔سی شیل ہوٹل کے ٹیرس پر سمندر کو دیکھتے ہوئے دوپہر کی بچت شام کی نذر کی۔

سری لنکن حکومت سیاحت کیلئے بڑی مستعد اور فعال نظر آتی تھی۔ہر چھوٹے بڑے ہوٹل اور ریسٹورنٹ کی میز پر ڈھیروں ڈھیر بروشرز اور معلوماتی کتابچے دھرے ہوتے

تھے۔ٹورسٹ گائیڈ پارٹیاں سیاحوں کے تعاقب میں کچھ اسی طرح اُنہیں پھانسنے کیلئے بھاگی پھرتی تھیں کہ جیسے ہمارے ہاں کے لونڈے لپاڑے خوبصورت لڑکیوں کے تعاقب میں چکریاں کاٹ رہے ہوتے ہیں۔

آج کی یہ چوتھی پارٹی تھی جو اپنی چرب زبانی سے ہمیں ہوٹل سے اٹھانے اور اپنے ہیڈ کوارٹر لے جانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔یہاں ایک کمرے میں چٹائیوں پر بیٹھے چند نوجوان بھاؤ تاؤ کرنے میں مصروف تھے۔پیکج کچھ معقول لگا تھا۔ڈرائیور،گاڑی،چار دن کینڈی،نویرا علیہ اور آدم پیک کے درمیان میں آنے والے قابل ذکر شہروں کے علاوہ کینڈی کا وہ شہرہ آفاق ڈانس بمعہ ٹکٹ اور نویرا علیہ میں چائے کے باغات کے علاوہ بوٹینکل گارڈنز سب شامل تھے۔

باب نمبر:۳ کینڈی

۱۔ لنکن مسلمان بنیاد پرستوں کے کٹڑ پن نے میری روشن خیال مسلمانی کے ہر اظہار کی ایسی تیسی پھیر دی تھی۔

۲۔ اِس خونی پربھاکرن نے تو نا ملوں کا بیڑہ غرق کر دیا۔کہیں پولیس،کہیں انٹیلی جنس،کہیں فوج سب ہمیں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔

۳۔ کینڈی کا شہرہ آفاق ڈانس جسم کی تیز ترین اشاری علامات کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں کی زوراوری کا نام ہے۔

"مسٹر جسٹنن پریرا Justinian Paryra

حد درجہ مودبانہ اور مسکین سے خدوخال والے جس شخص نے نیم ایستادہ سا ہمیں تعظیم دیتے ہوئے یہ تعارفی جملہ بولا تھا۔ سچی بات ہے اُسکا اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ میں تو پل نہیں لگا تھا ایشائے کوچک پہنچ گئی تھی جہاں وہ قسطنطنیہ کا جیالا سات فٹا نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھوں، سنہری پٹوں، جنوں جیسے ہاتھ پاؤں اور لشکارے مارتے نئے نکور تانبے جیسی رنگت والا جسٹنن ات میدان میں رتھ دوڑ کے تماشوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

ہائے یہ ہم جنوبی ایشیا کے لوگ، احساس کمتری کے پالے لوگ، نام بھی کیسے چُن چُن کر رکھتے ہیں۔ اب یہ بیچارہ ڈھائی پسلی کا جسٹنن جسے میری جیسی عورت اپنے کلاوے میں بھر کر بھینچے تو پلاسٹک کے کھلونے کی طرح پچک جائے۔ ڈھڈو رنگا اور آنکھیں بھی اسی کی طرح اوپر ہی دھری ہوئیں۔

آپکا ڈرائیور+ گائیڈ۔"

بڑی ڈرامائی سی کیفیت میں گھری کھڑی تھی۔ قامت میں مجھ ٹھگنی سے بھی پور چھوٹا ہی تھا۔ ہائے ذرا سا بھی کچھ نہیں لگا تھا اُس حسن وو جاہت اور بانکپن کا۔

اب میں تو مصیبت میں پڑ گئی تھی نا۔ نام لوں گی تو وہ جیالا خیالوں میں بھاگا دوڑا چلا آئے گا۔ یہ ہم لوگ نام رکھتے ہوئے کچھ سوچتے کیوں نہیں؟ ہم پاکستانیوں کے ساتھ بھی یہی المیہ ہے۔

ویسے میں بھی کیسی فضول اور منفی سوچ والی عورت ہوں۔ ایک شریف سے انسان کو مقابلے کی سان پر چڑھا دیا ہے۔

دراصل پچھلے ڈیڑھ گھنٹہ سے میں مہرانساء کی بکواس سُنتے ہوئے اپنا خون جلانے میں جتی ہوئی تھی۔ وہ میری جلد بازیوں پر نکتہ چیں تھی کہ رات پارٹی کے کہنے پر فوراً ڈالروں میں ادائیگی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سوچ سمجھ کر آرام سے کرتے۔ کوئی بازو بیلنے میں آیا ہوا تھا۔

میں بھی ایک نمبر کی آپ ہُدری ہوں۔ رات مہر انساء کی اس بات کو پرکاہ برابر اہمیت نہیں دی تھی۔ میرے خیال کے مطابق پردیس میں آپ کو اعتماد کرنا پڑتا

ہے۔زیادہ ہوشیاریاں، چوتیاں چالاکیاں اور اسمارٹیاں کبھی کبھی کیا اکثر نقصان دہ ہی ثابت ہوتی ہیں۔سیدھے سیدھے چلو۔اگر کوئی چکر چلائے گا تو خود ہی بھگتے گا بھی۔

اس وقت جب ہم چڑیوں کی چہچہاہٹوں میں ناشتے سے فارغ ہو کر انتظار میں بیٹھے ساعتیں گنتے تھے۔مہر انساء نے اپنا غبار نکالنا شروع کر دیا تھا۔

''ہاں تو بھئی کہاں ہے وہ تمہاری گاڑی اور ڈرائیور؟''

چلو شکر وہ تھوڑی دیر بعد ہی وارد ہو گیا تھا۔

ایک بار کی پھر گہری نظر نے مجھے اُسکے سر پر جے بے حد گھنے کھچڑی بالوں کی طرف متوجہ کیا تھا جو حد درجہ نفاست سے سجے سنورے تھے۔

گاڑی سوزو کی ڈبہ تھا۔ویسے عمدہ حالت میں نظر آتی تھی۔بیٹھنے کے ساتھ ہی اُس نے کہا تھا۔

''میری بیوی آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہے۔آدھ گھنٹہ آپ لوگوں کو نکالنا ہو گا۔

بل کھاتی سڑکوں پر اگر گرجے گھر تھے تو مسجدیں بھی تھیں۔میری گاما روڈ Mirrigama Road پر مسٹر جسٹمن کا چھوٹا سا گھر گویا جنت کا ٹکڑا تھا۔گیٹ سے ہی پھول بوٹوں کی جو لام ڈوری شروع ہوئی تو سلسلہ کہیں تھمنے میں نہ آرہا تھا۔بیڈروم چھوڑ کچن تک میں پھلواری نے بہار کا ساماں باندھ رکھا تھا۔

جوتے تو ہم نے صاحب خانہ کی تقلید میں باہر ہی اُتار دیئے تھے۔گھر والی مسز پر پراڈیلی تیلی چار شادی شدہ بچوں کی ماں ہی نہیں لگتی تھی۔بال اتنے گھنے اور لانبے تھے کہ چوٹی گھٹنوں کو چھوتی تھی۔سوال جواب تو بالوں کو سنبھالنے کے سلسلے میں ہی زیادہ ہوئے۔

''یہ انہیں بہت پسند ہیں۔''ٹھیٹ روایتی محبت کی ماری فضول قسم کی اداؤں کی نمائش کرتی عورتوں جیسا انداز ہی تھا جس سے شوہر کو دیکھا جا رہا تھا۔پیار و محبت کے ایسے چیڑ قاتے رنگوں سے مجھے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔اس لیے فی الفور موضوع بدل دیا۔

کچن جدت اور قدامت کا خوبصورت امتزاج لیے ہوئے تھا۔ہانڈیاں، چاول چھٹکنے کے سوپ دیواروں پر ٹنگے تھے۔چھوٹی چھوٹی مٹی کی کنالیاں بھی تھیں۔واہ کیا بات ہے۔ایک کونے میں لٹکتے مکرامے میں رکھے بڑے سے پیالے میں پیلی سوکھی چھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔پوچھنے پر بتایا تھا کہ اُبال کر کھاتے ہیں۔

تواضع اناس کے رسیلے میٹھے قتلوں سے ہوئی۔قتلے کیا تھے جیسے شہد اور خوشبو میں

گوندھ کر بنائے گئے ہوں۔

''واہ سبحان اللہ'' ہر قتلے کو منہ میں رکھتے ہوئے ورد ہوتا۔آخر کار مصنوعی شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بیوی اِسے ناپسند کرے یا پسند۔ہم نے بقیہ قتلے چھوڑ کر نہیں جانے۔پیک کروادیں۔''

شوہر نے ہنستے ہوئے بیوی کو ہماری بات پہنچائی۔خدا کا شکر کہ اس نے خوش دلی سے انہیں شاپر میں ڈال کر ہمارے حوالے کر دیئے۔

جب باہر نکلے موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔''ارے''خوشی سے کلکاری سی ماری۔

دائیں بائیں کہیں پستہ قامت سرسبز ڈھلانی پہاڑیاں،کہیں سبزے سے گندھے میدانوں کے عین درمیان سے گزرتی لشکارے مارتی سیاہ کولتار کی سڑک کچھ ایسے ہی دکھتی تھی کہ جیسے تیز دھار کی قینچی پکڑے ایک ماہر ہاتھ سرسراتے سبز ریشمی تھانوں کو عین بیچ سے کتر کتر کرتا دائیں بائیں دو ٹکڑوں میں گراتا اور بچھاتا چلا جائے۔آسمان نے بھی آناً فاناً ہی کچیلی بدلی تھی۔فطرت جیسے جھک جھک کر بادلوں کی صورت زمین کو خراج تحسین پیش کرتی ہو۔

کیلوں کے جھنڈ،تاڑ ناریل کے بلند و بالا درختوں کے دائروں میں گھرے گھر اور کھیتوں میں کام کرتی عورتیں پرانے بچھڑ جانے والے دیس کی کہیں میٹھی،کہیں بے حد کڑوی اور دکھی یادوں میں لے گئی تھیں۔مجھے یاد آیا تھا۔پوربو پاکستان میرا پُوربو پاکستان ایسے ہی دلآویز منظروں کا حامل اور ایسی ہی خوبصورتیوں کا عکاس تھا۔

بڑے بڑے قطعات کی صورت لیے آڑھے ترچھے کھیتوں میں دھان کی فصل کٹنے کیلئے تیار کھڑی تھی۔سونے رنگ کا ایک بہتا ہوا سیلاب کتنا خوبصورت لگتا تھا۔ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ جیسے پاسبانوں کی طرح میلوں تک پھیلتے چلے جاتے تھے۔

پھر ایک مختصر سا پڑاؤ ہوا۔ایک چھوٹا سا ہوٹل،ایک چھوٹا سا گھر روٹی شیپالا دا کا جس کے آنگن میں گھر کی بوڑھی عورت دات پر ساگ کاٹتی تھی۔بہو لکمیٹی آنگن میں کھدے کنوئیں سے پانی نکالتی تھی۔بہو کا چہرہ اس کی نمی میں بھیگی آنکھیں کچھ افسانہ سُنا رہی تھیں۔کچھ جاننے کی کھُد بد پاس لے گئی۔اشاروں کی زبان نے ظالم سماج کو پل جھپکتے میں عیاں کر دیا تھا۔وہی ساس کا رونا اور شوہر کی مار کٹائی۔ساری کہانی سمجھ آ گئی تھی۔بچہ نہیں تھا۔چار سال شادی کو ہو گئے تھے۔شوہر بھی لائی لگ سا تھا۔شاید ابھی کچھ اور اس تمثیلی کہانی

سے جانتی کہ ساس ساگ دھونے یا ٹوہ لینے چلی آئی تھی۔

چائے مزے کی تھی۔ گھرانہ بدھ تھا۔ ہمارا گائیڈ بھی پیدائشی اعتبار سے اگر بدھ تھا تو سیاسی طور پر بھی اسی دین کی عظمت اور غلبے کا حامی تھا۔ یوں خاصا انسان دوست دکھتا تھا۔

پھر ایک بڑی دلچسپ سی بات ہوئی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے ساتھ ہی مسٹر جسٹمن نے ریکارڈ پلئیر پر ہمیں سنہالی گیت سنانے کی پیشکش کی۔ ہنستے ہوئے میں نے کہا۔

''اس کا فائدہ؟ یہ تو بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہوگی۔ ہم نے یہ زبان کبھی سُنی ہی نہیں۔''

''مطلب میں آپ کو سمجھاؤں گا۔ میری خواہش ہے کہ آپ کم از کم ہمارے شاعروں کے بارے تو جانیں کہ وہ کیا کچھ لکھ رہے ہیں اور کیسا لکھ رہے ہیں؟ آواز اور موسیقی بھی بہت کچھ بتائے گی۔''

بات تو سولہ آنے درست تھی۔ یہ خواہش تو ہماری جانب سے ہونی چاہیے تھی۔ چلیے مسٹر جسٹمن کو ہی خیال آ گیا۔ اب بٹن دبے تو ایک مردانہ آواز گونجی۔ نامانوس سے بول۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ آواز خوبصورت تھی۔ جب پورا گانا سُن بیٹھے تو اب مطلب جاننے کی باری آئی۔ اور جب مطلب سمجھا تو بے اختیار داد دی اور پورے گیت کو دوبارہ سُنا۔ واقعی موسیقی بھی اثر انگیز تھی۔ اب ذرا شاعری کی خیال آفرینی بھی دیکھیے۔

کیونکہ کل کبھی میری نہیں ہوگی

اور کل ایک خواب کی طرح گزر گیا

لیکن آج میرے پاس ہے
اور تو مجھے اپنی رحمتوں سے نواز دے
کل تو کبھی کسی سے وعدہ نہیں کرتا
اور کل کے وعدے ایمان کے ساتھ رخصت ہوئے
آج میں ہوں
اور مجھ پر تمہاری خدائی روشنی چمکے
میرے خدا میں جانتا ہوں
آنے والا کل ایسا نہیں ہوگا

جیسا کہ میں سوچتا ہوں
اور کل گزر گیا ہے
لیکن آج کے لئے میں تیری پناہ چاہتا ہوں

بہت خوبصورت کلام بہت خوبصورت آواز اور شاعر کا نام روی ساتسوم Ravi Sathasivam۔

Kegaua قصبے کی خوبصورتی اور اسکی پور پور میں رچی بسی خوشحالی نے بڑا متاثر کیا۔یہیں ہم نے ربڑ کے جنگلات سے ربڑ بننے کے مراحل سُنے اور تھوڑے بہت دیکھے بھی۔

Pinnawala پیناوالا میں ایک تو موٹی موٹی جرمن عورتوں سے تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔کمبختیں باتھ روموں کے سامنے یوں قطار در قطار کھڑی تھیں کہ جیسے یہ ملک اور اس کے ٹوائلٹ انکی جاگیریں ہوں۔کوئی پرتگالی، کوئی ڈچ، کوئی انگریز ہوتیں تو چلو ہم بھی کوئی خیال کرتے کہ بھئی ہٹو، بچو ان سے، انہیں راستہ دو۔پرانے آقاؤں کے بال بچے اپنے پرانے خادموں کی زمین پر انکے رنگ ڈھنگ اور خیر خبر کیلئے آئے ہیں۔مگر یہ موٹی ہٹلر کی پُروردہ ہتھنیاں۔ایک ڈھٹائی اوپر سے بے نیازی اور لاپروائی جیسے تاثر کو نمایاں کرتی مونڈھے مارنے کی گندی عادت۔ببر شیرنیاں کسی کو اندر جانے ہی نہیں دے رہی تھیں۔ایک باہر اُس وقت نکلتی جب دوسری اندر قدم دھر لیتی۔

میں نے بھی جی داری سے کام لیا۔چلو صورت تو پنجاب کی نمائندہ نہ تھی ویسے آپس کی بات ہے۔میں تو لنکن والوں کی چچیری خلیری لگتی تھی۔تاہم پنجاب کی جٹی ٹیار کی دلیری کو بٹہ نہ لگنے دیا۔ایک کا پاؤں اندر اور دوسری کا باہر دونوں کے سینے چھیاں ڈالنے میں ابھی مصروف ہی ہوئے تھے۔جب تیسری "باگڑ بلیوں تمہاری ایسی کی تیسی" کا نعرہ بلند کرتی شلوار کا الاسٹک نیچے کرتے کموڈ پر بیٹھ چکی تھی۔

پیناوالا Pinnawala ہاتھوں کے حوالے سے خصوصی شہرت کا حامل ہے۔کہہ لیجیے یہ ہاتھیوں کا گھر ہے۔ریاست کے دیئے ہوئے لفظوں کے مطابق بے چاروں کا یتیم خانہ ہے۔ہاتھیوں کا شو بھی یہیں دیکھا۔پانچ سو کا ٹکٹ لیا۔پیناوالا Pinnawala
یہاں تو ان کی ایک دُنیا آباد تھی۔اگر ماہا اویا Mahaoya دریا کے پانیوں میں انکی

خرمستیوں کے سلسلے تھے کہ نصف دن کے بعد اُنکا دریا کے پانیوں میں آرام شروع ہوتا ہےتو وہیں کناروں پر لگی ریلنگ کے ساتھ ساتھ کھڑے ہزاروں شائقین کا مجمع لُطف اٹھانے اور تصویر کشی میں محو تھا۔

بڑے مزے کے نظارے تھے۔ماؤں ہتھنیوں کے ساتھ ان کے بالکوں کے چونچلےاورنخرے۔فطرت نے ممتا کے کیسے کیسے رُوپ دنیا میں اُتار دیئے ہیں۔اِن معصوموں کے باپ چچا بھی بڑے ترنگ میں تھے۔سونڈوں سے ایک دوسرے پر آب پاشی کر رہے تھے۔کہیں محبت و پیار کے کھیل ،سونڈیں لہراتے ہوئے ایک دوسرے پر چڑھنے اور پیار کرنے کے انداز۔واہ مولا کیسی رنگ رنگیلی دُنیا پیدا کر رکھی ہےتو نے۔کٹاؤ وار جھیل میں بھی ایسے ہی منظر تھے۔

ہمارے گائیڈ کی دلچسپ باتوں نے اور مزہ دیا کہ ان کے نام بھی ہیں ۔لُطف کی بات جوڑوں کے نام جیسے وجایا vijaya اور نیلا کماری،انوشا اور شیرانی ۔ایک جگہ اور بڑا دلچسپ منظر تھا۔بچوں کو دودھ بوتلوں سے پلایا جا رہا تھا۔ان کی مائیں بھی دراصل ورکنگ عورتیں ہیں۔سیاحوں کو لُبھانے رجھانے کی ڈیوٹی بھی نوکری ہی ہے نا۔اب بچوں کو بھوک تو لگتی ہے۔

ہاتھیوں پر سواری کا شغل بھی ہو رہا تھا۔گوری عورتوں اور بچوں کو تو آخر آئی ہوئی تھی۔ان کے قہقہے اور کیمروں سے ڈھیروں ڈھیر تصویریں اِس کا اظہار تھیں۔

آخر میں ایک منظر نے دل موہ لیا۔لُطف دوبالا چھوڑ سہ بالا ہو گیا۔یہ مہاوٹ کا گیت تھا کو ہمیں مطلق سمجھ نہ آئی۔مسٹر جسٹن نے تھوڑا سا ترجمہ کیا مگر اس کی پاٹ دار آواز نے سماں باندھ دیا تھا۔

مسٹر جسٹن نے ایک اور دلچسپ بات بتائی کہ شام میں ناریل کے چھلکے سے اِن کے جسموں کا مساج اور ان کی لُطف اندوزی کا بھی دیکھنے سے تعلق ہے۔یوں گھوڑوں ،بیلوں والے کام اِس پانیوں کے دیس میں اِن بیچاروں کو ہی کرنے پڑتے ہیں کہ کھیتی باڑی اور ہل جوتنے کی مشقت انہی کے مقدروں میں لکھی ہوئی ہے۔

ہوٹل بہت شاندار تھا۔آرٹ کا جیسے شاہکار ہو ۔یہاں دوکانداری بھی بڑے عُروج پر تھی۔مقامی مصنوعات اور انہیں بیچتی عورتیں جو کمال کی فنکار تھیں۔چمڑے کے کُشن، جوتے ،پرس سبھی چیزیں خوبصورت تھیں پر سستی ہر گز نہ تھیں۔جب ڈالر یورو سامنے

ہوں تو بیچارے ٹکوں میں بھاؤ تاؤ کرنے والے کس گنتی شمار میں؟

کیگالا میں گم ہوگئی۔ اجنبی جگہ پر سجدے دینے کی خواہش کا بھلا ہو۔ پہلی پھٹکار مسجد کے حالیوں موالیوں کی جانب سے ہوئی کہ دن جمعے کا تھا اور خطبہ زور و شور سے جاری تھا۔ صحن میں ٹائلوں والے خوبصورت سے حوض سے وضو کرتے ہوئے آس پاس پھرتے لوگوں کی آنکھوں سے غیر دوستانہ سے جذبات کا چھلکاؤ کچھ کچھ ماحول کے سرد رویے کی نشان دہی کرتا تھا مگر اللہ کی محبت میں سرشاری سے زیادہ ایک اچھی پاکستانی مسلمان خاتون کا تاثر نمایاں کرنے کی لگن میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی

اف خشمگین نگاہوں نے جیسے قہر برسایا۔ چہرے پر بکھرے رعونت کے رنگوں نے دُور دفع ہو جاؤ۔ ہماری نماز خراب کرنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ جیسے بھرپور تاثرات کا واضح سگنل دیا۔ دو چار ہاتھ دھکیلتے ملحقہ کمرے میں لے گئے۔ بڑی سُبکی محسوس ہوئی۔ بنیاد پرستوں کے کٹڑ پن نے روشن خیال مسلمانی کی خودنمائی کی کوشش کی ایسی تیسی پھیر دی تھی۔

سجدے تو دیئے مگر مزے کے منہ میں روڑ آ گئے تھے۔

باہر نکلی۔ نہ گاڑی، نہ جسٹن پرپیا، نہ مہرانساء۔ بازار خوبصورت ضرور تھا۔ پھل سبزیوں کی صاف ستھری دکانیں۔ خریداری کرتے لوگ۔ ساڑھیوں میں لپٹی چھاتے کھولے عورتیں۔ میری بھاگ دوڑ تو ہوئی۔ پر اندر کہیں بے چینی یا گھبراہٹ کا ہلکا سا شائبہ بھی نہ تھا۔ شکر ہے موبائل ابھی آج کی طرح زندگی کا جزو نہیں بنے تھے کہ مس کالیں بندے کا جھوٹ اور اس کے بہانے بازیوں کے پول کھول دیں۔

اگر خدا لگتی کہوں تو حقیقت یہی ہے جیسے اکیلے گھومنے پھرنے، لوگوں سے باتیں کرنے اور کچھ حالات کے اندر اُترنے کے موقع کا ملنا غنیمت لگا تھا۔

میڈیکل سٹور کی ایک دُکان میں جا گھسی۔ ایک اُدھیڑ عمر کا مرد کاؤنٹر پر اور چار نوجوان لڑکے جن میں دو گاہک کو نپٹانے اور دو الماری کی صفائی ستھرائی میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے یکدم بات چیت کا پٹارہ کھولنے کی بجائے ڈسپرین مانگی۔ اب اللہ جانے اس کا جزک نام انکی میڈیسن لغت میں کیا تھا؟ کاؤنٹر پر بیٹھے مرد نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے انگریزی میں سر درد کا بتایا۔ اُس نے اپنی زبان میں لڑکے سے کچھ کہا۔ دوائی لینے اور پیسے دینے کے بعد تعارف کروایا۔

میں نے تو ابھی کچھ تذبذب کی سی حالت میں باالفاظ دیگر کہہ لیجئیے کچھ کومگو میں ہی سوال ان کی جانب لڑھکایا تھا۔وہاں تو جیسے بندہ بارود کے دہانے پر بیٹھا ہو والی کیفیت تھی۔پل جھپکتے میں ہی بڑے خاندانوں، بڑے لیڈروں کا پٹنا (پھٹکارنا) شروع ہو گیا تھا۔

عام سے غریب آدمی کی اقتدار میں شرکت ناممکن جب تک یہ مگرمچھ بیٹھے ہیں ہماری ملک میں سچے اور سچے سوشلسٹ نظام کی خواہش کی اوقات کیا؟ اگر اِس نظام کے نافذ کرنے والے مخلص نہیں۔ڈھکے چھپے لفظوں میں نہیں بلکہ کھل کھلا کر پربھاکرن جیسے لیڈر کو جسے اس نے اور اس جیسے بہتوں نے اپنا آئیڈیل مانا تھا۔جو غریبوں کی بات کرتا تھا۔ان کے حقوق کیلئے لڑتا تھا۔

پھر جیسے فضا میں گالیاں اُچھلیں۔

''سالا خونی بن گیا ہے۔ہمیں حقوق تو کیا ملنے تھے۔تاملوں کا بیڑہ غرق کر دیا۔مشتبہ بنا دیا ہمیں۔کہیں پولیس ہم پر کڑی نظر رکھتی ہے، کہیں انٹیلی جنس والے گھسیٹتے پھرتے ہیں، کہیں وہ حرامزادی بیورو کریسی ہمارے لتے لیتی ہے۔کاروبار کا الگ بیڑہ غرق ہو رہا ہے۔اب دیکھو اس کا وہ چہیتا یار، اس کا دست راست دیا نا گا مورتھی مرلی دھرن اُسے چھوڑ کر حکومت میں شامل ہو گیا ہے۔ایک دن یہ بھی سالا مارا جائے گا یا پکڑا جائے گا۔''

وہ تامل ہندو تھا۔اس کا دکھ مجھے سمجھ آتا تھا۔مجھے تو اپنے ہی عکس جیسے آئینے میں نظر آئے تھے۔جی چاہا تھا کہوں کہ گھبرائیں نہیں۔نظام بدلنے میں وقت لگتا ہے۔دنیائے اول کی تاریخ پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہیں یہاں تک آنے میں صدیاں لگی ہیں۔

مگر اندر نے کہا۔چپ کرو ڈی انٹیلکچوئل۔

اجازت لی۔باہر نکلی۔چاروں اور نظریں دوڑائیں۔کہیں کچھ نہ تھا۔اب میں نے امکانی پہلوؤں پر غور کرنا شروع کر دیا کہ مجھے اب اِس شہر کے تھانے میں حاضری دینی ہے۔تبھی میں نے مسٹر جسٹمن کو دور سے پیدل آتے دیکھا۔میری طرح اس کی آنکھیں بھی چاروں کھونٹ گھوم رہی تھیں۔

میں نے کچھ نرم نرم تھوڑے سے گرم گرم لفظوں میں اُسے کوسا۔ایسی ہی بوچھاڑ اُس کی جانب سے بھی ہوئی۔چلو شکر مزید خجل خواری سے بچت ہو گئی۔مہرانساء سے البتہ زوردار قسم کی جنگ ہوئی۔

''آخر تم کہاں دفع ہو گئی تھیں؟ بیچارے مسٹر جسٹمن ہپو ہان (ہلکان)

ہو گئے ۔عجیب ہو تم بھی گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتی ہو ۔''

''میں نے کیا کہا ۔یہی نا ۔میرا تو پاؤ بھر خون سڑ گیا ۔بلڈ پریشر نے بھی شوٹ کرنا شروع کر دیا ۔بھلا میں نے کہاں جانا تھا؟ یہیں تھی ۔اب اگر تمہاری آنکھوں میں بٹن فٹ ہیں تو میں کیا کروں؟''

سڑک کے کنارے بڑے بڑے سلور کے دیگچوں میں اُبلے سٹے بیچتی عورتوں کی محنت کشی کی عادت اچھی لگی ۔اپنے ملک کی ہٹی کٹیوں پر لعنت بھیجی جو اپنی جوانی کے چسکوں کے نمونے ڈھاکوں پر اٹھائے جگہ جگہ ہاتھ پھیلائے نظر آتی ہیں ۔

چونکہ دوپہر اور رات کا کھانا پیکج میں شامل نہیں تھا ۔اس لیے Kadugannoua میں نمک مرچ اور لیموں کے ساتھ یہ بھٹے اور ہتھ چُھٹ قسم کے دو کیلے فی کس کا لنچ ہمارے نزدیک کافی تھا ۔اناس کے قتلوں نے سویٹ ڈش کا کام دیا ۔

کیگالا کی جامع مسجد میں ملنے والا سبق کافی تھا ۔میرے شوقِ سجدہ میں خاصی سرد مہری آگئی تھی کہ راہ میں نظر آنے والی مسجدوں کو دیکھا ضرور مگر اُتری نہیں ۔یوں بھی مسٹر جسٹمن نے جلدی جلدی کا شور مچا رکھا تھا ۔کینڈی کے مشہور زمانہ ڈانس کا مخصوص وقت تھا ۔ہاں البتہ کینڈی سے پہلے پیراڈینا Peradeniya کا خوبصورت شہر ہے ۔یہ ایسے ہی ہے جیسے پنڈی اسلام آباد ہو ۔

اس کی دو چیزیں بڑی نمایاں تھیں ۔ایک اس کا شہرہ آفاق باٹینکل گارڈن ۔خدا گواہ ہے کیا لاجواب چیز تھی ۔پتوں میں کتنے رنگ جھلکیاں مارتے تھے ۔ہزاروں اقسام کے پودے، درختوں کے پتوں میں رنگوں کی بہار، جھاڑیوں پر کھلے پھول اور شگوفے ۔جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں ۔مصالحے کے باغات ۔ہربل دوائیاں کیسے بنائی جاتی ہیں؟ طریقہ کار جانا ۔صندل سے کیا کیا بن سکتا ہے؟ زعفران کے پودے ۔

خیر زعفران کے پودے میں نے شندھور میں بتیرے دیکھے تھے ۔ لیکچر دینے والے بڑے ٹرینڈ لڑکے تھے ۔باغات اور کاروبار سب حکومت سے منظور شدہ تھے ۔سو روپے میں پاؤں کے مساج جیسے نعرے نے بڑا متاثر کیا ۔گو آج کے کھاتے میں ابھی تک کوئی خاص مشقت تو بیچاروں نے نہیں جھیلی تھی پر سوچا چلو گذشتہ دنوں کا ہی کفارہ ادا کر دیں ۔اتنے تو بدبدیسے سے ہیں ۔کلمبو کی سڑکوں کو انہوں نے جیسے کوٹا وہ کچھ بیچارے یہی جانتے ہیں ۔

ہم نے مساج کیا خاک کروانا تھا۔ ہمارے تلووں کی گدگدیاں ہی ہمیں بے حال کرنے کیلئے کافی تھیں۔

دوسرا اہم واقعہ سڑک کے کنارے سفید براق ساڑھیوں اور پینٹ قمیضوں میں عورتوں مردوں کو دیئے جلاتے دیکھ کر رُک گئے۔ دیوں کا یہ میلہ ایک ایسے شخص کی یاد میں تھا جو سری لنکا کا بہت بڑا بزنس مین ہی نہیں تھا ایک بہت بڑا انسان بھی تھا۔ جسکے کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے لوگوں کو اس کی وفات کے بیس سال بعد بھی وہ تمام سہولتیں حاصل تھیں جو ملٹی نیشنل اداروں کے ملازموں کو بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ وہ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھا تھا۔ تامل ٹائیگر زلبریشن اِس قتل کی ذمہ دار ہے۔ مسٹر جسٹن تو اِس معاملے میں بڑے واضح تھے۔ بھتہ بہت مانگنے لگے تھے۔

وہ دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک تھا۔ مخیّر بھی بہت تھا۔ ہاں غلط باتوں اور غلط کاموں کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ تنقید تو ان پر کھلے عام کرتا تھا۔

اچھے کام خوشبو کی طرح ہوتے ہیں۔ سدا مہکتے رہتے ہیں۔

گاڑی سے اُتر کر تصاویر بنائیں۔ دعائے خیر کی۔ اِس دہشت گردی نے دُنیا میں کیسے کیسے ظلم کے باب رقم کیے ہیں؟

تھوڑی دیر کیلئے اُس گروپ میں بیٹھے جو دائرے میں ہارمونیم پر گیت گا رہا تھا۔ خراج عقیدت کے جذبات میں گندھا گیت۔ شام ہوگئی تھی۔ جب کینڈی میں داخل ہوئے۔ ہمارے لیے کینڈی کرکٹ کے حوالے سے آئے دن کانوں میں پڑنے والا اور ٹی وی کے ذریعے آنکھوں کے سامنے سے گزرنے والا نام ہے۔ بچوں کی گولیوں کے حوالے سے بھی بڑا مانوس سا ہے۔

سچ تو یہ تھا کہ شام کے جھٹپٹے میں شہر میں داخلہ اور اس کا طائرانہ سا نظارہ کسی طلسم کی طرح نظر آ رہا تھا۔ سرمئی سے آسمان کی چھت تلے، ہریالیوں گھری، موتیا اور بھینی بھینی خوشبو سے لدی پھندی کینڈی کسی ماورائی سی دنیا کا پتہ دیتی تھی۔

شہر کا لینڈ مارک جھیل اور اسمیں جھانکتی عمارتوں کے عکس۔ پل بھر کیلئے رُک کر اِس منظر کو آنکھوں میں بسایا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹوں اور فضا پر تیرے نیلگوں دھویں کے غبار سے منظروں کی دلربائی آشکارہ ہوتی تھی۔

ابھی راستے میں سری لنکا کے مایہ ناز شاعر روی سائتسوم Ravi

Sathasivam کا سنہالی گیت جس کا ترجمہ ہمارے گائیڈ نے کیا تھا ہمیں دوبارہ یاد آنے لگا تھا۔اپنے وطن کی کیسی خوبصورت عکاسی کی تھی اُسنے ۔

مجھے اپنے ملک سے بہت پیار ہے
پہاڑوں کی چوٹی پر خدا آدم پیک پر بیٹھا ہوا ہے
وہ ہماری قوم پر رحمت کی دعائیں بھیج رہا ہے
نوازا ہوا ہمارا یہ ملک

دنیا کا باغ عدن ہے یہ
فطرت جب ہماری قوم کو گلے لگاتی ہے
تب زمین دنیا پر جنت بن جاتی ہے
واقعی جنت اور کیا ہوگی

ہم اب اپنے گائیڈ کو سُنتے تھے اور گاڑی سبک خرامی سے اوپر چڑھتی چلی جاتی تھی ۔یہ حیرت انگیز جائے وقوع کا کلچرل شہر جسے دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔سورج کی چمکتی کرنوں میں پل پل بدلتے رنگوں والا یہ جو مہاولی Mahaveli دریا کے پیچ وخم میں لہروں کے ہلکوروں میں کسی خواب کا سا گمان دیتا نظر آتا ہے۔

شہر اپنے حال کی طرح اپنے ماضی میں بھی اتنا ہی باوقار تھا۔Vimaladharmasurya نے 1592 میں اسے بنایا۔ہاں ڈچ، پُرتگیزوں اور بعد میں انگریزوں کے قبضے نے بھی اسکی خوبصورتیوں اور اس کے حسن میں اضافے کیے ۔

دی ڈراپ ان ہوٹل The Drop Inn خاصی چڑھائی پر تھا۔موڑ کٹتے تو چوٹی پر سجے بدھا کے سفید مجسمے نے لشکارے مارے۔ہوٹل کے ٹیرس پر رُک کر گردوپیش کو بہت لمحوں تک ساکت ہو کر دیکھا تھا۔ہماری طرح بہت سے لوگ بت بنے کھڑے اس وادی کینڈی کو سرسبز پہاڑوں سے گھری دیکھتے تھے۔

ہوٹل خوبصورت تھا۔دائیں بائیں راہداریاں ایک دوسرے کو کاٹتی پھرتی تھیں۔کمرے بھی اچھے تھے۔مگر کھانا کیسا بے سودا سا تھا۔دال سبزی کا ہی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کونسی ہے؟

اب زہر مارنے والی بات ہی تھی ۔

پر اُس روسی لڑکی آکسانا (Oksana) سے ملنا بھی اس دن کے بہت سے اچھے اوریادگار تجربات میں ایک دلچسپ اضافہ تھا۔ وہ ہر سال ایک ہفتے کیلئے سری لنکا آتی تھی۔ اپنی جلد کو براؤن کرنے، بیچ پر نہانے اور مزے لوٹنے۔

''ارے بھئی اس ملک کی بڑی موج ہے۔ نہ کوئی ویزا، نہ کوئی اور جھنجٹ اور یہاں مہنگائی بھی نہیں۔ بس ٹکٹ کٹاؤ اور فطرت کے مزے لوٹو۔

واقعی ایسا ہی تھا۔ اس کی بات سے میں نے اتفاق کیا۔

آکسانہ روسی مزاج کے قطعی برعکس تھی۔ نرم گرم اور گھلنے ملنے والی۔ میں نے پُوچھا کہ ساتھ کوئی بوائے فرینڈ ٹائپ چیز نہیں ہے۔ اُسنے ہنستے ہوئے مونڈھے مارے اور بولی۔

کبھی کبھی اکیلے گھومنے پھرنے کا اپنا مزہ ہے۔ دُم چھلّے کبھی کبھی زہر لگتے ہیں۔

میں نے دل میں کہا تھا۔

''ہائے کمبخت میرے جیسی۔''

کینڈی کا کلچرل شو دیکھنے کیلئے نکلے۔ آسمان پر چاند نہیں تھا۔ ہاں تارے ضرور چمکتے تھے۔ پر رات اندھیری تھی اور شاہراؤں پر گو لائٹس روشن تھیں مگر ماحول بقعہ نور نہیں تھا۔ تاریکی سر سبز درختوں کو کیسی ڈراؤنی اور خوف زدہ صورتوں میں ایک کے بعد ایک پیش کرتی جارہی تھی۔ مینڈک اور شب کے چرند پرند اِس پہلے پہر میں ہی راگ الاپنے شروع ہوگئے تھے۔ اِن کی یہ آوازیں میرے گاؤں کی بچپن کی آوازوں سے کتنی مختلف تھیں۔ میں نے بے اختیار ہی خود سے کہا تھا۔

چھپڑوں کے کناروں پر بیٹھے ٹرٹراتے وہ پاکستانی ڈھڈو اور اِس رنگینی بھرے ماحول میں یہ لنکن، انکے یہ الاپ جیسے کہیں ڈرم بجتے ہوں یا کسی مندر میں فلیوٹ بجایا جارہا ہو۔ کہیں اونچے درختوں کی شاخوں میں جلتے بجھتے جگنوؤں کی دوڑیں جیسے شمعیں سی جلتی ہوں۔ انوکھے سے طلسم سے بھری فضا جہاں سانس رکتی ہے اور جہاں خدا بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔

Queen's Hotel کوئینز ہوٹل کی عمارت بُدھا کے مندر ٹوتھ ریلک Tooth Relic کے پچھواڑے کی طرف تھی۔ اسی لئیے محلوں والے بہت سے نظارے اُسکے چہرے مہرے اور وجود سے جھلکتے تھے۔

عمارت کا شاہانہ پن کم اور باوقارانہ کرو فر فی الفور آپ کو کہیں ماضی میں لے جاتا ہے۔سفیدیوں میں نہاتی اُلٹے ایل کی صورت اپنی بالکونیوں اور ماتھے پر سجی اپنی پُر وقار سادگی کی عظمت کا پرتو لیے آپ کو ماضی کی کہانیاں سنانے کیلئے اپنے ساتھ چلنے کا کہتی ہے۔

ٹکٹ ایک ہزار سری لنکن روپے کا تھا اور ہمیں اپنی جیب سے لینا تھا۔اسی لیے مسٹر جسٹن کو تو ہم نے کھیل تماشے سے ہی باہر کر دیا کہ بھلا اپنی چیزوں کو دیکھنے کا کیا لُطف؟

اُسنے فوراً دبے دبے سے لہجے میں کہا بھی۔آپ کے لیے ساتھ ساتھ پس منظر سے آگاہی ضروری ہے۔ہم نے سُنی ان سُنی کر دی تھی اور دل میں کہا تھا۔

''ہٹاؤیار یہاں زندگی کی سمجھ نہیں آئی۔اس پل بھر کے کھیل تماشے کو نہ بھی سمجھا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔''

اندر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی والا محاورہ بولا جا سکتا تھا۔چیختے چنگھاڑتے شور مچاتے رنگ انوکھی اور نرالی وضع کے کاسٹیوم جو ہیرے جواہرات کی اپنے اوپر کثرت استعمال سے بتاتے تھے کہ سری لنکا ان کا گھر ہے۔فنکاروں کے چہرے اور بدن میک اپ اور نقش و نگاریوں کے کارن کیا کیا روپ دھارے ہوئے تھے۔کوئی آٹھ دس تو ڈانس ہی ہونگے۔ان میں جسم کی تیز ترین اشاری علامات کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں کی زوراوری، مار دھاڑ، جوڈو کراٹے ٹائپ اور بازیگری کے نسخے شامل تھے۔شاید اسی لیے پرفارم کرنے والے سب کے سب مرد تھے کہ وہی ایسے مار دھاڑ والے کرتبوں سے ایک سنسنی خیز کہانی دکھا سکتے ہیں۔

افسوس یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اب یہ سب چھوٹی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کو بھی سکھایا جاتا ہے۔گوروں کیلئے خصوصی طور پر لڑکیوں کے ڈانس والے ہال بک ہوتے ہیں۔ٹکٹ بھی خاصے مہنگے ہیں۔

سازوں میں بھی زیادہ زور ڈرمنگ پر ہی تھا۔سری لنکا میں کوئی چھبیس اقسام کی تو ڈرم سازی ہوتی ہے۔اِن میں کہیں فلیوٹ، کہیں oboeاور کہیں دوسرے سازوں کی آمیزش سے بہت سے نئی اختراعات ہوئی ہیں۔

بعض پروگراموں سے پہلے کاغذ ہاتھوں میں تھمائے گئے۔چلیں یہ اچھا تھا کہ تھوڑی سی جانکاری ہوگئی۔بعض مذہبی رسومات جنکی ادائیگی جادوگر چڑیل ڈاکٹروں نے کی۔

سچی بات ہے دم سادھ کر یہ سب دیکھا تھا۔سمجھ نہ آنے کے باوجود اور لُطف بھی اٹھایا۔جھیل کے گرداگرد ایک چکر لگایا۔اندر سے نظاروں کی متمنی خواہشوں نے حسرت

بھرے لہجے میں کہا تھا۔
''کاش کہیں چاندنی رات ہوتی ۔تب یہ سماں کیسا ہوتا ۔''

باب نمبر:۴ مقدس دانت گھر اور میوزیم

۱۔ جافنا کے مسلمانوں کا تامل ٹائیگرز لبریشن کے ہاتھوں سنگینوں کی نوک پر گھر بدری بیسویں صدی کی آخری دہائی کا ایک بڑا اور المناک واقعہ ہے۔
۲۔ بدھ دنیا کا مقدس ترین دانت طلسم بھری کہانیوں سے مالا مال ہے۔
۳۔ کینڈی جزیرے کا حسین ترین شہر اور لنکا a land like no other کی بہترین عکاسی ہے۔
۴۔ دنیا کا ہر انسان اپنا برش اپنی رُوح میں ڈبوتا ہے اور اپنی ہی فطرت اپنی ہی تصویروں کی شکل میں پینٹ کرتا ہے۔

صبح سویرے آنکھ کھل گئی۔ باہر آئی۔ کیسی صبح تھی نشے سے بھری ہوئی، ہلکے سے نیلگوں غبار میں لپٹی سی۔ نیچے سڑک پر سرخ رنگ کی پھٹیچر سی بس چلی جارہی تھی۔ جی چاہا تھا دوڑتی ہوئی اتروں اور جا کر بس میں بیٹھ جاؤں اور شہر کی صبح کو دیکھوں کہ انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہورہی ہے یا ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ پر اس خواہش کو عملی جامہ پہنانا کتنا مشکل تھا کہ لعن طعن سے دل گھبرانے لگا تھا۔ ظاہر ہے نئے منظروں نے کہیں ٹھٹھی ڈال لینی تھی۔ کہیں انوکھا سا منظر راستہ روک سکتا تھا۔ بھولنے کا بھی چانس تھا تو پھر فضیحتا تو لازمی تھا۔ اب دل مسوسنے والی بات ہی تھی نا۔

''ناشتہ کیسا تھا؟ بس گزارہ۔ چلو سو چا دفع کرو اب اس پر کیا تبصرہ کرنا؟''

گاڑی جب سڑکوں پر دوڑنے لگی تو دیکھا کہ یہاں وہاں فطرت کے منظروں میں انسانوں کے انواع و اقسام کے رنگ گھل گھل کر ماحول کی رنگینی بڑھا رہے ہیں۔ بدھ بھکشو اور ان کے چیلے چانٹوں کے زعفرانی چوغے، سبز رنگوں میں نگینوں کی طرح لشکارے مارتے تھے۔ معلوم ہوا تھا کہ پھرنے پھرانے کا یہ سلسلہ صبح کے کھانے کی تلاش ہے۔ بھکشوؤں کے کچھ ٹولے جھیل کنارے درختوں کی چھاؤں اور کہیں بڑی بڑی چھتریوں کی چھتر چھاؤں میں بیٹھے اپنی اپنی عبادت و ریاضت میں مگن تھے۔

ہمارے گائیڈ جسٹن نے ہمیں اس چمکتی صُبح کو سب سے پہلے کینڈی کی اہم جگہ ڈالڈا ملیگاوا The Dalada Maligawa یعنی مقدس دانت گھر ہی لے کر جانا تھا۔ سو اب اس کی طرف جاتے تھے تو تھوڑا سا کینڈی کے ماضی کا حال احوال بھی سُنتے تھے۔

ستہالیوں کا گڑھ، ان کی راج دھانی، انکی تہذیب وتمدن کا نمائندہ جس کا آخری مہاراجہ سری وکرم ماراجا سنگھی Sri Wickrama Rajasighe برطانوی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ گرفتاری سنہالی امراء اور معززین کے تعاون سے ہوئی جو شاید اُس کے بہت سے اقدامات سے ناخوش تھے۔

سچی بات ہے اب اِن راجے مہاراجوں کے ظالمانہ رویوں کی بھی تو انتہا ہی تھی نا کہ کہیں بپھرے ہوئے ہاتھیوں کے آگے لٹا کر انکو کچلوا دیا جانا۔ راجہ سری وکرم نے سو سے زیادہ اپنے بہترین مشیروں کے جسموں میں کیلیں ٹھکوا کر انہیں مروا دیا تھا کہ انہوں نے پیڈی فیلڈ کے ایک ریزو بند کے بارے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ پیڈی فیلڈ کو جھیل میں تبدیل کرنا مناسب نہ ہوگا۔ مگر بادشاہ زمینی خوبصورتی کا بہت دلدادہ تھا اُس نے پیڈی فیلڈ

کوموجودہ جھیل میں تبدیل کر کے چھوڑا۔

''ہائے شہر کو تو حسین بنا دیا نا۔پر ساتھیوں کو ایسی اذیت ناک موت کا ہے کو مارا۔اور دیکھو خود بھی کیسے المناک انجام سے دوچار رہوا۔گورے ٹامیوں نے اٹھا کر ماریشس کے جنگلوں میں پھینک دیا۔

کینڈی کو جزیرے کا حسین ترین شہر کہا جاتا ہے۔تو اس میں شک بھی کیا ہے۔ یوں سری لنکا کے لوگ سری لنکا کو بھی a land like no other کہتے ہیں تو یہ بھی سولہ آنے کیا سو پیسے سچ بات ہے۔

شہر ہوں، ملک ہوں اپنے اندر تاریخ کا کیسا خزانہ سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔تیرھویں اور چودھویں صدی میں مذہبی مرکز بنا۔پھر سیاسی گڑھ بنا۔پرتگیزوں نے قبضہ جمالیا۔انگریزوں کی رال ٹپکی انہوں نے اپنے رشتہ داروں سے اسے چھین لیا۔خیر سے دوسری جنگ عظیم میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

جھیل کے کنارے ایک عظیم الشان، انتہا درجے کی خوبصورت ،آنکھوں کو جکڑنے والی موتیا رنگی سُرخی اور خاکستری رنگوں کی آمیزش سے سجی عمارت تعمیری شاہکار کی صورت سامنے موجود تھی۔یہیں وہ مقدس دانت ہے جو بدھا کی نعش سوزی کے بعد کنول کے پتے پر رکھا گیا اور جسے مقدس ترین ٹھہرایا گیا۔زمانوں تو یہ ہندوستان میں رہا۔شہر کا نام Danta pura تھا یعنی دانت کا شہر۔آج کل کا نام اڑیسہ صوبہ ہے۔

ہاں جزیرے پر کیسے آیا؟یہ بھی عقیدتوں اور محبتوں میں گندھی کہانی ہے۔جیالی سی بدھا کی محبت میں مرنے والی ایک شہزادی اپنے گھنے بالوں میں چھپا کر لائی۔پہلے انورادھا پورہ میں رکھا گیا۔بادشاہ سری میگھاوانا کا زمانہ یہی کوئی 313 کا تھا۔کیسی کیسی خوفناک لڑائیوں کی داستانیں جڑی ہیں اِس سے۔یہ تو جلد ہی شاہی اقدار کا محافظ بن گیا۔عقیدتوں کا مرکز شمار ہونے لگا۔کسی حملہ آور کی کیا مجال اس کے ہوتے ہوئے شہر پر قابض ہو جائے۔

کوئی دسویں صدی میں جب انورادھا پورہ کا سقوط ہوا اِسے کینڈی لایا گیا۔ بادشاہ وملادرما سوریا اوّل Vimmaladharma Suriya I نے اِسے عقیدتوں اور محبتوں کے ہزار رنگوں سے محل بنا کر رکھا۔بعد میں اس کے جانشینوں وکراما راجہ سنگھا Wickrama Raja Singha نے موجودہ عمارت بنائی اور اسے یہاں سجا

دیا۔انہوں نے بھی اپنے اپنے حساب سے اس میں رنگ بھرے۔

داخلہ ایک کھائی کے راستے سے ہوا۔پتھر کی سیڑھیاں زائرین کو ایک سرنگ سے گزارتے ہوئے آگے صحن میں لے جاتی ہیں۔عین سامنے دو منزلہ عمارت جس کی اوپر کی منزل پر مقدس دانت محفوظ ہے۔چیکنگ کے مرحلے خاصے سخت تھے۔معلوم ہوا تھا کہ اسکارف پہنے والی کسی خاتون کو اندر جانے نہیں دیا جاتا۔

یہ وطیرہ تامل ٹائیگرز کے دہشت پسندوں کی طرف سے تھا یا القاعدہ والوں کی طرف سے کہ سُننے میں آیا تھا کہ دونوں تنظیموں کی آپس میں کافی پیار و محبت ہے۔لین دین اور صلاح مشورے بھی ہوتے رہتے ہیں۔

ٹیرس، راہداریاں، بڑے بڑے ہال، چھوٹے کمرے ہائے کیا نقاشی تھی؟ چھتوں کی، دیواروں کی، ستونوں کی، ان کے بڑھاوں کی، ریلنگوں کی، چوبی کندہ کاری، چوبی ڈیزائن کاری ہائے کسے دیکھیں اور کسے چھوڑیں۔لوگوں کے پُرے عقیدتوں کے سنگ جھلملاتی آنکھیں اور چہرے۔

یہاں ہال میں بُدھا کا زروسیم میں اُلجھا ہوا بدن۔اب بھلا ایسے میں وہ خوبصورت شاعرہ منصورہ احمد بھلا کیسے نہ یاد آتی۔وہ آئی اور میں نے نظم گنگنائی۔

سُنو کہ تم
تمہیں تو یاد ہو گی وہ گھنی تاریک شب
جب سیم و زر کی بزم خوئی چھوڑ کر
تم آگ اور بیراگ کے رستوں پہ نکلے تھے
پھر اس کے بعد تم تھے
اور کانٹوں سے بھری اک راہ جدھائی تھی
تمہارے خاکدان کی روشنی میں
کوئی بھی تار سونے کا نہیں تھا
مگر پھر کیا ہوا کہ تم
تمہارے چاہنے والوں نے
تم کو اور تمہاری عظمتوں کو
تمہارے چشم کی سب سلوٹوں کو

پھر سے سونے کی سلوں میں قید کرڈالا
یہ کیا اسرار ہے گوتم
محبت زر کے پیمانوں سے باہر کیوں نہیں آتی
بے تکی خواہشوں اور سوچوں پر کون سے پہرے اور کون سی پابندیاں ہوتی ہیں جو اپنی حدود میں رہیں۔
ہائے کیسے میرا جی چاہا تھا کہ کہیں اگر مجھ جیسی عام سی عورت کیلئے وہ کمرہ کھل جائے جہاں صدیوں پرانی خالص چاندی کے بھاری بھرکم بڑے سے صندوق میں سات صندوقچیاں ہیں جنہیں سنہالی زبان میں (Karandawa) کارندوا کہتے ہیں۔یہ سب ایک دوسرے میں گھسی ہوئی ہیں۔روسی گڑیوں کی طرح کہ ایک کے اندر سے دوسری اور دوسری کے اندر سے تیسری نکلتی آئے۔یہ صندوقچیاں ہیرے جواہرات سے سجی لشکارے مارتی ہیں۔
ہائے اندر سے پھر ہوک اٹھی تھی۔
کہیں کمرہ کھل جائے۔اندر گھس جاؤں اور صدیوں پُرانی وہ تاریخی چیزیں دیکھوں۔آنکھوں میں مچلتی پیاس بجھاؤں۔
میں اپنی اِس بچگانہ سی خواہش پر ہنس پڑی تھی۔
واہ کیسی انوکھی لاڈو بی بی ہے۔کھیلن کو چاند مانگے ہے۔
پھر خود کو ایک شاندار قسم کی لتاڑ دی۔
''اُلّو کی پٹھی۔سوچیں دیکھو ذرا اس کی۔بغیر پروں کے اڑانیں بھرنا چاہتی ہے۔وہاں جانا چاہتی ہے جہاں پرندہ پر نہ مار سکے۔سات تالوں میں چُھپا جسے چرانے کی ،اُڑانے کی ہزار کوششیں بادشاہوں نے کیں۔آخر طاقت اور غلبے کے منبع کو کون قابو کرنا نہیں چاہے گا۔برما (حالیہ میانمار) کا شاہ تو اِس معاملے میں خاصی خراب شہرت رکھتا تھا کہ بار بار اِسے اڑانے کی ہڑک اُسے نچلا نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔
اور ہاں ذرا دیکھو تو محبتوں اور عقیدتوں کے رنگ کیسے کیسے انسانوں کو متاثر کرتے ہیں۔
شہنشاہ Tihatura نے اپنی بیوی کے بالوں سے جھاڑو بنایا اس کی مٹھ کو ہیرے جواہرات سے سجایا اور اُسے صفائی کیلئے مخصوص کیا۔ہائے صدقے محبتوں کے

رنگ ۔

بدھ دنیا کا یہ مقدس دانت طلسم بھرا تو ہے ہی پر ساتھ میں منسوب کہانیاں تو اور بھی طلسم زدہ ہیں ۔پہلا اسرار تو اس کی جسامت بارے ہے کہ یہ بائیں طرف کا تیز نوکیلا سامنے والا دانت ہے ۔ڈھائی سینٹی میٹر چوڑا اور ایک سینٹی میٹر موٹا ۔یار لوگوں کے اعتراض پر جواب یہی ہے کہ بھئی بُدھا صدیوں پہلے کا انسان جس کی ہر چیز غیر معمولی تھی ۔قرین قیاس اور دل کو لگنے والی بات ۔

یہ جب ہندوستان میں تھا تب بھی بڑی کٹھنائیوں سے گزرا تھا۔دوسرے مذاہب کے پیرو کاروں کو اس کی ہر دل عزیزی بڑی کھلتی تھی ۔

کہیں گوا کے بشپ نے حکم دیا کہ اِسے پیس کر سفوف بنا دو اور سمندر بُرد کر دو ۔حکم شاہی بڑا سخت تھا ۔مگر پجاری بھی جان پر کھیلنے والے تھے ۔چالاک ستہایوں نے ایک دوسرا دانت پیش کر دیا تھا۔

اب سوالوں کی بھی لام ڈور ۔دانت واقعی مہاتما گوتم بُدھا کا ہی ہے ۔جو ہندوستان سے لایا گیا ہے ۔اس کی کوئی شہادت بھی میّسر ہے یا نہیں اور کیا اِسے کبھی کسی نے دیکھا بھی ہے؟ سارے جوابات نفی میں ہیں ۔

اور جب میں بدھا کے اِس مقدس چیمبر میں کارپٹ پر بیٹھی سوالوں کی گھمن گھیریوں میں اُلجھی ہوئی تھی جو اپنی تسلی و تشفی کیلئے ایک دوسرے پر چڑھائیاں کر رہے تھے ۔ ذہن تو ہمیشہ سے ہی اُلٹے سیدھے سوالوں کی گھمن گھیریوں میں اُلجھا رہتا ہے ۔سب کچھ جانتے بُوجھتے بھی خدا کی حاکمیت کے انداز کی تجدید چاہتا ہے ۔شاید کہیں اندر اُلٹے سیدھے جذبوں کی بھی تشفی کے قائل ہونے کا متمنی رہتا ہے ۔اُس لمحے کی سوچ بھی کچھ ایسی ہی تھی ۔

بھئی یہ سب خدائی کام ہی ہیں کہ وہ اپنی اِس عظیم سلطنت کے مذہب سے لے کر اس کے حصے بخروں،ٹوٹوں اور عروج و زوال کے المیوں میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے ۔ایک مذہب کا پجاری خاص طور پر بادشاہ یا مبلغ کسی دوسرے مذہب نظریئے یا عقیدے میں داخل ہو کر نئے مذہب کی تقویت کا باعث بنتا ہے ۔شہنشاہ وملا درما اول Wimm aladharma Suriya I جو عیسائی کیتھولک تھا اور نام نامی Juan d. Autriche ۔جانے جی میں کیا آئی ۔بدھ مت کا پیرو کار بن گیا ۔کچھ ایسا

ویسا۔بہت سرگرم اور جوشیلا۔سب سے بڑا محافظ اور خیر خواہ۔

یہ حقیقت تھی کہ یہاں لوگوں کی ہزار رنگی اور اُن کے چہروں پر پھیلے جذبات و احساسات کی ہفت رنگی سب چاہتے تھے کہ کچھ مزید وقت یہاں گزارا جائے۔مگر جب گائیڈ جیسی جونک ساتھ چمٹی ہو تو مہار اس کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ہماری نکیل کی رسّی بھی مسٹر جسٹمن کے ہاتھوں میں تھی۔

گاڑی دائیں بائیں موڑ کاٹتی ہندو کلچرل سنٹر کی عمارت کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔بتایا گیا کہ یہاں سری لنکا کے مایہ ناز آرٹسٹ مالیوی کی تصویری نمائش ہو رہی ہے۔مسٹر جسٹمن کے آرٹسٹ کا پورا نام ایک ہی سانس میں لینے کی وجہ سے بس ہمیں تو مالیوی ہی یاد رہ گیا۔

سری لنکا کا بہت بڑا فخر جو کہتا ہے کہ دنیا کا ہر انسان اپنا برش اپنی ہی روح میں ڈبوتا ہے اور اپنی ہی فطرت اپنی ہی تصویروں کی شکل میں پینٹ کرتا ہے۔ایک سٹینڈ پر لکھی ہوئی اُس کی یہ بات کتنی صحیح تھی۔

یہ تجریدی آرٹسٹ مسٹر جسٹمن کے مطابق اپنے وطن کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔اس کی ہزاروں سالوں کی پرانی تہذیب پر نازاں، اسکی خوبصورتیوں پر فریفتہ اِسے دنیا بھر میں ممتاز کرنے کی دُھن میں لگا ہوا ہے۔

میں جب اُن شاہکاروں کو دیکھتی تھی خدا گواہ ہے اِسے آپ میری تجریدی آرٹ فہمی کی نالائقی شمار کر سکتے ہیں۔مجھے خاک سمجھ نہیں آرہی تھی۔انسانی اشکال ضرور کہیں کہیں واضح ہوتی تھیں پر پیغام کیا تھا۔یہ سمجھنا ناممکن تھا اور کچھ ایسا ہی حال قدرتی مناظر کا تھا۔

چیختے چنگاڑتے رنگوں کی برسات ضرور تھی۔ہاں اگر کچھ تھوڑا بہت پلّے پڑا تو وہ پویلین تھا جہاں اُنہے سری لنکا کا ایک گاؤں اپنی چھوٹی بڑی جزئیات کے ساتھ پیش کیا تھا۔غریب کا جھونپڑا، باہر تاروں پر سوکھتے کپڑے، ہل اور ہل چلاتا سانڈ، بازار۔مندر۔دیہی زندگی کی کون سی چیز ایسی تھی جو یہاں پیش نہ کی گئی ہو۔بہت عمدہ کاوش۔

اب نیشنل میوزیم میں گھس گئے۔پانچ صدیوں کا اثاثہ یہاں موجود تھا۔بُدھا کے کینڈی دور کے مجسموں کی یہاں بھر مار ہوئی پڑی تھی۔سر پر دھرے شعلے اور تن پر لہریئے دار عمدہ چُغہ پہنے ہوئے صحت مند بُدھا۔

کوئی پوچھے کہ ہم جس بُدھا کا حال احوال زمانوں سے پڑھتے چلے آئے ہیں وہ تو کھوہولا تھا۔یہ کس کی نمائندگی ہے؟

قدیم نواب عمائدین سلطنت ان کے تاج،آرائشی سامان۔سب سے دلچسپ حصّہ چوبی کندہ کاری کا تھا۔کیا خوبصورتی اور حُسن تھا ان چیزوں کی کندہ کاری میں۔یہ سب گمپولا اور کینڈین ادوار کی نمائندہ تھیں۔کینڈی شہنشاہیت کے پہلے بادشاہ سیناوکرما بھاباہو Sena Wiekrama bahu 1473 سے بیسویں صدی تک۔

رائل پیلس آف کینڈی دیکھا۔پھر ڈاؤن ٹاؤن میں آگئے۔کہیں اِکی دوا اور کہیں سہ منزلہ عمارتوں کی چھتیں خفیف سی پگوڈا اسٹائل کی تھیں۔کہیں عمارتیں محرابی برآمدوں اور بالکونیوں والی تھیں۔

انسانوں کے ہجوم سے بھرا پُرا۔گاڑیوں کی پی پی سے بولتا،گونجتا،بھاگتا،دوڑتا،آوازیں دیتا اور بُلاتا یہ پرانا اور قدیمی کینڈی۔اگر ایک طرف ناریل کے پہاڑ کھڑے ہیں تو دوسری طرف انگلی بھر لمبے کیلوں کے لٹکتے گچھے حیرت زدہ کرتے تھے۔اناس کی میٹھی سی خوشبوئیں معطّر کیئے دیتی تھیں۔بھاری جسامتوں والے ہرے کچور آم۔سونگھا تو خوشبو نام کو نہ تھی۔ہمارے ہاں کے آم واہ کیا بات تھی اُن کی بھی سچے اور سُچے عاشقوں جیسی خوشبو رکھنے والے جس کمرے میں ہوں پورے گھر کو خبر کرتے ہیں۔عشق اور مشک کی طرح چھپائے نہیں چُھپتے۔اپنے ہونے کا اظہار ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔

اور یہاں گھومتے پھرتے میری باتھ روم کی حاجت نے زور پکڑ لیا۔یہ حاجت مجھے گذشتہ گھنٹے سے محسوس ہو رہی تھی جسکی ناکابندی میں نے کسی موزوں جگہ کی دستیابی تک کیلئے کر رکھی تھی۔مگر اب حالات زیادہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

مہرانساء جم کی ایک دکان میں گھسی ہوئی تھی اور میں لاہور کے مال روڈ پر برٹش دور کی یادگار عمارتوں جیسی ہی ایک مارکیٹ میں گھومتی پھرتی نظاروں سے لُطف اندوز ہو رہی تھی۔

اب میں خود سے کہتی تھی "اللہ کہاں جاؤں؟"چند لوگوں سے پُوچھا بھی مگر کسی نے مناسب رہنمائی ہی نہ کی۔مجبوراً میں نے قریبی دکان کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔پریشانی اور اضطراب یقیناً میرے چہرے پر پھیلا ہوگا۔صورت پر مسکینی سی برس رہی ہوگی۔
دروازے کے پاس سے ہی کسی نے وجہ پوچھی۔مدعا بتایا۔اس نے رہنمائی کی۔

سکھ اور سکون کا بڑا لمبا سانس تھا۔خود سے کلام بھی تھا کہ بندہ معلوم نہیں کس پر اترا نا پھرتا ہے۔اوقات تو بس اتنی سی ہے کہ اندر گیا ہوا آدھ لیٹر پانی اگر باہر نہ نکلے تو ہارون الرشید جیسے خلیفہ آدھی سلطنت دے ڈالنے پر تل جاتے ہیں اور ہم جیسے غریب تڑے اپنی پوری کائنات۔

اب اطمینان بھری نظر ماحول پر ڈالی۔یہ سُناروں کی دکان تھی۔شوکیسوں میں جلوے تھے۔قطار میں تھوڑے تھوڑے سے فاصلے پر موٹی گدیوں پر بیٹھے چار مرد تھے۔دو تین اِدھر اُدھر گھومتے تھے۔پتہ چلا کہ مسلمان ہیں۔پاکستان کا سن کر انکی آنکھیں بھی چمکیں۔

اب سُننے کو ایک کہانی تھی۔

لنکا کے خوبصورت شمالی شہر جافنا Jaffna میں مسلمان پچاس فیصد سے زیادہ کی تعداد کے شہری تھے۔اکثریت فشنگ کے کاروبار سے وابستہ اور کاروباری ساکھ کے اعتبار سے بہت مظبوط تھے۔شہر میں بدھ، ہندو، مسلمان اور عیسائی مل جُل کر پُر امن انداز میں رہتے تھے۔جب تامل ٹائیگر زلبریشن جیسی تنظیم کا شور اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی مار دھاڑ جیسی کاروائیوں نے شہریوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا۔

آغاز میں تو تاملوں کے حقوق کی بات تھی۔اُنکی محرومیوں کا رونا تھا۔جافنا کا مئیر ایلفرڈ دوور جو ایک صُلح جو، امن و آشتی کا پرچار کرنے والا، سبھی مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ہمدردانہ جذبات رکھنے والے انسان کا قتل ہوا تو گویا مسلمانوں کیلئے ایک سنگین ترین صورت نے جنم لے لیا۔

''بہت جلدی ہمیں اُس عذاب سے گزرنا پڑا۔جس میں صرف دو گھنٹے کے نوٹس پر بندوقوں کی نوک پر پورے جافنا کے مسلمانوں کو شہر خالی کر دینے کا کہا گیا۔

بڑی دکھ بھری آہ تھی جو اُس اُدھیڑ عمر مرد کے ہونٹوں سے نکلی تھی جو سانوس نفیل تھا اور مجھے یہ سب سُنا رہا تھا۔

گھر سے بے گھری کیسا المناک اور غم انگیز تجربہ ہے کوئی ہم سے پوچھے۔کیسے ہم ریوڑوں کی طرح بھوکے پیاسے تین کپڑوں میں کیمپوں میں پناہ گزین ہوئے؟ ہماری مسلم کمیونٹی نے دل کھول کر ہماری مدد کی۔گورنمنٹ نے سیٹ ہونے میں ہاتھ بٹایا۔

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس وقت دکان میں گاہک نہیں تھے۔سانوس سے یہ سب

سُنتے ہوئے ساتھ بیٹھے ساتھی بھی ملول سے تھے۔یقیناً سب متاثرین تھے۔پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔

آخر اِس تنظیم نے مسلمانوں کو ہی کیوں ٹارگٹ کیا؟ میں حقیقت کے اندر اُترنے کی خواہش مند تھی۔

مسلمان طبقے کا بااثر ہونا اُنہیں کھلتا تھا۔اُنہیں وسطی اور جنوبی حصّوں میں دھکیل کر وہ پورے سری لنکا میں اشتعال انگیز صورت پیدا کر کے حکومت کیلئے مسائل پیدا کرنے اور مسلمانوں کو بقیہ فرقوں سے لڑانا چاہتے تھے تا کہ انہیں بالکل بے اثر کیا جا سکے۔دوسرے لوٹ مار کرنا بھی مقصود تھا کہ ایسے ہی حربوں سے تو وہ تنظیم کیلئے پیسہ اکٹھا کرتے تھے۔

چائے اور بسکٹ آ گئے تھے۔چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچیں کہاں کہاں اڑائے لیے جاتی تھیں۔دل تو بے اختیار ہی کہیں اُس شعر میں اُلجھنے لگا تھا جو اپنی پوری صحت کے ساتھ یاد نہیں آ رہا تھا۔اِس کی اُمت پر وقت بھی تو اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ پڑا تھا۔بیلنے میں ٹھنسے گنے کی طرح نچوڑ کر پھوک بنا ڈالا تھا۔

پھر ایک درخواست آئی کہ اگر آپ آج رات کو غریب خانے پر تشریف لائیں تو میری بہن سے اِس ضمن میں آپ کو بہت کچھ سُننے کو ملے گا۔وہ بہت عرصہ عرب امارات میں رہی ہے اور بہت اچھی انگریزی بولتی ہے۔اس کی ہمسائی اور مسلمان دوست کا بیٹا اِس تنظیم میں پھنس گیا تھا۔وہ آپ کو تفصیلی کہانی بھی سنائیں گی اور آپ رات کا کھانا بھی ہمارے ساتھ کھائیے۔

کہانی،کھانے کی دعوت،گھریلو زندگی کے بہت سے رُخ۔پیشکش تو بہت کمال کی تھی۔بھلا لکھاری سیاح کو کیا چاہیے تھا۔پر ساتھ چمٹے دو بندے۔مہر انساء اور مسٹر جسٹمن۔

''میں شکر گزار ہوں آپ کی۔میرے ساتھ میری دوست اور گائیڈ بھی ہیں۔''میں نے بتایا۔''تو انہیں بھی خوش آمدید۔''سانوں نفیل خوشدلی سے بولے۔سچی بات ہے میں تو نہال ہو گئی تھی۔

''منا لوں گی دونوں کو۔''میں خود سے کہتے ہوئے باہر نکلی۔

گاڑی تک پہنچی مسٹر جسٹمن اپنی سیٹ پر بیٹھے اخبار کے مطالعے میں گم تھے۔مہر انساء نیم دراز اُونگھ رہی تھی۔

میں نے بیٹھنے کے ساتھ اخبار سے متعلق پُوچھا اور دیکھنا بھی

چاہا۔نام Divaina تھا۔سنہالی میں تھا۔رسم الخط تو مجھے بڑا آرٹسٹک سالگا۔یہ دائروں اور نیم دائروں میں اُلجھا ہوا سا۔ہندی سے تو ہماری نظری شناسائی خاصی ہے۔اُس سے تو مجھے کوئی مماثلت نہ لگی۔ہوگی بھی تو کسی دور پار کے رشتے والی قربت کا سا تعلق ہوگا۔مسٹر جسٹن بتاتے تھے کہ سنکرت سے قرابت داری ہے۔ہونی بھی چاہیے ماں تو برصغیر کی وہی ہے۔

مہرانساء جاگ گئی اور حسب معمول میری کلاس شروع ہوگئی تھی۔

''تو کھانا کیا ہے؟''میں نے اُس کی شکایتوں سے لبالب بھرے سوالوں کی لام ڈور کو بیچ میں سے ہی توڑتے ہوئے کہا۔

''آج کینڈی کا سپیشل کھانا کری چاول کھاتے ہیں۔'' مسٹر جسٹن نے کہا۔

وہیں قریب ہی ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں جا گھسے۔ناک ناک تک آیا ہوا تھا۔بڑے سے ہال میں صرف ایک یا دو کرسیاں کہیں خالی ہونگی۔

مہرانساء باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''کوئی فاسٹ فوڈ ٹائپ چیز لے لو۔یہاں تو حشر ہوا پڑا ہے۔''

مگر جسٹن پریرا نے ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور تین پلیٹیں ٹرے میں رکھوا کر لے آئے۔یہ موٹے اُبلے ہوئے چاولوں، پرانز Prawns اور سلاد کے ساتھ سجی ہوئی ڈش تھی۔

''اللہ کرے ذائقہ بھی اچھا ہو۔''میں نے کہا اور ہاتھوں کو بسم اللہ کہتے ہوئے پلیٹ میں ڈال دیا۔چلو شکر کھانا اچھا ہی تھا۔پیٹ پوجا تو ہوئی۔

یہ بہرحال مسٹر جسٹن کی نوازش تھی کہ ساری سہ پہر اور شام انہوں نے ہمیں گاڑی میں گھمایا۔بدھسٹ پبلیکیشنز سوسائٹی کے ہیڈ کواٹر میں لے کر گئے۔یہ وہیں جھیل کے پاس ہی ہے۔اتنی بڑی لائبریری اور اس میں ہر نوع کے جدید آلات اور مزے کی بات تیز گام جیسی انگریزی بولنے والے بدھ بھکشو۔یہ بھی دلچسپ بات تھی کہ کونے میں یورپی لوگوں کا ایک ٹولہ عقیدتوں کے رنگوں میں ڈوبا اُن کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔

ہم نے سری لنکا کا سفر کرنے سے پہلے ایک غلطی ضرور کی کہ تہواروں کا خیال نہیں رکھا۔وگرنہ اِس ملک کا وہ خاص الخاص تہوار جو پیراحرا Perahera ہے اور جولائی کے آخر اور اگست کے پہلے ہفتے منایا جاتا ہے۔دیکھتے تو سہی۔اب تو بات سننے تک محدود تھی۔

اس تہوار کی بھی کیا بات ہے۔ماضی کی کسی حسین ترین طلسماتی کہانی جیسا جس

کی ہر رگ ،ہر ورید میں سے رنگ اور سُر پھوٹیں ۔ پہلے پانچ دن تو شان وشوکت کا عمومی اظہار ہوتا ہے مگر چھٹی رات اور وہ بھی چودھویں کی رات جب چاند درختوں کی چوٹیوں سے جھانکتا ہے اور بدھ بھکشوؤں کے ہاتھوں میں پکڑے جھنڈے کینڈی کی لطیف سی ہواؤں میں پھڑ پھڑاتے ہیں ۔مقدس دانت گھر کی عمارت جھیل کے پانیوں میں ہلکورے کھاتی نظر آتی ہے ۔اور زرد روشنیاں ایک نئے منظر کا دروازہ کھولتی ہیں ۔کہیں دور سے کوڑے برسنے کی آوازیں ،راستے کھلے کرنے کیلئے آوازوں کی گھن گرج ،رقص کرنے والوں کا رقص ،ڈرم بجانے والوں کی ڈرمنگ ،فلیوٹ بجانے والوں کا فلیوٹ اور پہیوں پر جلتی آگ اور سونڈیں ہلاتے جُھومتے زرق برق غلافوں میں لپٹے ہاتھی ۔رنگوں کی اِس برسات ،روشنیوں کے اِس طوفان ،موسیقی کے اِس شور اور آوازوں کے غل غپاڑے میں وہ خاص الخاص ہاتھی کیسا سجا سنورا جگمگاتا جس کی پشت پر دھری طلسمی سی پالکی میں وہ صندوقچہ رکھا ہوا نظر آتا ہے جس میں اس مقدس دانت کی علامتی نقل موجود ہے ۔

تو ایسے تہوار کو دیکھنا کیسا پُر مسرت ہوتا ۔جس کے منہ زبانی قصے سن کر میری آنکھوں سے مسرتوں کی رال ٹپکنے لگی تھی ۔

اور جب شام ڈھل رہی تھی ۔بلند وبالا عمارتوں کی چوٹیاں سنہرے رنگ میں نہا رہی تھیں ۔درختوں کے جھنڈوں میں اندھیرے اور اداسی نے پاؤں پسار لئے تھے اور ہم واپس آرہے تھے ۔مسٹر جسٹمن سے درخواست کی تھی اور مقام شکر تھا کہ انہوں نے کچھ کہے بغیر ہاں کہہ دی تھی ۔

ساڑھے سات بجے ہم ہوٹل سے نکلے ۔پتہ کی چٹ میں نے جسٹمن کو پکڑا دی تھی ۔گھر ٹاؤن ہال کے پاس ہی تھا ۔دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں ۔خوبصورت گھر کشادہ دو منزلہ ،چھوٹا سا لان ناریل اور پپیتے کے بوٹوں سے سجا ۔

پورا خاندان برآمدے میں آکھڑا ہوا تھا ۔ہائے جی خوش ہو گیا ۔

سانوس کی بیگم ،دو بیٹیاں ،تین بہویں ،ان کی بہن ۔ماشاءاللہ سے لڑکیاں اور پھوپھی سب انگریزی میں طاق تھیں دونوں بیٹیاں انگلینڈ میں رہتی تھیں ۔

رزق ،علم ،شائستگی اور محبت کی فراوانی محسوس ہوئی تھی اُس گھر میں ۔انتہائی لذیذ کھانا ۔روسٹ فش اور چکن ۔اُبلے چاول ،دال ،سلاد ،میٹھے میں سری لنکا کی خاص مٹھائی جو صورتاً گڑ سے بہت ملتی جلتی تھی ۔البتہ رنگت میں چٹی دودھ جیسی ۔پھل دوشی جگری Phul

Doshi Juggryشہداس کی اجزائے ترکیبی کا اہم جز ہے۔بھئی مزے کی چیز ہے۔
ہم بھی اچھے کھانے کیلئے دنوں سے ترسے ہوئے تھے۔خوب ڈٹ کر کھایا۔وضاحت بھی کی۔اورپھر رفیدہ سے وہ کہانی سننے کو ملی جوہمیں یہاں لائی تھی۔

باب نمبر:۵ اپنے حصے کا دیا جلائیں

پل کے ہزارویں حصے میں بھی لاریف ہادی اس بات کا تصور تک نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا بیٹا لبریشن ٹائیگرز اف تامل جیسی جنگ جُو اور دہشت گرد تنظیم کے اجلاسوں میں شرکت کرتا ہے۔تنظیم کے بانی ویلو پلائی پر بھاکرن سے عقیدت اس کے مقاصد سے ہمدردی اور تاملوں پر سہنالیوں کی زیادتیوں کے خلاف جافنا کے مضافات میں ہونے والے چھوٹے موٹے جلسے جلوسوں میں لمبی لمبی تقریریں جھاڑتا ہے۔حالیہ خودکش حملوں میں مرنے والے چند نوجوانوں سے بھی اُس کا یارانہ تھا۔

اُس کی آنکھوں میں حیرت ہی نہیں تھی وہ شدید کرب سے بھی خوفناک حد تک پھیلی ہوئی تھیں۔اس کا دل وسوسوں کی آماجگاہ بناہوا تھا۔یہ کیسے ممکن ہے؟وہ اتنا بے خبر تھا۔کیا وہ اس پر یقین کرے یا نہ کرے؟اس کا بیس سالہ پانچ فٹ گیارہ انچ لمبی قامت والا بیٹا کب اور کیسے اس جال میں پھنسا۔اور کیوں پھنسا؟یہ سارے سوال جواب وہ خود سے کئے چلا جاتا تھا۔

ڈاکٹر حسب اللہ نے آہستگی سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔وہ اس کے اندر کے اُتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھے۔سمجھ رہے تھے کہ وہ کس اذیت ناک کیفیات سے گزر رہا ہے؟

یہ سری لنکا کے خوبصورت شمالی ساحلی شہر جافناJaffna کی خوبصورت سی صبح تھی۔پیرا ڈینیاParadenliya یونیورسٹی سے ڈاکٹر حسب اللہ کل یہاں آئے تھے۔وہ کاروبار کے سلسلے میں رتناپور گیا ہوا تھا۔رات کو واپس آیا تو انور سُبحانی نے بتایا کہ صُبح مسجد میں نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب کا لیکچر ہے۔لاریف ہادی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ڈاکٹر حسب اللہ مسلمانوں کی سری لنکن تنظیم کے بانی اراکین میں سے ایک تھے۔پارے کی طرح متحرک

یہ شخصیت سری لنکا کے مسلمانوں کے لئے اُمید اور حوصلے کا پیغام تھی۔

جافنا کی پچاس فیصد مسلمان آبادی کاروباری لحاظ سے خاصی مضبوط تھی۔ ڈاکٹر حسب اللہ کا دو تین ماہ بعد یہاں کا چکر ضرور لگتا تھا۔ مقامی مسلمان اُن کی آمد کے منتظر رہتے۔ سری لنکا کے شمالی علاقوں میں تامل ٹائیگرز کی سرگرمیاں بُہت بڑھ چکی تھیں۔ مسلمان کمیونٹی ان سرگرمیوں سے خاصی پریشان بھی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب!'' لاریف ہادی کی آواز جیسے غم سے بوجھل تھی۔

''کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ میرا بیٹا یقین نہیں آتا۔'' آواز جیسے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

''گھبراؤ نہیں! حوصلے سے کام لو۔ صورت حال کو بُردباری سے سنبھالو۔ میری معلومات غلط نہیں اور یہاں دیکھو سختی کی ضرورت نہیں۔ جوان خون ہے بپھر جائے گا۔ آرام اور دلداری سے باز پُرس کرو۔''

اس وقت ان دونوں کے ساتھ مسلم رائٹس آرگنائزیشن کے انیس احمد بھی تھے۔

ہادی جب گھر جانے کے لئے کھڑا ہوا تو اسے محسوس ہوا تھا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی تڑاق کھا گئی ہو۔ پتا نہیں کیسے وہ مسجد سے باہر نکلا اور گھر آیا۔ بیوی نے اُڑی اُڑی رنگت دیکھ کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے؟''

''ہاں بس ایسے ہی ذرا دل گھبرا رہا ہے۔''

آنگن کے کونے میں پڑے کچے کولڈن ناریل کا ڈھیر لگا پڑا تھا۔ اس نے تیز دھار کے گنڈاسے سے اس کا اوپر والا حصہ کاٹا اور کمرے میں آئی جہاں ہادی لیٹا ہوا تھا۔

بیوی کے ہاتھوں میں پکڑا کولڈن ناریل اور اُس کے چہرے پر چھائے تفکر نے اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا۔ دھیرے دھیرے گھونٹ گھونٹ ڈاب پیتے ہوئے اُس نے اپنے اندر کی تلخی کو کم کرنا چاہا پر اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں آگ لگی ہے پھر دفعتاً اُس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے پاس بٹھا لیا اور بولا۔

''لاطف کہاں ہے؟''

''گھر میں تو نہیں، کہیں باہر گیا ہے۔''

''ابھی نو بجے ہیں اور باہر بھی چلا گیا ہے۔ تمہیں بتا کر نہیں گیا۔''

بیوی کو ہادی کے یوں بات کرنے پر قدرے حیرت سی ہوئی۔ یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں، وہ تو ہمیشہ سے صبح سویرے باہر نکل جاتا تھا۔ کبھی رات گئے گھر آتا۔ ابھی گریجوایشن سائنس فائنل کا تو اسٹوڈنٹ تھا۔

ایک لمحے کے لئے ہادی کا جی چاہا کہ وہ بیوی کو اپنی پریشانی اور تفکر سے آگاہ کر دے۔ اپنا دُکھ اور کرب اس سے شیئر کرے، مگر وہ رُک گیا۔ اُس نے دل میں اپنے آپ سے کہا۔

''اِس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ عورت ذات یونہی خوف زدہ ہو جائے گی۔''

ہادی کا **فشنگ** کا کاروبار تھا۔ جافنا میں اس کی اچھی ساکھ تھی۔ اپنی دو لانچیں اور دو فیریاں تھیں۔ اس کے کارندے مچھلی Kankesantura سے آگے ہندوستان کے ساحلی شہروں تک لے جاتے تھے۔

سائیکل رکشا پر بیٹھ کر وہ اپنے دفتر آگیا۔ جو مور روڈ پر تھا۔ جونہی وہ سائیکل رکشا سے اُترا، دفتر کے چھوٹے سے دروازے کے سامنے لاطف کھڑا تھا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی اس پر غصہ، رنج اور یاسیت کے ملے جلے جذبات کا حملہ سا ہوا، پر خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے بیٹے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ لاطف باپ کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگیا۔ بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کر اُس نے کسی قدر حیرت سے باپ کو دیکھا جو پریشان نظر آرہا تھا۔

ہادی نے گہری نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور مدھم آواز میں کہا۔

''لاطف میں نے زندگی اور کاروباری معاملات میں ہمیشہ سچ بولنے اور سچ برتنے کو ترجیح دی۔ جھوٹ، غلط بیانی اور منافقت کبھی میرے کسی معاملے کی بنیاد نہیں رہے۔ وہ اصول جو میرے رہے اور ہیں انہی پر میں تمہیں بھی گامزن دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج میں جو تم سے پوچھوں گا تم مجھے سچ سچ بتاؤ گے۔''

لاطف حیران تھا، اُس کے باپ نے کبھی لمبی چوڑی باتیں تمہیدی انداز میں نہیں کی تھیں، وہ ہمیشہ سے مختصر بات کرنے کا عادی تھا۔ اُس کا دل دھڑکا اور اُس نے خود سے کہا

''یہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' پھر وہ حوصلے سے بولا۔

''آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔ آپ کو بھی پتا ہے کہ میں صاف اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔''

''تامل ٹائیگرز سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

ہادی نے اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔
لاطف کا رنگ بدلا۔شاید وہ ذہنی طور پر اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔
''تعلق'' اُس نے زیرِ لب کہا اور پھر کسی قدر جُرات مندانہ انداز میں بولا۔
''میں بس ان کے کا جلاسوں میں کبھی کبھار شریک ہو جاتا ہوں۔جس کاز کے لئے وہ جدو جہد کر رہے ہیں میں اُسے درست سمجھتا ہوں۔''
ہادی کا چہرہ بیٹے کی بات پر تپ اُٹھا۔وہ غصے سے چیخا۔
''شرم آنی چاہیے تمہیں ان کے کاز سے ہمدردی کرتے ہوئے۔بے گناہ معصوم لوگوں کو قتل کرتے ہیں،بھرے مجمعوں میں بم پھینکتے اور انسانوں کا قتل و غارت کرتے ہیں۔انسانی جانیں اُن کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہم نہیں۔۔۔پل بھر کے لئے وہ رُکا۔اُس کی آواز بھرا رہی تھی جب اُس نے بات دوبارہ شروع کی۔
ہمارے جافنا کے میئر الفرڈ دورپایہ کا کیا قصور تھا صرف یہ کہ وہ سہنالیوں تاملوں مسلمانوں اور عیسائیوں سبھوں کا ہمدرد انہیں مل جل کر امن و آشتی سے رہنے کی تلقین کرنے والا ایک مہذب اور شریف النفس انسان تھا جو انہیں ہضم نہیں ہو رہا تھا۔
''مگر وہ آزادی چاہتے ہیں۔'' لاطف نے باپ کی بات کاٹ دی۔
بھونچکا سا ہو کر اُس نے بیٹے کی اس بات کو سُنا۔اُس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔یہ اُس کا بیٹا کیسی لایعنی بات کر رہا تھا۔
''دیکھو اگر کہیں زیادتیاں ہوئی ہیں تو جو طریقہ اِن لوگوں نے اپنایا ہے وہ صریحاً غلط ہے۔احتجاج کرو۔اپنی آواز اوپر پہنچاؤ۔مگر یہ سب تو نہ کرو جو کر رہے ہو۔دراصل شرپسندوں کی یہ قوم انڈیا کے ہاتھوں کھلونا بن گئی ہے۔انڈیا جس کا بڑا مقصد سری لنکا کے شمالی حصے کو اپنے جنوبی حصے سے ملانا ہے۔یاد رکھنا میری بات آج تم جن کے ہاتھوں ناچ رہے ہو کل یہ تم مسلمانوں کا سب سے پہلے صفایا کریں گے۔''
''آپ طیش میں مت آیئے۔جذباتی ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔دلیل سے بات کریں۔احتجاج اور ہتھیار کبھی بھی بغیر وجہ کے نہیں اٹھائے جاتے۔ان کے پس منظر میں معاشروں کے اندر پلنے والی محرومیاں،ناانصافیاں،ایک طبقے کا دوسرے طبقے پر فوقیت،غلبہ اور احساس برتری جیسے جذبات واحساسات کا کارفرما ہونا ہے۔زیادتی اور برتری کی پہلی اینٹ 1954ء میں اس دن رکھ دی گئی تھی جب پارلیمنٹ میں سہنالیوں کی اکثریت نے

سنہالی زبان کو سرکاری زبان قرار دے دیا تھا۔

تامل لوگ کتنے غریب تھے اور ہیں۔ کتنے دھتکارے ہوئے ہیں۔ سری لنکا کی کسی ایک حکومت کا نام لے دیں جس نے انہیں اُنکے حقوق دیئے ہوں۔ اقتدار کو تو سہنالیوں نے اپنی جدی جاگیر بنالیا ہے۔ اب وہ کھڑے ہوگئے ہیں۔ انہوں نے ہتھیار اٹھالئے ہیں۔ علیحدگی اور خودمختاری کی باتیں کرنے لگے ہیں تو انہیں مصیبت پڑگئی ہے۔ اب بھگتیں۔

ہادی کا جی تو چاہا تھا ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے رخسار پر مارے اور کہے ''حرامزادے تاملوں اور اُن کے حقوق کیلئے جذبات کی اتنی اُنگل اُچھل۔ کبھی اپنی کیمونٹی کا بھی سوچتے ہو۔''

پرکمال ضبط سے خود سے پر قابو پاتے ہوئے دھیمی اور رسان بھری آواز میں بولا۔

''لاطف تم ابھی نا سمجھ ہو۔ اُن کی چالوں اور ریشہ دوانیوں کو نہیں جانتے۔''

وہ کھڑا ہوگیا اور باہر کی طرف جانے کے لئے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے اِک ذرا رُکا اور بولا۔

''اب میں اتنا بھی بچہ اور نا سمجھ نہیں۔''

کمرہ خالی تھا اور ہادی کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اُس کے وجود میں سے کسی نے زندگی کی ساری حرارت کشید کرلی ہے۔ جیسے وہ پتھر کا ہوگیا ہو، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے بظاہر پر کہیں خلاؤں میں گھورتا ہوا۔ دیر تک وہ اس کیفیت میں رہا پھر اپنے بیٹے کے بے شمار رُوپ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُبھرے۔ اُس کا بڑا بیٹا جس کے وجود سے اُس کی بے شمار توقعات وابستہ تھیں۔ بہت سارے خواب جن کی تعبیریں اُس کی زندگی کا ماحصل تھیں۔

بازی کیسے اُلٹ گئی؟ بیٹے نے ریل کی پٹڑی کے کانٹے کی طرح راستہ کیسے بدل لیا؟ اُس کی تربیت میں کہاں کمی رہی؟

جے جے ویرا سنگھ اُس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ویرا سنگھ کو تامل تھا مگر بڑا صلح پسند اور امن و آشتی سے محبت کرنے والا انسان۔ اُس کا بیٹا بھی تحریک کا رکن بن گیا تھا۔ بڑا جوشیلا جوان تھا۔ مرکزی حکومت کے وزیر صنعت کا ''مینار'' میں بڑا اہم دورہ تھا۔ بم دھماکے کے لئے اُس کو چنا گیا۔ سازش بروقت ناکام ہوگئی۔ ویرا سنگھ کا بیٹا پکڑا گیا۔ سائنائیڈ

کا کیپسول جو اُس کے گلے میں بندھا ہوا تھا اُس نے فی الفور وہ کھا کر زندگی کا رشتہ اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیا۔

ایک لمبی آہ اُس کے سینے سے نکلی۔جذبات سے لبریز یہ بالی عمر جس میں ہوش کے بجائے جوش غالب ہوتا ہے،اُسے جس طرف چاہے موڑ لیا جائے۔

پھر وہ اُٹھا،اپنے بے دم سے وجود کو گھسیٹا اور دفتر سے ملحقہ چھوٹے سے کمرے میں جہاں وہ بالعموم دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر لیٹتا تھا داخل ہوا۔جونہی وہ چٹائی پر بیٹھا۔ اُس کا ضبط جواب دے گیا۔اُس کے اندر کا دُکھ آنسوؤں کی صورت باہر آنے لگا۔وہ روتا رہا۔اپنے چہرے کو اس پانی میں نہلاتا رہا پھر لیٹ گیا۔پتا نہیں کب اُسے اونگھ سی آ گئی۔

جب وہ اس کیفیت سے نکلا ظہر کا وقت تھا۔اُس نے نماز پڑھی۔آج اُس کے سجدوں میں جو تڑپ تھی اُس نے اُس کی آنکھوں کو بار بار بھگویا۔دُعا کے لئے جب ہاتھ اُٹھائے تو اشک بار آنکھیں بند تھیں اور وہ خُدا سے مخاطب تھا۔بہت دیر تک وہ ہتھیلیاں پھیلائے جامد و ساکت حالت میں بیٹھا رہا۔

پھر جیسے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی منی سی کرن جھلملائی۔ مایوسی کی وہ انتہا جس پر وہ اس وقت پہنچا ہوا تھا۔۔۔دل گرفتگی جس میں وہ اُلجھا ہوا تھا قدرے کم ہوئیں۔جیسے کسی گھٹن زدہ ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا میسر آ جائے کچھ ایسی ہی اُس کی کیفیت تھی۔وہ اُٹھا اور گھر آیا۔بیوی نے اُس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر پُوچھا؟

"کچھ بتاؤ تو سہی، میں صبح سے دیکھ رہی ہوں پریشان نظر آ رہے ہو۔"

بغیر کچھ کہے وہ چٹائی پر بیٹھا پھر بولا۔ "تم کھانا لاؤ۔"

اُس نے اُبلے چاولوں کی قاب رکھی۔مٹی کی چھوٹی سی ہنڈیا میں پول سمبل (کوکونٹ کی بجھیا) تھی۔دوسری ہنڈیا میں ناریل کے دودھ میں پکائی گئی مچھلی اور سبزی کی کڑھی تھی۔دونوں ڈشیں اُس نے ہادی کے سامنے سجا دیں۔پانی کا جگ اور گلاس رکھا اور خود بھی پاس بیٹھ گئی۔

ہادی چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔جب کھا چکا اور شکر الحمدللہ کے الفاظ ادا کئے تو بیوی نے ایک بار پھر کہا۔

"کوئی کام کاج کی پریشانی ہے کیا؟ تمہاری کیا بُری عادت ہے کہ تم کچھ کہتے نہیں۔"

ہادی نے خاموش نظروں سے اُسے دیکھا اور چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔
''تمہیں اگر کسی بات کی سمجھ نہیں تو بحث مت کیا کرو۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔''
بیوی نے برتن سمیٹے اور خاموشی سے اُٹھ گئی۔

ہادی کا چھوٹا بھائی پندرہ سال سے امریکا کی ریاست نیویارک میں مقیم تھا۔ سات آٹھ سالوں سے اُس کے مالی حالات بُہت اچھے ہو گئے تھے۔ پہلے چند سال تو دھکے ہی کھاتا رہا تھا۔ پر اب چند پیٹرول پمپوں اور ایک بڑے سٹور کا مالک ہو گیا تھا۔ ہادی کی اُمید کی کرن اُس کا یہ چھوٹا بھائی ہی تھا جس کے پاس وہ بیٹے کو فی الفور بھیج دینا چاہتا تھا۔

لیٹنے کے بجائے اُس نے اُسی وقت بھائی کو تفصیلی خط لکھ کر اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ اپنا سارا درد کاغذ کے صفحوں پر اُتار دینے سے وہ ہلکا ہو گیا تھا۔

خط بند کرنے کے بعد اُس نے لباس تبدیل کیا۔ بیوی سے کہا کہ وہ پوزین جا رہا ہے۔ کل واپسی ہو گی۔

بیوی صبح سے ہی اُس کی متغیر صورت پر پریشان سی ضرور تھی پر وہ کچھ بھید کھول نہیں رہا تھا۔ دوسرے شہروں میں جانا تو یوں بھی اُس کا معمول تھا۔ جافنا کی نسبت پوزین بڑا شہر تھا۔ ڈاک کا انتظام یہاں زیادہ بہتر تھا۔ یوں تو اُس کا دل اِس خط کو کولمبو جا کر پوسٹ کرنے کا چاہ رہا تھا تاکہ جتنی جلدی ہو سکے اُسے پتہ چلے کہ اُس کا بھائی اُسے اِس مشکل سے نکالنے کے لئے فی الفور کون سا قدم اُٹھانے کو ترجیح دے گا۔

بس میں کیا بیٹھا جیسے خیالوں کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ وہ وقت جب اُس کا بھائی ماہ روف بیس سال کی عمر میں امریکا گیا، اُس وقت اُن کے مالی حالات بہت ابتر تھے۔ ترکی سے جرمنی وہاں سے انگلینڈ وہاں سے امریکہ ڈیڑھ سال کے عرصے نے اُس کے پیروں میں جیسے پہیے لگا دیئے تھے۔ جگہ جگہ کا پانی پیتے اور محنت مزدوریاں کرتے کرتے وہ ایک ایسے ملک میں داخل ہوا جس نے شروع میں اُسے رگیدا اور پھر آسائشوں کے دروازے اُس پر کھول دیئے۔ ماہ روف بُہت سعادت مند لڑکا ثابت ہوا۔ جب وہ دھکے کھاتا تھا تب بھی وہ بھائی کو کچھ نہ کچھ بھیجتا رہتا۔ اُس کی اِس مدد نے لاریف ہادی کو بُہت سہارا دیا۔ اُس کا کاروبار دھیرے دھیرے بہتر ہوتا چلا گیا۔

ماروف نے شادی بھی سری لنکن لڑکی سے کی جو کولمبو میں کھاتی پیتی مسلم کمیونٹی سے تھی۔ خُدا نے بچے بھی دیئے، ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ چند سال قبل وہ مع بیوی بچوں کے آیا

تھا۔امریکہ میں رہتے ہوئے بھی وہ سب اپنے مذہبی طور طریقوں کی پابندی کرنے میں پیش پیش تھے۔دس سالہ زہرت نماز کی پابند تھی۔لڑکے بھی اسی انداز میں تربیت یافتہ تھے اور یہ چیزیں ہادی کے لئے بہت طمانیت بخش تھیں۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ پوزین پہنچا۔خط پوسٹ کیا۔ماہ روف کی طرف سے جب تک اُس کے خط کا جواب نہ آ گیا اُس وقت تک ہادی نے کسی سے اس بابت کوئی بات نہ کی۔جونہی خط اُسے ملا جس میں ماہ روف نے لاطف کو فی الفور بھجوانے کا لکھا تھا۔ساری ہدایات درج تھیں۔کولمبو جاؤ،فلاں فلاں سے ملو۔فلاں کو میرا حوالہ دو۔کون کون سے کاغذات درکار ہیں۔کہاں کہاں سے ملیں گے؟وغیرہ وغیرہ۔

اُس دن ہادی نے پہلی بار بیوی کے سامنے زبان کھولی پر صرف اس حد تک کہ وہ لاطف کو امریکہ بھیج رہا ہے۔

"پر کیوں؟" بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ جیسے پھٹ پڑی۔امریکہ تو وہ جائے جس کے پاس یہاں کام نہ ہو۔تمہارا تو اپنے کاروبار کو بیٹے کی شرکت اور ساتھ کا ضرورت ہے۔تم کیوں اپنے ہاتھ کاٹ کر ٹُنڈا ہونا چاہتے ہو۔لاکھ تمہارے ملازم وفادار اور ایمان دار ہیں پر اپنے خون کی بات ہی اور ہے۔جو نگرانی وہ کر سکتا ہے کوئی دوسرا کیسے اس معیار پر اُترے گا۔

ہادی اُسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔وہ سب معاملات راز دارانہ انداز میں آگے بڑھانا چاہتا تھا۔یہ تنظیم اتنی خطرناک تھی کہ کسی بھی ساتھی کے اِدھر اُدھر ہونے کی صورت میں انتہا پر جا سکتی تھی۔تنظیم میں اُس کی حیثیت کیا تھی یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

بیوی لاکھ سر پٹختی رہی،اُس نے منہ پر قفل لگائے رکھا۔لاطف سے جب بات ہوئی۔پہلے تو اُس نے مخالفت کی۔جوان خون میں جو سرکشی اور جوشیلا پن تھا اُس کی تسکین تنظیم میں شمولیت سے بہت عمدہ طریق سے ہونے لگی تھی۔ہادی نے سمجھداری سے صورت حال کو سنبھالا۔امریکہ کے بارے میں ممکنہ حد تک سبز باغ اُسے دکھائے پھر اُسے ساتھ لے کر کولمبو جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہو گیا۔نوے کی دہائی میں سری لنکا کے مقامی باشندوں کا امریکہ جانے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

کولمبو کی مسلم کمیونٹی نے بھی ہادی کی پوری مدد کی اور یوں پندرہ دن کی بھاگ دوڑ کے بعد جس شام اُس نے بیٹے کو جہاز میں سوار کرایا اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ

رہے تھے۔

جہاز میں بیٹھے لاطف کے احساسات عجیب سے تھے۔ بیک وقت وہ دو متضاد کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس کی زندگی کے گزشتہ دو سال جس سنسنی خیزی، ہنگامہ پروری اور تھرل سے دوچار ہوئے تھے اُس نے اُسے زندگی گزارنے کا ایک نیا مفہوم دیا تھا۔

پہلی بار اُس کا کلاس فیلو اور گہرا دوست اجیت جو نسلاً تامل تھا اُسے کینڈی روڈ پر ایک بڑی عمارت کے تہ خانے میں ہونے والے اجلاس میں لے کر گیا۔ جتنی بھی تقریریں ہوئیں وہ سب ظلم واستبداد کے خلاف تھیں۔ سرمایہ داروں اور وزیروں امیروں کے خلاف تھیں جو غریب کو زندگی گزارنے نہیں دیتے اور اُسے کیڑے مکوڑے کی طرح پیس کر رکھ دیتے ہیں۔ بظاہر تو کچھ ایسا نہیں تھا۔ اُسے وہاں جانا اچھا لگا پھر وہ اکثر اُن کی میٹنگوں میں شریک ہونے لگا۔ ان کے کاز اور سرگرمیوں کو سراہنے لگا مگر کسی کے سامنے نہیں اپنے دل میں، اپنے اندر۔

تنظیم کے بارے میں سنہالی بدھ اور مسلمان اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ آغاز میں تنظیم تاملوں کے حقوق کی بات کرتی تھی۔ مقبولیت کے ساتھ ساتھ تشدد کے راستے اپنانے لگی۔ تامل ریاست کا مطالبہ ہونے لگا۔ ''را'' سے تعلق جوڑ لیا۔ اور مدراس کے تامل ناڈوں سے مل کر ایک دہشت پسند تنظیم بن بیٹھی۔

پہلی بار جب وہ اُن کے ہیڈ کوارٹر ''مولائی ٹیوو'' Mullaitvu اُجیت کے ساتھ گیا۔ گھر میں تو اُس نے دوستوں کے ساتھ مولائی ٹیوو جانے کا کہا تھا۔ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ہادی تو یوں بھی اِن دنوں انورادھاپور گیا ہوا تھا۔

سری لنکا کے شمال اور شمال مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ جافنا سے لے کر Killinochchi, Nallur اور ٹرانکومالی Trincomalee تک گھنے جنگلوں میں اُن کی زیرِ زمین پناہ گاہیں، اسلحہ خانے اور تربیت گاہیں تھیں۔ اُجیت نے اُسے بتایا تھا۔ کہ یہاں ایئر پورٹ بھی ہیں۔ حد درجہ پُراسرار کسی جاسوسی کہانی کی طرح پھیلا ہوا اسکا لمبا چوڑا نیٹ ورک۔ اُجیت کے ساتھ وہ عام جگہوں پر ہی گیا۔ تاہم فضا میں ایک دہشت کا احساس پایا جاتا تھا۔

کلنو چی چی میں نوجوانوں کو خود کش حملوں کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ مولائی ٹیوو میں سیر کرتے ہوئے اجیت اُسے ایک خاص کمرے میں لے گیا۔ یہاں عورتیں بھی تھیں۔

یہیں لاطف نے اُس خوبصورت اور پُر کشش لڑکی کی تصویریں دیکھیں جس نے ابھی چند دن پہلے مدراس میں وزیراعلیٰ کی آمد پر بم دھما کا کیا تھا۔ لاطف کی میل ملاقات صرف سطحی لوگوں سے ہی ہوئی تھی۔ پارٹی کے خاص لوگوں کے بارے میں اُجیت بھی نہیں جانتا تھا۔

لاطف کچھ خوف زدہ بھی تھا مگر اندر سے وہ ایسی زندگی کو سراہ بھی رہا تھا۔ ہر جنگ جُو کے گلے میں سائنائیڈ کا کیپسول بندھا ہوتا ہے۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں یہ کیپسول اس کی حفاظت کا آخری سہارا ہے۔ جسے فی الفور کھا کر وہ مر سکتا تھا۔ گرفتار ہونے کے بجائے موت ان جوانوں کی ترجیح ہوتی۔ یہ سب اجیت نے اُسے بتایا تھا۔

اس پُراسرار اور خوفناک دُنیا سے واپسی پر لاطف چند دن گُم صُم رہا پھر وہ ان کے اجلاسوں میں جانے لگا۔ پر ابھی باقاعدہ رکن بننے میں اُس کی آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہونے ہی والا تھا جب قسمت نے اُسے جہاز میں بٹھا دیا اور اب وہ ایک ایسی دُنیا کی طرف رواں دواں تھا جس کے قصے اور داستانیں وہ ہر دوسرے روز سنتا تھا۔

جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ائر پورٹ پر لینڈنگ کے لئے پر تول رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے سے چپکی اُس کی آنکھیں نیچے رنگ اور روشنیوں کا ایک سیلاب دیکھ رہی تھیں۔ بُہت سے مرحلوں سے گزر کر وہ باہر آیا جہاں اُس کے چچا اور چچی اُسے لینے اور اُس کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ چچا نے اُسے اپنے سینے سے لگایا اور اپنی ننہالی زبان میں اُس کے سفر کے خیریت سے گزرنے کے بارے میں پوچھا۔ ہراساں سے لاطف نے مادری زبان کے ساتھ ہی اپنی بشاشت لوٹتی محسوس کی۔ چچی نے پیار کیا اور اُس کے والدین اور بہن بھائیوں کا پوچھا۔

چند لمحوں بعد گاڑی گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ رات دن کی طرح جوان اور روشن تھی۔ اُس کے چچا کا گھر ''برانکس'' میں تھا۔ یہ ایک پندرہ منزلہ بلڈنگ کا چوتھا فلور تھا۔ بڑا خوبصورت اور سجا ہوا۔ چچا کے بچے سو رہے تھے۔ چچی نے کھانے پینے کا پوچھا پر اُس نے بتایا کہ جہاز میں اتنی ٹھونسا ٹھونسی ہوتی رہی کہ اب قطعاً گنجائش نہیں اور جب وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں گیا تو تھوڑی دیر تک وہ قدرت کے اِس عجیب و غریب فیصلے پر حیران ہوتا رہا پھر نیند کی وادیوں میں اُتر گیا۔

چچا کے بچوں سے ناشتے پر ملاقات ہوئی۔ اتوار تھا سبھی گھر میں تھے۔ لڑکے تو خوب ہنسوڑ اور گھلنے ملنے والے بچے تھے۔ اُسے دیکھ اور مل کر خوش بھی بُہت ہوئے، پر

زہرت چچا کی اکلوتی تیرہ سالہ بیٹی پینٹ قمیض پر اسکارف پہنے ہوئے تھی ۔خوش طبع ضرور تھی پر تھوڑا سا لئے دیئے والی بھی محسوس ہوئی۔

اگلے چند دن اُس نے نیو یارک سٹی کی سیر کی ۔کبھی چچا کے بیٹوں کے ساتھ اور کبھی اکیلے۔نیو یارک کے سب علاقوں میں اسے مین ہٹن سب سے زیادہ اچھا لگا۔یہاں آسمان کو چھوتی ہوئی عمارات، سینما، تھیٹر، بینک، دفتر اور کمرشل پلازوں کی بھرمار نظر آئی۔پندرہ بیس دن اُس نے یہی کام کیا۔چچا نے بھی اُسے کُھلی چھٹی دی کہ وہ ماحول کے ساتھ رَچ بس جائے اور ہوم سکنس کا شکار نہ ہو۔پھر وہ اپنے چچا کے پیٹرول پمپ اور گیس اسٹیشن پر کام کرنے لگا۔کسٹمرز کو ڈیل کرنے میں اُس کی سمجھ داری، محنت اور ذمے داری نے چچا کو متاثر کیا۔شام کی کلاسز میں اُس نے پڑھائی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔رات گئے وہ گھر جاتا۔اپنا کھانا گرم کرتا، کھاتا اور سو جاتا۔

ایک دن شام کی کلاس نہیں ہوئی۔وہ جلد گھر آ گیا۔لیونگ روم میں بڑے صوفے پر زہرت نیم دراز کچھ پڑھنے میں محو تھی۔یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے زہرت کو نظر بھر کر کسی قدر تنقیدی انداز میں دیکھا۔عام سری لنکن لڑکیوں کے برعکس اُس کے نقوش بہت دلکش تھے۔چنبیلی جیسا رنگ بڑی ملاحت لئے ہوئے تھا۔اُس کے بال سیاہ اور لمبے تھے جو اُس وقت اُس کے سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔وہ پڑھنے میں اتنی محو تھی کہ اُسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی اُسے یوں دیکھ رہا ہے۔زیادہ دیر تک کھڑے رہنا اُسے خود بھی اچھا نہیں لگا۔اُس نے ہلکی سی چاپ پیدا کی جس پر زہریت نے چونک کر نگاہیں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''آج تو آپ جلدی آ گئے ہیں۔'' زہرت نے رسالہ قریبی تپائی پر رکھتے ہوئے اپنی اُلٹی پلٹی نشست سیدھی کی۔

''دراصل آج کلاسز نہیں ہوئیں۔پر سب لوگ کہاں ہیں؟'' اُس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ممی اور ڈیڈی ہنی سنی کے ساتھ مسز راجہ کے گھر گئے ہیں۔وہ شاید اپنا گھر سیل کرنا چاہتی ہیں۔آپ کھانا تو کھائیں گے نا پر لاطف بھائی میں ذرا مغرب کی نماز پڑھ لوں۔''

زہرت کی خوبصورت آنکھیں کلاک کو دیکھ رہی تھیں اور زبان اس سے مخاطب تھی۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔قریبی ریک پر پڑے رسالوں میں سے ہاتھ بڑھا کراُس نے ایک رسالہ اُٹھالیا اوراُس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اُسے تو یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس مادر پدر آزاد معاشرے میں اُس کا چچا کیوں اتنا رجعت پسند ہے۔چچا چچی اور یہ زہرت اِس ماحول میں کتنے اجنبی سے لگتے ہیں۔

وہ اپنے ماحول سے خاصا مختلف بچہ تھا۔بچپن ہی سے کسی حد تک من مانی کرنے والا، کچھ باغی سا۔ہادی جب بھی اس پر نماز کے لئے سختی کرتا وہ چٹائی پر کھڑا ہو جاتا۔اُٹھک بیٹھک بھی کرتا، پر اگر موڈ نہ ہوتا تو کچھ نہ پڑھتا۔کبھی کبھار باپ کے پُوچھنے پر غلط بیانی بھی کر جاتا۔ماں کے سامنے تو وہ بول بھی پڑتا۔

''آخر آپ لٹھ لے کر ایک ہی بات کے پیچھے کیوں پڑ جاتے ہیں؟ پڑھ لوں گا نماز اور رکھ لوں گا روزے۔ایک ہی کام رہ گیا ہے آپ لوگوں کا۔'' ماں جواباً بولتی اور کوسنے بھی دیتی۔

اس کھلے ڈُلے ماحول کو اُس نے بے حد پسند کیا تھا۔

زہرت نے کھانا میز پر لگا کر اُسے آواز دے ڈالی اور جب وہ کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھا تو میز پر سجے ڈونگے میں سالن دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ سرشار سے لہجے میں بولا۔

''ارے یہ ڈوسا کس نے پکایا ہے؟''

''مما اور میں نے۔'' زہرت نے مختصراً کہا۔

اُس کی ماں اپنے علاقے کی یہ خاص ڈش بُہت چاہت سے بنایا کرتی تھی۔ جب بھی یہ پکتا وہ تڑپ تڑپ کر کھاتا۔

''زہرت یہ بُہت عمدگی سے پکایا ہے۔میری ماں سے بھی اچھا۔'' وہ کھاتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔

وہ کام کرتا رہا، پڑھتا رہا پھر اس نے کمپیوٹر انجینئر نگ کے لئے صبح کی کلاسز جوائن کر لیں اور شام کو کام کرنے لگا۔اپنے مستقبل، اپنی تعلیم اور اپنے کیریئر کے لئے بُہت کریزی تھا اور سیر سپاٹوں اور لڑکوں کے ساتھ دوستیاں کرنے میں بھی ماہر تھا۔پر اس کے ساتھ وہ بُہت ذہین اور سُوجھ بُوجھ والا لڑکا تھا۔نہ کبھی چچا کو شکایت کا موقع دیا اور نہ کبھی کوئی ایسی صورت پیدا کی جو اُس کے لئے پریشانی اور مصیبت کا باعث بنتی۔ایشیائی لوگوں کے

ساتھ نت نئے دن جو کچھ ہوتا وہ اُس کی آنکھیں کھولنے کو کافی تھا۔

چھ سال وہ اپنے چچا کے ساتھ رہا۔ اپنی ذہانت، ذمے دارانہ رویے، کام اور پڑھائی کے ساتھ لگن جیسی اچھی خوبیوں کے باعث وہ اپنے چچا اور چچی کو متاثر کرنے اور اُن کی خصوصی محبت حاصل کرنے میں بہت کامیاب رہا اور جب اُس نے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر لی اور اچھی کمپنیوں میں اپلائی کر دیا اور شکاگو کی ایک بڑی کمپنی میں انٹرویو بھی دے آیا تو اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ اُسے ایشیائی ہونے کے باوجود اِس بہترین پوسٹ کے لئے سلیکٹ کر لیں گے، پر کمپنی کا جو بورڈ انٹرویو کے لئے بیٹھا تھا انہوں نے اُس کے سانولے وجود میں ایک زرخیز اور تخلیقی ذہن کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ جب خوشی سے بھرپور لہجے میں اُس نے یہ خبر اپنے چچا کو سنائی تو جہاں اُسے اُس کی ذات پر فخر محسوس ہوا وہیں تھوڑا سا اُس کے چلے جانے کی صورت میں رنج بھی ہوا۔

زہرت کے لئے وہ ایسے ہی ہیرا سے لڑکے کا خواہش مند تھا۔ شروع میں اُس کا خیال تھا کہ وہ شاید زہرت میں دلچسپی لے پر وہ تو ہمیشہ کام سے کام رکھتا۔

اپنے بھائی سے وہ یہ بات کر بیٹھا تھا۔ بھائی نے لاطف کو لمبا چوڑا خط بھی لکھا تھا کہ بھلا اُس کے لئے زہرت سے اچھی کون سی لڑکی ہو سکتی ہے؟ خط پڑھ کر اُس نے چند لمحوں کے لئے سوچا اور پھر اُسے ڈسٹ بن میں ڈال کر اپنے آپ سے کہا۔

''کمال ہے ذرا دیکھو تو اِن کی سوچوں کو۔ ٹھیک ہے زہرت اچھی لڑکی ہے مگر اتنی مذہبی لڑکی سے میرا گزارہ بہت مشکل ہے۔''

اُس نے باپ کو خط لکھ دیا کہ وہ فی الحال شادی جیسے کسی موضوع پر کوئی بات یا سوچ بچار کے لئے تیار نہیں۔ اُسے ابھی آگے بڑھنا ہے۔ وہ اپنی ذاتی کمپنی بنانے میں کوشاں ہے اور اپنی محنت کے بل بوتے پر اُسے یقین ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوگا۔

ہادی دل سے چاہتا تھا کہ بیٹا کسی طرح اِس رشتے پر راضی ہو جائے۔ وہ بھائی کا احسان مند تھا، پر لاطف کی دوٹوک تحریر اور فون پر دوٹوک گفتگو نے اُس پر واضح کر دیا کہ وہ اُس پر راضی نہیں۔ یوں اپنے طور پر وہ کبھی کبھی اُسے ضرور لکھ دیتا۔

زہرت جب سری لنکا گئی تو تایا تائی سے بھی ملی۔ ہادی اُس کے انداز و اطوار دیکھ کر دنگ ہی تو رہ گیا۔ پہلے ایک دو بار جب آئی تو بچی تھی لیکن اب جوان ہو چکی تھی۔ کس قدر شائستہ اور مہذب، ادب آداب والی شائستہ سی لڑکی۔ ہادی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ جب وہ گھر

آیا تو اُس نے بیٹے کو لمبا چوڑا خط بھی لکھ دیا کہ ایسی لڑکیاں نصیب والوں کو ملتی ہیں ۔زہرت کا ساتھ اُس کی زندگی کو جنت بنا سکتا ہے ۔

لاطف یہ خط پڑھ کر بہت ہنسا ۔سگریٹ سُلگا کر اُس نے کش لیا اور اپنے والد کو تصور میں لا کر بولا ۔

''میرے پیارے ڈیڈی آپ کس جنّت جہنّم کے چکر میں پڑ گئے ہیں؟جنّت لے کر کیا کرنی ہے،میرے جیسے آدمی کے لئے دوزخ ہی ٹھیک ہے ۔''

چند دنوں بعد ایک دن اُس کے چچا کا فون آیا ۔

''بھئی لاطف تم نیویارک کا چکر لگا لو ۔زہرت سری لنکا سے آئی ہے،تمہارے امی ابو نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں تمہارے لئے ۔ہمیں مل بھی جاؤ اور اُنہیں لے بھی جاؤ۔''

وہ جس دن نیویارک آیا،آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں ۔زہرت گھر پر نہیں تھی ۔چچا بھی نہیں تھے ۔چچی نے محبت سے استقبال کیا اور اُس کے بہت کم آنے کا گلہ کیا۔

''اب شکاگو کو تو یوں لگتا ہے جیسے تم نے لاس اینجلز بنا لیا ہے ۔کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں آئے نہیں ۔''

''ارے چچی مصروفیت، کام ۔۔۔کام ۔۔۔ میں اب اپنا کام بھی تو سیٹ کر رہا ہوں ۔ہاں یہ زہرت کدھر ہے؟''

''یونیورسٹی میں کوئی سیمینار تھا۔بس آتی ہی ہو گی ۔''

کوئی گھنٹے بعد اُس نے زہرت کو اندر آتے دیکھا ۔پر ٹی وی لاؤنج میں جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں آنے کے بجائے وہ اُوپر چلی گئی ۔باہر پھوار پڑ رہی تھی ۔عین ممکن ہے بھیگ گئی ہو اور چینج چاہتی ہو ۔اُس نے سوچا ۔

اور واقعی یہی بات تھی ۔تھوڑی دیر بعد وہ سُرخ اور سیاہ پھولوں والی میکسی پہنے اندر آئی ۔میکسی پر ہلکے شوخ پھولوں کی طرح اُس کا چہرہ بھی کھلا ہوا تھا۔کس قدر بشاشت تھی اُس کے لہجے میں جب اُس نے ماں کو چائے کی ٹرالی گھسیٹتے دیکھا ۔

''ارے واہ کتنی طلب تھی اِس وقت چائے کی ۔''

لاطف اُس کی لانبی چوٹی کو کمر پر جھولتے دیکھ رہا تھا ۔سیاہ اسکارف کی ناٹ اُس کے گلے میں تھی ۔اب وہ لاطف کی طرف متوجہ ہوئی ۔

''تو آپ اپنی چیزیں لینے آئے ہیں۔ویسے تو آنے کی قسم کھالی ہے۔''

لاطف ہنسااور بولا۔

''یہ تمہیں سری لنکا جانے کی کیاہڑک اُٹھی۔'' اُسے اپنے باپ کےاصرار بھرے خطوط یاد آئے تھے۔

''کمال ہے، ہڑک کیوں نہ اُٹھے وطن ہے ہمارا۔سارے رشتے تو وہیں سے جُڑے ہوئے ہیں۔دراصل جینی بھی چاہ رہی تھی۔تمہیں تو معلوم ہی ہے۔سیاحت اُس کی ہابی ہے۔''

جینی ان لوگوں کے ہمسائے میں رہتی تھی۔سیر سپاٹوں کی دلدادہ۔نئی دنیائیں دیکھنے کی شوقین۔لاطف اُسے تب سے جانتا تھاجب وہ یہاں رہتا تھا۔

میں نے تو بہتیرا زور مارا تھا کہ مت جاؤ۔سیاحوں کیلئے ابھی حالات سازگار نہیں۔پرتم تو جانتے ہی ہووہ کیسی نڈراور جیالی لڑکی ہے۔تنک کر بولی تھی۔

''لو مجھے ڈراتی ہو۔ایک سری لنکا کیا.دنیا بھر میں دہشت گردی کی لہر رقص کررہی ہےاب اِس ڈر سے کہیں جانا چھوڑ دیں۔''

''کیا حالات ہیں اب؟''

''کمزور ملکوں کے حالات کا کیا کہنا؟بڑے ہمسائے ملک نگل لینا چاہتے ہیں انہیں۔اب کوئی پوچھے انڈیا سے کہ ذراسی چنگاری تھی اُسے ہوا ہی نہ دو ہوا بھی دی اور تیل بھی چھڑکا۔بھڑکایا اوراب فوجیں اُسے بجھانے کواُتار دیں۔عالمی منظر نامے کے رنگارنگ تماشے۔

''ویسےایک بات!''

زہرت نے چائے کا کپ ماں کے ہاتھوں سے پکڑا،چھوٹا ساسِپ لیااور بات کوجاری رکھا۔

''سری لنکن اگر کہتے ہیں کہ A Land Like No Other تو یہ غلط نہیں۔چھوٹے تھےتو ایک دفعہ گئےتب اتنا شعور نہیں تھاپراب تو حُسنِ فطرت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔سچی بات ہےسری لنکا کاقدیم تہذیبی ورثہ دیکھ کر مجھےتو فخر محسوس ہوا۔جینی تو میوزیم میں زیورات کاسیل دیکھ کر گنگ رہ گئی تھی۔''

''پر کچھ انسانوں کا بھی بتاؤ کہ وہ کیسے لگے؟''

لاطف ہنسا، اُس کے لہجے میں شوخی تھی اور کسی قدر طنز بھی۔

''اُوپر والے کی تخلیق پر میں کون ہوتی ہوں رائے دینے والی۔ ویسے وہ اگر صورتاً اچھے نہیں لیکن سیرتاً تو کمال کے ہیں۔ ایسے محبت کرنے والے کہیں دیکھے ہیں تم نے۔''

''کہاں کہاں گئیں، کون کون سی جگہیں دیکھیں؟''

''کینڈی، سگریا، نویرا علیا، آدم پیک۔ انورا دھاپور، جافنا اور راستوں میں پڑنے والے سب چھوٹے بڑے شہر۔''

''مائی گاڈ تم آدم پیک گئیں!'' لاطف کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

تبھی زہرت لاطف کو کھانے کے لئے اُٹھنے کے لئے کہتے ہوئے بولی۔

''مما ڈیڈی کے ساتھ بُہت ملکوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ نماز کے لئے ڈیڈی کے ساتھ اُٹھنے کے بعد ہم دونوں تو پھر کبھی نہیں سوتے تھے، گھومنے پھرنے ہی نکلتے سچی بات ہے ایسی نشیلی صبحیں دیکھنے کو ملتیں کہ لطف آجاتا۔ لیکن سری لنکا کی صبحوں کا جواب نہیں۔

''خیر یہ بات بھی درست نہیں۔ اسکنڈے نیوین ممالک کی صبح شامیں اپنے اندر حُسن کے خزانے رکھتی ہیں۔ یہ چونکہ ہمارا وطن ہے اس لئے اِس کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی بھی ہے جو اس کی ہر چیز کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔''

''پر چند باتوں نے مجھے اس بار شدید متاثر کیا ہے۔ سچی بات ہے میں تو اس پر سنجیدگی سے کام کرنے کو پلان کر رہی ہوں۔

سری لنکن مسلمانوں کی روشن خیالی، وسعت نگاہی، ذہنی اُفق کی بلندی اور مذہبی روح کو سمجھنے کے لئے ان کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام ازحد ضروری ہے۔ سر رزاق فرید کی تنظیم کے بنائے ادارے اب کم ہیں۔ نئے اور جدید اداروں کی شدید ضرورت ہے۔ دور دراز گاؤں کی لڑکیوں کیلئے انکے قریبی شہروں میں اچھے اسکول کھولنے کی ضرورت ہے۔ تامل ہندو جو حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں انکی تعلیم و تربیت کا موزوں بندوبست کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک میں موجود تینوں فرقے ہندو، عیسائی اور بدھ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بُہت کریزی ہیں۔ اس میدان میں سری لنکن مسلمان پیچھے ہیں۔ میں تو انشاء اللہ اب اس پر کام کرنے والی ہوں۔''

''مسلمانوں کی انتہاپسندی لبرل ازم اور سیکولر سوچ سے نارمل ہو سکتی ہے۔ ترقی کے لئے سیکولر ہیومنسٹ ہونا بے حد ضروری ہے۔'' لاطف نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے

کہا۔

''سیکولر کیوں؟ مسلمان اپنے مذہب کی روح کو سمجھیں۔''

بحث شاید طول پکڑ جاتی جب زہرت کی ماں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا کہ بس بُہت باتیں ہو گئیں۔۔۔اب کھانا کھاؤ۔''

لاطف کھانے میں مصروف تھا جب زہرت نے یہ کہا۔

''مجھے تو اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے اور میرا مذہب میری پہچان ہے۔''

لاطف کے چہرے زاویے بگڑے تھے۔ کھانے کے عمل نے اس ناگواری کو چھپا لیا تھا۔ وگرنہ تو اُس کے تاثرات بُہت نمایاں ہوتے۔

تاہم پھر بھی وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''مسلمان تو دنیا بھر میں رسوائے زمانہ ہیں۔ شرم آتی ہے خود کو مسلمان کہنے پر۔ دہشت گردی میں بڑا نام پیدا کر رہے ہیں۔''

زہرت تلملائی۔ اور پھٹ سے بولی۔

''تمہاری محبوب تنظیم لبریشن ٹائیگرز اف تامل ایلام نے تو خیر سے سبھوں کو مات دے دی ہے ایسی جیالی نکلی پہلے القاعدہ کی ہمرازبنی۔ اُس سے یارانہ گانٹھا۔ کچھ سبق پڑھے کچھ چالیں سیکھیں۔ پھر ایسے تخلیقی جنگی معرکے مارے کہ اُسے بھی پیچھے چھوڑ گئی خود کش حملوں کی نئی تکنیک ایجاد کر ڈالی۔ دنیا بھر سے اپنی انفرادیت منوالی۔''

چوٹ تو گہری تھی۔ تاہم ہنستے ہوئے بولا۔

''تاریخ کی دُرستگی بہت ضروری ہے۔ خود کش حملے تاملوں کی ایجاد نہیں خیر سے زاروں کے ستائے ہوئے ماٹھے غریب روسیوں کے جذبات کا اظہار تھے۔''

شاید دونوں میں تلخی پھر بڑھ جاتی۔ زہرت کی ماں نے کہا۔

''تم لوگ کن باتوں میں اُلجھ گئے ہو۔ کھانے کو زہر کر رہے ہو۔''

ہلکی پھلکی سی ڈانٹ کے ساتھ کہتے ہوئے موضوع بدلوا دیا۔

لاطف کو شاید یہ اعتراف کرنے میں اپنی سُبکی محسوس ہوئی تھی کہ اُس کا اب تامل ٹائیگرز سے کیا واسطہ اور رابطہ۔ انٹرنیٹ سے کبھی کبھار کی حاصل کردہ معلومات اُس کے لئے کچھ اتنی دل خوش کن نہ تھیں۔ تنظیم کے بانی رکن ویلو پلائی پربھاکرن کے بارے میں جانکاری کا رُخ بھی کچھ اتنا اچھا نہ تھا۔ وہ مذہبی گھرانے کا پروردہ تامل ہندو لڑکا جس کا باپ

اُسے بڑا افسر دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ بڑا پڑھا کو تھا تو دوسری طرف تخلیقی وتخریبی ذہن کا مالک بھی تھا۔ اسکا نیٹ ورک۔ دنیا بھر میں اس کے رابطے۔ غیر قانونی منشیات، مختلف کمپنیوں میں غیر قانونی سرگرمیوں، غیر قانونی تارکین وطن کی منتقلی اور سمگلنگ جیسے قبیح دھندے تنظیم کی آمدنی کے ذرائع تھے۔ اُس نے پلٹ کر کبھی اپنے اُس ماضی میں جانے یا جھانکنے کی خواہش نہیں کی تھی جس کے لئے وہ اپنے باپ سے اُلجھا تھا۔

لاطف اگر محنتی تھا تو قسمت کا دھنی بھی تھا۔ شکاگو آنا اُس کے لئے بُہت بابرکت ثابت ہوا تھا۔ اپنی منزل کی طرف وہ سرعت سے بڑھ رہا تھا۔ پیسے عہدے مرتبے اور خوشحالی نے اُس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔

سانولا سلونا کمزور سا لڑکا جو نا ڑ جیسا نظر آتا تھا اب ایک دلکش نوجوان کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ بُہت سی لڑکیوں سے اُس کی دوستی تھی۔ شادی کی اُسے قطعی جلدی نہ تھی۔ یہ کام کہیں اُس کے مستقبل بعید کے کسی شیڈول میں تھا۔ زہرت کسی بھی طرح ردکئے جانے والی لڑکی نہیں تھی۔ حد درجہ دلکش اور پسندیدہ اطوار کی حامل ہونے کی بنا پر وہ ہر بار اُسے بیک ورڈ کہتے ہوئے اپنے دل میں رَدکرتا تھا۔ جب وہ واپس شکاگو آرہا تھا اُس نے زہرت کے بارے میں اپنے آپ سے کہا تھا۔

''اُف میرے خدا کس قدر رجعتی ہے یہ۔''

تھوڑا سا وقت اور آگے بڑھ گیا تھا۔ اُس نے اور کامیابیاں حاصل کیں۔ چچا سے بس کبھی کبھار فون پر ہی بات ہوتی۔ زہرت کے بارے میں چچا سے ہی سننے میں آیا کہ اُس نے ایک این جی او بنائی ہے۔ سری لنکا میں وہ تعلیم پر بُہت کام کررہی ہے۔

یہ سال 1990ء اور مہینہ اکتوبر تھا۔

وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں نیویارک آیا ہوا تھا۔ نیویارک بارشوں کے پانیوں سے دُھل دُھلا کر نکھرا ہوا تھا۔ گاڑی کوئینز بولیوارڈ پر بھاگتی ہوئی جانسن ہوٹل کی طرف جارہی تھی۔ مین ہٹن کا یہ علاقہ اُسے بُہت پسند تھا۔ سہ پہر سونے میں گزاری اور شام کو وہ سیر سپاٹے کے لئے نکل آیا۔

پہلے اس نے چچا کے گھر جانے کا سوچا۔ پھر اس خیال کو جھٹکتے ہوئے وہ خود سے بولا۔

''ہٹاؤ یار، وہاں جا کر بور ہونے سے بہتر ہے فورٹی سیکنڈ سٹریٹ چلوں اور شام

بھی اچھی گز اروں اور کچھ خریداری بھی کروں ۔جرابوں اور چند ٹائیوں کی ضرورت ہے۔"

گھومتے گھومتے وہ ٹائمز اسکوائر آ گیا ۔درمیان کی گول سی بلڈنگ پر زپیر چل رہی تھی ۔ساری دُنیا کی اہم تازہ خبریں ایک پٹی کی صورت چمک دار حروف میں سامنے آ رہی تھیں ۔اس کا تو قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا اِن خبروں کو دیکھنے کا ۔پر جانے کیسے نظر اُٹھ گئی اور جو اُٹھی تو اُٹھی رہ گئی ۔کسی سنگی بت کی طرح وہ جہاں کھڑا تھا کھڑا رہ گیا ۔ٹائمز اسکوائر، اس میں گھومتے پھرتے لوگ سب جیسے اوجھل ہو گئے ۔صرف ایک چیختی چنگھاڑتی خبر تھی جس نے اُس کی آنکھوں کو، اُس کے اعضا اور اُس کے وجود کو ساکت کر دیا تھا۔

سری لنکا کے شمالی علاقوں کے اہم شہروں اور قصبوں سے تامل ٹائیگرز اور اس کی ذیلی تنظیم بلیک ٹائیگرز کے مسلح فوجی دستوں نے سنگینوں اور بندوقوں کی نوک پر ان علاقوں کے مسلمانوں کے گھروں پر قبضہ کر کے اُنہیں باہر نکال پھینکا ہے ۔سری لنکا کے ان شہروں میں ابتر صورت کے پیش نظر امن و امان کی حالت سخت مخدوش ہے۔

سائیں سائیں کرتے کان، دھڑ دھڑ کرتا اُس کا دل اور زپیر پر رقصاں اُس کی نگاہیں سب جیسے اِس خبر کی صداقت سے انکاری تھے ۔بھلا یہ کیسے ممکن ہے ۔پر وہی خبر اب پھر سامنے تھی اور اُسے بتا رہی تھی کہ اُس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اس پر یقین کرے۔

پھر جیسے وہ پاگلوں کی طرح بھاگا۔ اُسے یہ بھی نہ خیال آیا کہ فون پر وہ اپنے چچا سے بات کرے۔ اُس نے ٹیکسی پکڑی اور برانکس کا کہہ کر نیم دراز ہو گیا۔ اُس کے دل و دماغ میں جیسے آندھیوں کے جھکڑ تھے ۔جافنا، مینار، کلونچی، وِیانیا اور مولاتاوی کے مسمانوں کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ امن پسند صلح جو قسم کے یہ لوگ جو کبھی کسی جھگڑے میں ملوث نہیں ہوئے، ہمیشہ اپنے کام سے کام اور اپنی کمیونٹی کی فلاح و بہبود میں خود کو مصروف رکھتے تھے۔

تاملوں اور سنہالیوں کے درمیان کبھی کبھار کے جھگڑوں میں ہمیشہ اس گروپ کا ساتھ دیتے جو انصاف پر ہوتا۔

اُس کے چچا کا گھر لاک تھا۔ یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ اُس نے گہرے دُکھ سے سوچا۔

پیٹرول پمپ فون کرنے پر اُن کے منیجر سے پتا چلا کہ چچا کی ساری فیملی آسٹریلیا گئی ہوئی ہے ۔واپسی پر اُن کا ارادہ سری لنکا ہو کر آنے کا بھی ہے۔

اُس نے جلدی جلدی فون کیا۔کوئی جواب نہیں تھا۔اُس کا باپ، اُس کے بھائی بہن اُس کی ماں کہاں ہوں گے؟ زندہ بھی ہیں یا نہیں پھر اُس نے کولمبو چچا کے سُسرال فون کیا۔ چچا کے سالے کی بیوی نے بتایا۔

''ابھی تو کچھ پتا نہیں۔سری لنکن فوج نے ایکشن تو لے لیا ہے پر ابھی حالات بہت مخدوش ہیں۔مسلمانوں پر بڑا کڑا وقت ہے۔اِن دہشت گردوں نے تو انہیں اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنا کوئی سامان بھی اُٹھا سکتے۔''

وہ شکاگو واپس آ گیا۔وہ سری لنکا جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا، ان چند دنوں میں جب وہ اپنے بزنس معاملات اور دیگر اُمور کو اپنی عدم موجودگی میں نمٹانے کے بندوبست میں مصروف تھا اُس نے کتنی بار سوچا، کتنی بار اس تلخ احساس نے اُس کو کچوکے لگائے کہ یہ وہی تامل ٹائیگرز لبریشن ہے جسے وہ حق پر سمجھتا تھا جس کے کاز سے اُسے ہمدردی تھی جسے وہ ممبر بن کر اپنی خدمات سونپنا چاہتا تھا۔وہ کیسا احمق تھا؟ کس قدر بے وقوف اور گھامڑ تھا۔

وہ بس نام کا مسلمان تھا۔پر اس حادثے نے اسے اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس کی مسلمانیت جیسے جوش کھا کر تڑپی تھی۔اُس کا باپ کتنی صحیح بات کہا کرتا تھا۔یہ ہنود و یہود کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔

ان دنوں وہ کس اذیت سے دوچار تھا اس کا اندازہ صرف اُسے ہی تھا۔اُس کی سیکولر کمیونسٹ سوچوں کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے۔بین الاقوامی میڈیا پر اُس کی صرف ایک خبر تھی۔کتنے گھر بے گھر ہوئے۔کتنے معصوم اور بے گناہ مارے گئے۔کچھ علم نہ تھا۔اِس کھلی جارحیت پر کہیں احتجاج نہیں تھا۔جانے سے ایک دن پہلے اُس نے کولمبو فون کیا۔اُس کے چچا چچی سب مع زہرت کے وہاں آ چکے تھے اور کولمبو میں اپنے گھر میں مقیم تھے۔اُس کے والدین اور بہن بھائی سب اُس کے چچا کے پاس تھے۔دو دن پہلے اُس کے چچا انہیں کینڈی کے کیمپ سے لائے تھے۔زہرت ان دنوں کیمپوں میں امدادی پارٹیوں کے ساتھ دن رات کام کر رہی تھی۔یہ بات اُسکے والد نے اُسے فون پر بتائی تھی۔

اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے بات کر کے اُسے قلبی سکون تو ضرور ملا تھا، پر جیسے وہ اندر سے جل رہا تھا۔اتنا بڑا ظلم! کیوں اور کس لئے؟

رات کے تین بجے وہ بندرانائیکے انٹرنیشنل ائر پورٹ پر اُترا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔دس سال بعد اُس نے اپنے وطن کی سرزمین پر پاؤں رکھا تھا۔یورپ کے

ائر پورٹوں کے مقابلے میں یہ کس قدر چھوٹا اور چمکتی دمکتی شان وشوکت سے عاری تھا۔

میجسٹک سٹی میں چچا کا خریدا ہوا خوب صورت گھر جو ابھی خاموشی کے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کے اندر پاؤں دھرنے کے ساتھ ہی جاگ اُٹھا تھا۔ دُکھ، کرب اور اذیت کے وہ مشترکہ محسوسات جن سے وہ سب اپنی اپنی جگہ دوچار ہوئے تھے۔ مل بیٹھنے اور باتیں کرنے سے قدرے سکون پذیر ہوئے۔

''آخرایسا کیوں ہوا؟'' اُس نے اپنے باپ سے سوال کیا۔

''مسلمان طبقے کا بااثر ہونا اُنہیں کھلتا تھا۔ انہیں وسطی حصوں میں دھکیل کر وہ پورے لنکا میں ایک اشتعال انگیز صورت حال پیدا کر کے مسلمانوں کو بقیہ فرقوں سے لڑانا چاہتے تھے تاکہ اُنہیں بالکل بے اثر کیا جاسکے۔''

ہلکے سے ناشتے کے بعد وہ سوگیا تھا۔ رات کے کھانے پر ماں نے اُسے اُٹھایا۔ وہ جب گہری نینداور اِس کی مدہوشی سے قدرے باہر ہوا اُسے زہرت کی آواز سنائی دی تھی۔

اور ایسا پہلی بار ہوا کہ اُس آواز کے سُنتے ہی اُسے اپنی دھڑکنوں میں ارتعاش سا محسوس ہوا۔ چند لمحے وہ ساکت لیٹا اُسے سنتا رہا۔ وہ کسی کیمپ کا حال سُنا رہی تھی۔

وہ اُٹھا، واش روم میں جا کر اُس نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر باہر آیا۔ کاہی رنگی ساڑھی میں وہ صوفے پر بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

سفر کی تھکاوٹ کا ہلکا سا عکس اُس کے چہرے پر تھا پر لہجے میں تیزی اور گفتگو میں زور تھا۔ اُسے دیکھ کر مسکرائی۔ یقیناً یہ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسی وہ ہمیشہ اُسے دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر بکھیرا کرتی تھی۔

مگر لاطف کی نظریں آج وہ نہیں تھیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ زہرت نے نقشے کے ذریعے ان تمام مقامات کی نشان دہی کی جہاں جہاں مسلمانوں کے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ اسے تقریباً ہر کیمپ کی حالت کا علم تھا کہ کہاں کس کس چیز کی ضرورت ہے؟ اس بھاگ دوڑ میں کولمبو کی پوری مسلم کمیونٹی سرگرم عمل تھی۔

گھر کے بقیہ لوگ تو سونے کے لئے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ لاطف کی ماں نے اُسے زہرت کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور اُٹھ گئی۔

دفعتاً باتیں کرتے کرتے لاطف نے کہا۔

''زہرت میں بھی اس مشن میں تمہارے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں۔''

حیرت زدہ سی زہرت نے اُسے دیکھا۔

''ہوش میں تو ہونا۔''

وہ مُسکرایا۔زہرت کا حیرت زدہ ہونا اُسے سمجھ میں آتا تھا۔وہ اُس کے خیالات سے بخوبی آگاہ تھی۔

''بالکل ہوش میں ہوں اور بقائمی ہوش وحواس تمہارے مشن میں ایک ادنیٰ کارکن کےطور پر کام کرنے کا خواہش مند ہوں۔''

''پر لاطف میں تو اپنے مشن کو دُنیا بھر میں ہر اُس جگہ لے جانا چاہتی ہوں جہاں مسلمان مظلوم ہیں۔سری لنکا میرے والدین کا وطن ہے۔اُس کے ہم پر حقوق ہیں۔پر مجھے وطنیت کی سطح سے اُوپر اُٹھ کر کام کرنا ہے۔رنگ اور نسل کی سطح سے بالاتر ہو کر۔''

''میں اور میرے سب وسائل تمہارے ساتھ وہاں تک چلیں گے جہاں تک تم ہمیں لے جانا چاہو گی، زہرت!'' لاطف کا لہجہ گلوگیر سا تھا۔''زہرت'' کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بڑی بوجھل آواز میں بولا۔

''میں نے تو اپنے دل کے دروازے تم پر بند رکھے۔حالانکہ تم میں اندر جانے اور وہاں رہنے کی ساری خوبیاں موجود تھیں، پر میں تو خود کو ہی بھلائے بیٹھا تھا۔''

اُس نے زہرت کا ہاتھ اپنے بھاری ہاتھوں میں تھاما اور بولا۔

''میں معافی چاہتا ہوں زہرت۔''

زہرت کی آنکھوں میں شبنم اُتر آئی تھی۔

اپنے باپ کی طرح لاطف اُس کی بھی پسند تھا، پر اُس نے کبھی اس پسندیدگی کا ہلکا سا اظہار کرنا بھی پسند نہ کیا۔اُس کا ہاتھ لاطف کے ہاتھوں میں تھا۔

''ہم تو اپنے دشمن آپ بن بیٹھے ہیں۔وہ آفاقی پیغام جو ہماری اساس ہے، اُس کی روح کو سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے سے انکاری ہیں۔رنگوں،نسلوں،فرقوں،گروہوں میں بٹے ہوئے ،اپنے مرکز سے بھٹکے ہوئے،معجزوں کی توقعات میں زندہ،عمل سے عاری لاشے ہیں۔''

''لاطف تم نے مجھے اپنا آپ دیا ہے، میں بُہت خوش ہوں۔آؤ چھوٹا سا دیا جلائیں اور اُسے اِن دیوں میں شامل کریں جو کہیں کہیں جل رہے ہیں۔شاید یہ ایک قافلہ بن جائے۔

باب نمبر:٦ نویرا علیہ

۱۔ نویرا علیہ فطرت کا گھر تو ہے مگر انگریزوں کے ہاتھوں نے اِسے لیک ڈسٹرکٹ جیسی صورت دے دی ہے۔
۲۔ چائے کوالٹی نمبر 2 اور 3 ایشیائی ملکوں کیلئے۔اِن ایشیائی ملکوں کی بھی آگے مزید حد بندیاں ہیں۔
۳۔ ہل کلب میں نکٹائی پہنے بغیر کوئی شخص کھانے کیلئے اندر داخل نہیں ہوسکتا ہے۔

امن کو دُنیا میں پھیلنے پھولنے دو
جب تم اسے دنیا میں پھیلانے کی کوشش کرتے ہو
تب نفرتیں تو کہیں منہ چھپالیتی ہیں

اور محبت راج کرنے لگتی ہے
جب تم امن کو زندہ رکھنا چاہتے ہو
تب تم سفید فاختاؤں کو پرواز کی اجازت دیتے ہو
جب تم امن کا دروازہ کھولتے ہو
تب امن زندگیوں کو خوش آمدید کہتا ہے
جب تم امن کو پا لیتے ہو
تب یہ تمہارے ساتھ رہنا شروع کر دیتا ہے

سنہالی زبان میں امن کا یہ نغمہ ہمیں کیا سمجھ آنا تھا۔ سری لنکا کے اِس مشہور اور مقبول شاعر روی Ravi Sathasivam کے بہت سے رومانی گیت ہم نے راستے میں سُنے اور اپنے گائیڈ سے سمجھے تھے۔ اسے بھی اُسی کی زبان سے سمجھا تھا۔ اِس پیغام دیتے نغمے نے ہمیں افسردہ کر دیا تھا۔ میرے ملک کی طرح دہشت گردی کا مارا ہوا ملک جو امن کیلئے ترس رہا ہے۔

ہم کینڈی سے نویرا علیہ جا رہے تھے۔ موسم کا مزاج گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ جیسا تھا۔ ابھی دھوپ ہے۔ ذرا آگے گئے تو ننھی منی پھوار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسٹر جسٹن کا کہنا تھا کہ نویرا علیہ دنیا کی چند خوبصورت ترین جگہوں میں سے ایک ہے۔

گمپولا Gampola کینڈی سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ یہاں مسجد کے پاس گاڑی رکی اور ہمارے گائیڈ نے کہا۔

''اندر جائیے، دعا کیجیے۔ یہاں عراق کے شہر کوفے کی ایک بہت برگزیدہ ہستی شیخ سید ولی اللہ جنہیں عرف عام میں بابا کوفی کہا جاتا ہے دفن ہیں۔''

اندر گئے نفل پڑھے۔ پابندیاں یہاں بھی وہی تھیں۔ مسجد کے اندر نہیں جانا۔ مزار پر فاتحہ پڑھی اور اُس ہندو جوڑے کو پیار کیا جو یہاں دعا مانگنے کیلئے آیا تھا۔

زندگی کتنی سہل ہے ایسے معصوم لوگوں کیلئے جو تعصب سے، پاک دل کے سچے اور کھرے ہیں جو دل کو خدا کا گھر سمجھتے ہیں اور مسجد، مندر، گرجا اور معبد میں بے دھڑک جانا چاہتے ہیں۔ کاش کوئی انہیں نہ روکے۔

گمپولا سے نویرا علیہ کی طرف مڑے۔ یہاں تو بیٹ پٹیا یا ہوا پڑا تھا۔ راستہ بلاک۔ مٹی کرینوں سے اٹھائی جا رہی تھی۔ سڑک کو چوڑا کیا جا رہا تھا۔ ارد گرد کے گھر بھی

ماٹھے ماٹھے سے نظر آئے اور منظروں میں بھی رعنائی کم کم تھی۔شاید گردوغبار نے سارا حسن کیموفلاج کردیا تھا۔

Pussellwalla سے ٹی گارڈنز شروع ہوئے۔سڑک عمدہ، ماحول رعنائیوں سے لبریز اور موسم رومان پرور۔سبھی کچھ دل اور نظروں کو بھانے لگا۔سری لنکا کے یہ پہاڑی علاقے جزیرے کے تقریباً وسطی حصّے میں تین ہزار سے 8000ہزار فٹ کی بلندی کے گھیرے میں ہیں۔

چائے یہاں کب تھی پہلے۔خیر سے بہت سے اور تحفوں کے ساتھ یہ بھی گوروں یعنی صرف انگریزوں کا تحفہ ہے۔ان کی کاوشوں نے گول دائروں میں گھومتی اِن پہاڑیوں کو کچھ ایسی مخملیں پوشاک پہنادی کہ جسکی ڈیزائن داری میں شفاف آبشاریں اور ہرے بھرے بلندوبالا درختوں کی ایک دنیا شامل ہوئی۔ان سب نے خود کو نمایاں کرتے ہوئے اپنے ماحول کو وہ رعنائی دی کہ دیکھنے والوں کے قلب ونظر کیلئے جان فزا بن گئے۔

اِن ڈھلانوں پر چائے کے پتے چُننے والیاں دور سے ہمیں خوش رنگ تتلیوں کی طرح ہی نظر آئی تھیں۔سیڑھیوں کے راستوں سے کہیں کہیں اُترتے ہوئے آگے پیچھے یہ گل رنگ سے متحرک وجود کچھ ایسے ہی نظر آتے کہ جیسے کوئی پینٹ کیا ہوا منظر سامنے ہو۔

Kadclkithala میں کنارے پر بنے ہوٹل میں کھانا روایتی قسم کا تھا۔چاول، پاپڑ، سبزی، سموسے اور ررول۔ہم نے سبھی چیزیں منگوائیں اور تھوڑا تھوڑا سب کو چکھا۔موسم اتنا خوبصورت ہورہا تھا۔ملگجے سے آسمان سے پھوار کسی مہارانی کی طرح دھیرے دھیرے اُترتی تھی۔

نوبرا علیہ Nuwara Eliya قدرت کا ایک شاہکار، ایک حسین، ایک انمول تحفہ جو سری لنکا کو دیا گیا۔مگر کیسی عجیب بات ہے کہ انگریزوں کو یہاں سے رخصت ہوئے بھی زمانہ گزرا۔مگر وادی میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا ہے جیسے کہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔یہ تو لیک ڈسٹرکٹ Lake District کا علاقہ ہے۔وہی ٹوڈر Tudor اور وہی گھروں کا وکٹورین سٹائل۔یہاں وہاں بکھرے ہوئے تہذیبی نشان کچھ یاد دلاتے، کچھ سمجھاتے۔

اب سچی بات تو ہم ایشیائی لوگوں کو بڑی کڑوی گولی لگتی ہے۔تبرّوں سے نوازتے ہیں انہیں۔لٹیرے ڈاکو جانے کیا کیا خطاب دیتے ہیں۔

''ارے چلو اپنا گھر بھرا تو کچھ ہمیں بھی دیا پر یہ اپنے کیا کر رہے ہیں؟ ہم غریبوں کے منہ سے روٹی کے ٹکڑے چھین کر اپنی آل اولادوں کی سات پشتوں کا مستقبل محفوظ کر رہے ہیں۔ میرے ملک کے میدانی کیا پہاڑی علاقوں میں انگریزوں نے کہیں سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیر کر کہیں اونچے پہاڑوں میں سرنگیں کھود کر ریلوے ٹریک بنائے، لائنیں بچھائیں اور گاڑیاں چلائیں۔ ہم نے کیا کیا؟ بنی بنائی چیزوں کو سنوارنے اور اُن میں مزید بہتری لانے کے انہیں بیچ کھانے لگے۔ ریلوے کا خانہ خراب کر دیا۔

وادی الوہی سکون میں ڈوبی ایک مسحور کن خوشبو سے مہک رہی تھی۔ گاڑی مرکزی شاہراہ سے اولڈ بازار سٹریٹ میں داخل ہوئی۔ سبزیوں کی دکانیں ہی حُسن و آرٹ کے شاہکاروں جیسی لگیں۔ پیشکش میں ایک طریقہ، سلیقہ، ترتیب اور حسن تھا۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی احساس ہوا جیسے یہ عظیم الشان سی بھاری بھرکم عمارت کچھ خاصے کی چیز ہے۔ لکڑی کی چھت چاروں اطراف سے ڈھلان دیتی ہوئی۔ درمیانی حصّے میں گنبد تھا۔ آتش دان ایسے منفرد سے، دیواریں کھانے کا کمرہ، رہائشی کمرے، ٹی وی لاؤنج۔ پتہ چلا تھا کہ برٹش دور میں کورز کا گھر تھا۔

واہ ری بے وفا دُنیا   کیسے کیسے چولے پہنتی ہے تو

نویرا علیہ فطرت کا گھر ہے۔ اِسے انسانی ہاتھوں نے جو سنوارا وہ تو اپنی جگہ مگر یہاں خدا بولتا ہے۔ بہت سویرے کی لمبی سیر میں لوگوں سے ملاقاتیں جنہیں انگریزی نہیں آتی تھی اور جن کی زبان سے میں نا آشنا تھی۔ دیہاڑی دار مزدور لوگ جو اپنے کاموں پر جا رہے تھے۔ عورتیں بھی کہیں کہیں نظر آتی تھیں۔ بچے سکولوں کیلئے بھاگ رہے تھے۔ پیدل چلنے والوں کی بڑی تعداد ننگے پاؤں تھی۔ سچی بات ہے وجہ جو بھی ہو پر یہ طبیعت پر گراں گزرتی تھی۔

ناشتے کے بعد شہر کی دو گھنٹے کی سیر کیلئے نکلے۔ سارا شہر اپنی عمارات اور رکھ رکھاؤ کے حوالے سے قدیم شاہانہ عظمت کا حامل نظر آتا تھا۔ سچی بات ہے شہر کا لینڈ مارک اس کے ہوٹلوں کا حُسن ہے جو ہیروں کی طرح جگمگاتے اور نظروں کو خیرہ کرتے ہیں۔ ہل کلب ایک اور خوبصورت شاہکار ہے۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ کلب میں کوئی فرد نکٹائی کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ اب کیا کہوں کہ غریبوں پر بڑی جگہوں کے دروازے کیسے بند کئے جاتے ہیں؟

ہم گاڑی میں بیٹھے گرینڈ ہوٹل کی عمارت دیکھتے اور سُنتے ہیں کہ یہ الزبتھ ین

Elizabethan سٹائل ہے۔ہمیں تو ان کے گوتھک سٹائل سے بڑی آگاہی تھی مگر اب انواع واقسام کا ذکر سُن رہے تھے۔پوسٹ آفس بھی بڑا منفرد تھا۔سُرخ اینٹوں کا بنا ہوا۔ پارکوں کی خوبصورتی اپنی جگہ متاثر کن تھی ۔وکٹوریا پارک دیکھا اور پھر جاپان کے تعاون سے بنائے جانے والے پارک کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔اتنا خوبصورت اور بچوں کیلئے ماڈرن تختوں سے سجا ہوا۔گلف کلب،اینجلیکن Anglican چرچ اور سڑکوں کو سجاتے شاہ بلوط کے درخت ہکگالا Hakgala کا بوٹینیکل Botanicle گارڈن بھی مسٹر جسٹن کی مہربانی سے دیکھ لیا جو شہر سے کوئی چھ میل کی مسافت پر ہے۔اتنا خوبصورت کہ روح تک سرشار ہوگئی۔

توچند لمحوں کیلئے اُن کا ذکر خیر بھی ہوجائے کہ جنھوں نے نویرا علیہ کے فطری حسن کو اپنے ماہرانہ ہاتھوں اور دماغ سے رعنائی دی۔جسٹن پریرا نے تاریخ کھول دی تھی۔ پہلی بسم اللہ کرنے والے اُن انگریز شکاریوں کی ایک ٹولی تھی جو کوئی 1819 کے لگ بھگ یہاں شکار کھیلنے آئی اور جنہوں نے یہاں ملٹری سینیٹوریم اور بہترین قسم کی تفریح گاہ بنوائی۔

دوسرا اور بڑا اخراج سموئیل بیکر کو جاتا ہے جو سیاح تھا اور ایک بڑا تحقیق کار۔اپنی نیل پر کی گئی تحقیقات اور انکشافات کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور تھا۔نویرا علیہ میں اُس نے دو ہفتے گزارے۔بہت متاثر ہوا اور ایک چھوٹا سا انگریزی گاؤں بنانے کی خواہش لے کر رُخصت ہوا۔دو سال بعد وارد ہوا۔یہاں اُس نے اپنی ایک دنیا آباد کی۔اسلحہ خانے سے لے کر دھوبی،نائی،موچی تک اُس نے یہاں آباد کیے۔گھوڑا گاڑیاں،سڑکیں،باغ اُن میں نئے نئے بوٹے سبزیاں چقندر،آلو،ٹماٹر،گوبھی،گائے بھینسیں،مرغیاں،انسانی ضروریات کا کون سا ایسا پہلو تھا جو نظر انداز ہوا۔

جب داستان ختم ہوئی تو احساس ہوا کہ بستیاں بنانے والے بھی کیسے لوگ ہوتے ہیں۔غیر معمولی اور آہنی عزم والے۔

آج کے پروگرام میں سری پاڈا (آدم پیک) پہنچنا تھا۔راستے میں چائے کے باغات دیکھنے اور چائے بننے کے مراحل کو دیکھنا تھا۔مجھے اِس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ میں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنے قیام کے دوران نواب سر سلیم اللہ کے بھانجے کے سلہٹ ٹی گارڈن پر پورا ہفتہ گزارا تھا۔ان سب مرحلوں سے میں آشنا تھی۔مگر سوال تو مہرالنساء کا تھا۔سو خاموش ہونا پڑا۔

راستہ کیا تھا۔اب جنت تو دیکھی نہیں کہ اُسی سے تشبیہ دے سکتی۔میں نے لفظوں میں اپنے احساسات کو ڈھالنا چاہا تو وہ بھی دم توڑتے نظر آئے۔میں بلوچستان اور شمالی علاقہ جات کے پہاڑوں اور اُن کی رعنائیوں،ان کے دبدبے اور ہیبت کے طلسم سے آشنا سیاح ہوں۔مگران پستہ قامت بلندیوں کا حُسن بھی بڑا لرزہ خیز قسم کا تھا۔بہتوں کی صورت اٹھان اور پھیلاؤ لیے ہوئے۔پہلی اٹھان گویا کوئی تین ہزار کے ہیر پھیر میں چائے کے سرسبز رنگوں کی ہی ورائٹی میں دوسری ڈھلان دھیرے دھیرے کسی مست خرام نازنین کی طرح اپنے سینے پر چیڑ اور صنوبر کے پیڑوں کو سجائے بانکپن سے اوپر چڑھتی تھی۔

ان منظروں میں چمکتے گھروں کی سُرخ چھتیں گویا سُرخ نگینوں کی طرح دِکھتی تھیں۔بادلوں کے لہراتے پُرے ایک دوسرے کو پچھاڑتے آگے پیچھے بھاگتے تھے کبھی کبھی ننھی منی سی پھوار زنا کتوں سے دھرتی اور اس کی چیزوں پر قدم دھرتی جیسے ڈرتی ہو کہ کوئی اُسے مغروری کا طعنہ نہ دے دے۔چھوٹے چھوٹے موڑ۔ہر موڑ نئے منظروں کا پیامبر۔کہیں تازہ سبزیوں کے چھوٹے چھوٹے کھوکھے رنگوں کی بہار کو یوں سجایا سنوارا ہوا کہ صدقے واری ہونے کا دل چاہے۔

کہیں پہاڑوں کی صورت گری کچھ ایسی کہ جیسے سبز چادریں اوڑھے حالت آرام میں ہوں،جیسے خوابیدہ سے ہوں،جیسے گیان دھیان میں ڈوبے ہوئے اللہ سے لو لگائے رازو نیاز کرتے ہوں۔ان کی ہر صورت ذہن میں نئی تشبیہیں اُبھارتی اور نئے خیالوں کو جنم دیتی تھی۔

چائے کے باغات کا سلسلہ فطرت کے کسی دلآویز شاہکار کی طرح آپ کا دل مٹھی میں بند کر لیتا ہے۔راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا تھا اور پہاڑی علاقے کے سب لوازمات سے بھی لیس تھا۔داہنے ہاتھ گھاٹیاں تھیں پر انہیں دیکھ کر رگوں میں خوف سے سنسنی کی لہریں نہیں دوڑتی تھیں۔بائیں طرف پہاڑوں کی دیوار تھی پر ان میں جلال سے زیادہ جمال کی جھلک تھی۔

چائے بننے کے مرحلے میں سب سے اہم اور دلچسپ بات پتے کی سنہری مائل رنگت،نوخیزی اور تازگی سے ہے۔بعینہٖ جیسے ایک اوباش نواب گل چینی کیلئے نوخیز کلی کا مطالبہ کرتا ہے۔ہر پودے کی زندگی صرف چار سال تک ہوتی ہے۔لمبے چوڑے مرحلے جن میں پتوں کا توڑنا،وزن ہونا،مشینوں میں رولنگ،عمل تکسید سے گزارنا،خشک کرنا اور پھر انکی

گریڈنگ کا مرحلہ۔

مزے کی بات نمبرون چائے نمبرون ملکوں کو جاتی ہے۔نمبر۲ ایشیائی ملکوں کیلئے۔ اُن میں بھی درجہ بندیاں۔اپنے پیٹرزبرگ میں قیام کے دوران ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مقیم تھے جس کے کچن میں بیٹھ کر چائے خود ہی بنا لیتے تھے۔سری لنکا کی کمپنی کے ٹی بیگز اور خالص دودھ۔سچی بات ہے چائے پینے کا مزہ آجاتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ نویرا علیہ سے آدم پیک تک کے راستے کی خوبصورتی کو گرفت میں لانا بہت مشکل تھا۔پہاڑیوں کی پہلو در پہلو لیٹی پستہ قامت ڈھلانوں پر بنے سُرخ زمین کے راستے جن پر بنی زگ زیگ کی طرح گھروں کو جاتی سیڑھیاں۔نوعمر لڑکیوں کے غول،آبشاریں،قدرتی کھوہیں،مندر گرجے اور کہیں کہیں مسجدوں کے مینار کہیں دعا کیلئے اٹھا کسی بوڑھے انسان اور درخت کے ہاتھ،کہیں سبزے کی صورت گری ایسی کہ جیسے کسی نے بالوں کی مینڈھیاں کر رکھی ہوں۔

کٹھل کے درختوں نے مجھے ایک بار پھر ماضی میں دھکیل دیا تھا۔

ایک چھوٹے سے سکول سے نکلتے بچوں کا غول دیکھ کر میرے خوشی کے اظہار پر مسٹر جستمن نے کہا تھا۔"بڑی جدّ وجہد کرنی پڑی تھی اس کے لیے۔ہمارے شاعر اور ادیب بہت فعال رہے ہیں۔ذہنی بیداری میں اُن کا بہت کردار رہا۔خراج پیش کرتے ہیں ہم انہیں۔خیر سابقہ حکومتوں کو بھی یہ نقطہ سمجھ آگیا تھا۔تعلیم اور صحت اُن کی بھی ترجیحات رہیں۔ذرا سنیے اِس نظم کو۔

ہمارے بچوں کو غلامی سے بچاؤ

اس زمین پر کچھ مکروہ صورت
ایسے بھی ہیں
جو ہمارے خوبصورت بچوں سے جبراً
مشقت کرواتے ہیں
وہ انکی روح مار دیتے ہیں
اُنکے چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ
بڑے بڑے اوزار اٹھاتے ہیں
حالانکہ وہاں کتابیں ہونی چاہیں

وہ ان خبیث لوگوں کی باتیں سُنتے ہیں
اور انہیں استاد کہتے ہیں
یہ لفظ تو ان کے سکول ٹیچرز کیلئے ہے
روٹی کیلئے بچپن ہی سے تگ و دو
جو انہیں اپنے مستقبل کیلئے کرنی ہے
ایسا ہمارے خودغرض لیڈروں کی وجہ سے ہے
جو انہیں غلامی میں رکھنا چاہتے ہیں
آؤ اکٹھے ہو جائیں
اور اپنے بچوں کو
غلامی کے دوزخ سے بچائیں

سڑک کے کنارے چند بوڑھی عورتوں کو پیدل چلتے دیکھ کر میں نے جشنس سے انہیں لفٹ دینے کا کہا۔

''ارے باپ رے باپ۔نرم خوسا آدمی ترش روئی سے بولا۔مر بھی جاؤں تو انہیں لفٹ نہ دوں۔یہ ہندو عورتیں تامل ہیں۔یہ تامل لوگوں کا علاقہ ہے۔میں جانتا ہوں انہیں آگے اپنے قصبے Hatlon میں جانا ہے۔گاڑی بھی خالی ہی ہے۔کوئی حرج نہیں تھا۔مگر کون جانتا ہے اِن میں کس کے پاس خودکش دھماکہ خیز مواد ہے۔اِن لوگوں کا تو یہی وطیرہ ہے۔لفٹ مانگو اور گاڑی بندے اڑا دو۔

ہائے اِس تیسری دنیا کے دہشت زدہ ملکوں کے المیے۔

باب نمبر:۷ ستھالی اور تامل زبانوں کے خوبصورت اور ہر دل عزیز شاعر

۱۔ کروشاعر ہی نہیں۔ بہترین گلوکار، بہترین آنا ونسر، ڈیبٹیر، میوزک کمپوزر، کرکٹ کمنٹیٹر، ڈرامہ اور سٹوری رائٹر کے طور پر بھی بہت کامیاب تھا۔

۲۔ سنیل آر پیارتن کو فطرت نے نغمہ نگاری کے ساتھ ساتھ دُھن سازی کی بھی اعلیٰ خوبی سے نوازا تھا۔

۳۔ روی، بسیلا کورے اور رجینی فکری اور انقلابی سوچ کی وجہ سے بہت مقبول ہیں۔

شومئی قسمت جانے کون سی گھڑی تھی جب کہیں ہم سے اپنے لکھاری ہونے کی ڈینگ ماری گئی۔ مسٹر جسٹن تو شعروشاعری کا شوقین بندہ تھا۔ یوں بھی بڑا محبِّ وطن تھا۔ اب انہوں نے کیا ستھالی، کیا تامل شاعروں کے کہیں شوخ و چنچل، کہیں غم انگیز اور کہیں درد بھری شاعری اور گیت سُنوا سنوا کر ایک طرف اگر ہمیں قدرت کی اس فیاضی کے اعتراف کو ایک بار پھر دہرانے اور سراہنے کا موقع فراہم کیا کہ ملک چھوٹے ہوں یا بڑے۔ جگہیں بہت ترقی یافتہ ہوں یا کم تر، لوگ دیہاتی ہوں یا پڑھے لکھے، قدرت اپنے ہونے کا ایک اظہار انہیں تخلیقی قوتیں دے کر کرتی ہے۔ اور ایسی ایسی خیال آفرینیاں سامنے آتی ہیں کہ بندہ حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے تو دوسری طرف ایک اجنبی زبان کے گیت اور شاعر سُنوا سُنوا کر ہماری مت ماردی۔

کبھی کبھی جب ہم بوریت محسوس کرتے۔ تب دو ایک بار کہا بھی کہ جناب ہمیں

اردو کے وہ پرانے گیت سُنوا دیں جنہیں ریڈیو سیلون سے سُنتے ہمارا بچپن گزرا تھا۔مگر انہوں نے ہماری درخواست کورتی برابر اہمیت نہ دی۔اپنے ملک کی محبت میں ڈوبے،اپنے شاعروں کا دم بھرتے سری لنکا کا یہ چہرہ ہمیں دکھاتے رہے۔

یوں سچی بات ہے میں تو خود کرونیرتن ابی سکارا Karunaratne Aboysekera، روی ساتھسوم Ravi Sathasivam،سسِلا ہینیل آریارتن Ariyaratne اور جیبن آریسنیا گم جیسے بے مثال شاعروں کہ جن کی شاعری، آواز اور دیگر صلاحتیں اتنی زیادہ اور ایسی بے پایاں تھیں کہ بے اختیار انہیں سراہنے اور اپنے اُردو دان لوگوں سے ملانے کو جی چاہتا تھا۔

ان سب کے ہاں فکر کی جو گہرائی نظر آتی تھی وہ بہت متاثر کن تھی۔کچھ ایسا ہی حال بقیہ شاعروں کا تھا۔

تاہم کرو شاعر ہی نہیں تھا۔بہترین گلوکار،بہترین آناونسر،ڈیبیٹیر،میوزک کمپوزر،کرکٹ کمنٹیٹر،ڈرامہ اور سٹوری رائٹر کے طور پر بھی بہت کامیاب تھا۔زمانوں اپنی شاعری،گلوکاری،کمپوزنگ اور کرکٹ کمنٹری جیسی صلاحیتوں کے ساتھ،سری لنکا کی ادبی اور ثقافتی زندگی کے آسمان کا روشن ستارہ بنا رہا کہ جس کی دھوم ملک میں ہی نہیں ہندوستان تک میں بھی رہی۔

1930 کے لگ بھگ جنوبی سری لنکا کے ایک چھوٹے سے گاؤں رتمالی Ratmale میں پیدا ہونے والا کرو اپنے ساتھ بے شمار میدانوں میں مہارت رکھنے کے گنوں کا وصف لے کر پیدا ہوا تھا۔

شاعری کب شروع کی اور گیت گانے کا آغاز کب سے ہوا؟اور لکھاری کب بنا؟ وہ تو خود لاعلم رہا کہ یہ سب کیسے اسکی ذات میں داخل ہو کر اپنے آپ کا اظہار کرنے لگے تھے۔تاہم اِن سب کاموں کا آغاز یکے بعد دیگرے ہو گیا تھا کہ ہر ایک میں وہ ایک کے بعد ایک اپنے جھنڈے گاڑتا گیا۔

اُس کے اندر ایک خداداد شاعر تھا۔اس کا علم محض نو سال کی عمر میں اُس وقت ہوا جب وہ اپنے والدین کے ساتھ کینڈی میں پیراہرا (Perahera)(بدھا کا مقدس دانت دکھانے کی سالانہ تقریب) میں گیا۔ہاتھی کے ہودے میں بیٹھ کر اُس نے ترنم سے بدھا لارڈ کے حضور منظوم کلام گا کر پیش کیا۔اس کی آواز کا ترنم اور شاعری سبھوں نے لوگوں

کو حیران کر دیا۔ اتنا چھوٹا سا بچہ ایسا جاندار کلام اور ایسی موہ لینے والی آواز۔ تقریب بطور شاعر اور گلوکار اُس کا ابتدائی تعارف تھا۔

کرو کی سکینڈری تعلیم کولمبو میں ہوئی۔ حد درجہ مودب اور فرمابردار شاگرد۔ چھوٹی سی جگہ سے ایک بڑے شہر میں آکر اُسے ایڈجسٹ ہونے میں ذرا دقّت نہیں ہوئی۔ کالج کے تقریری مقابلوں میں حصّہ لیتا تو اپنے اشعار بیچ میں شامل کرتا اور تقریر کے دوران سامعین کو بتاتا کہ یہ اشعار اس کے اپنے تخلیق کردہ ہیں۔

اُس کی شاعری میں اُداسی، دُکھ اور غم کا عنصر کم عمری سے ہی تھا۔

وہ مذہباً بدھ تھا۔ نرم خو، نرم مزاج اور نرم دل رکھنے والا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی مصداق اُس کی شہرت نے لوگوں کی توجہ کھینچ لی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اُسے ریڈیو سیلون پر بچوں کا پروگرام کرنے کی پیشکش ہوئی۔ وہ اس عمارت میں داخل ہوا تھا جس نے آنے والے وقتوں میں اس کے اوپر شہرت، عزت، دولت سبھی دروازے کھول دیئے تھے۔

2000 سے زیادہ گیتوں اور شاعری کا خالق۔ جس میں تنوع تھا۔ موضوعات کے اعتبار سے انفرادیت تھی۔

ایک خداداد صلاحتیں رکھنے والا شاعر کم عمری سے نئی جدتوں کے ساتھ میدان میں اُترنے والا شاعر، نغمہ نگار اب براڈ کاسٹر خاص طور پر کرکٹ کی کمنٹری اور اس فیلڈ میں نئی نئی اصطلاحیں ایجاد کرنے والا بن گیا تھا۔ سنہالی زبان کو اُس نے کرکٹ کمنٹری کرتے ہوئے جس طرح وسعت اور رمانویت دی وہ اس کا بڑا کارنامہ ہے۔ نئے الفاظ، نئے انداز، بولتے میں زبان سے حرکات کا بھرپور تاثر۔ آسٹریلیا، انڈیا، ساؤتھ افریقہ، انگلینڈ اور پاکستان کے ساتھ میچوں میں ہمیشہ لوگوں کی خواہش اُسے سُننے اور دیکھنے کی ہوتی۔ ڈائیلاگ، رائٹنگ اور ڈرامے لکھنے میں بھی اُسے کمال حاصل تھا۔ نغمہ نگار تو تھا۔ کمپوزنگ بھی کرنے لگا۔ تب اِس میں بھی بڑا نام پیدا کیا اور بہترین کمپوزر مشہور رہا۔

ذرا دیکھیے اُس کی شاعری کا ایک نمونہ۔

ہماری زندگی میں خوشی اور مسرت ہی نہیں
غم، دُکھ اور مصائب بھی بہت ہیں
کہیں یہ ہمارے ماحول سے جڑے ہیں
کہیں یہ لنکا کی روایات سے جڑے ہیں

کہیں اُس ماحول سے جس میں ہم بڑھے پلے ہیں
لیکن کیا ہمیں ان سے فرار ہے
یا کہیں ان سے کچھ بہتر ہے
شاید وہ ایک گیت
جو ہمیں ہماری پرانی یادوں میں لے جائے
پس تو آ ہیں انہی خیالوں میں کھو جائیں
اکیلے گیت گاتے یا کہیں دوستوں کے ساتھ
باہر اونچے اونچے گاتے

اناؤنسمنٹ شروع کی تو انہیں اپنی صلاحیتوں سے وہ اضافے کیے کہ سری لنکن لوگوں کو کہنا پڑا کیسا فنکار انسان ہے؟ ہمارے دلدار پرویز بھٹی کی طرح کا کہ بات سے بات نکالتا، مزاح پیدا کرتا بات بھی بڑی معنی خیز ہوتی۔

ایک عوامی شاعر جس کے گیت ہر روز گائے جاتے ہیں۔سُنے جاتے ہیں۔دکانوں پر، شاہراؤں پر، نئی آوازوں میں ڈب کر کے نئے رنگ و آہنگ کے سامان کے ساتھ وہ آج بھی اتنا ہی ہر دلعزیز ہے جتنا ماضی میں تھا۔بوڑھے، جوانوں کو آج بھی اس کے گیت تڑپاتے ہیں۔

سری لنکا کی حکومت نے کولمبو کی ایک اہم شاہراہ اس کے نام پر کی ہے۔بے شمار تمغات اور انعامات سے اُسے نوازا گیا ہے۔مگر اس کا سب سے بڑا انعام اس کی شاعری اور آواز ہے۔زندہ رہنے والی جو ہمیشہ نہ صرف اپنے لوگوں کو بلکہ دور دیس کے لوگوں کو بھی کہیں نہ کہیں اُداس کرتی ہے اور کوئی میرے جیسی اُس پر چند لفظ لکھنے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔

روی ساتسوم بھی کمال کا شاعر ہے۔سری لنکا اس کی زندگی ہے۔اپنی بیوی تارہ اور بچوں سے بھی زیادہ محبوب۔کمال کا شاعر۔

Sicila Gooray سیسلا گورے جدید شاعری کی بے مثال شاعرہ ہے۔کالج میں پڑھاتی ہے۔سوچ میں بڑی انقلابی، عملی زندگی میں روایتی، شوہر اور بیٹے کی ممنون کہ ان کی حوصلہ افزائی نے اُسے شاعری پر آمادہ کیا۔اپنے بارے میں کہتی ہے کہ موڈی ہوں۔اُس وقت لکھتی ہوں جب تحریک پیدا ہوتی ہے۔

سنیل کوفطرت نے نغمہ سازی کے ساتھ ساتھ دُھن سازی کی وہ خوبی عنایت کی ہے کہ اُس نے سری لنکا کے فلمی گانوں پر زمانوں کے چھائے ہوئے تامل اثر کوختم کرتے ہوئے سنہالی کلچر میں ڈوبی ہوئی دُھنوں کوفروغ دیتے ہوئے سنہالی موسیقی کی اہمیت کو بڑھاوادیا۔

مسٹر جسٹن کینڈی کی انگریزی زبان کی شاعرہ جین آرسینیا گم Arasanaygam کی شاعری کے بھی بہت مدّاح تھے۔جس وقت ہم کینڈی میں داخل ہوئے ۔انہوں نے محبت اور سرشاری میں ڈوبے لہجے میں کہا تھا۔

''کینڈی میری محبوب شاعرہ کا شہر ہے۔یہاں وہ پیدا ہوئی ۔کیا شاعری ہے اس کی ۔ایک مصور کی طرح وہ چہرے، آوازیں، فضا ثقافتی رنگ ڈھنگ ،دکھ، حادثات ،سماجی اور سیاسی تنازعات کوکس کمال فنکاری سے لفظوں میں پینٹ کرتی ہے۔

وہ ڈچ برگر کلاس سے تعلق رکھنے والی ہے۔جس کے آبا کی کسی دلکش عورت کو ایک ڈچ افسر نے پسند کیا اور بیاہ کرلیا تھا۔جین نے خود ایک تامل سے شادی کی ۔مگر قدامت پرست روایتی گھرانہ جنہیں وہ قبول ہی نہیں تھی ۔دو بیٹیوں کی ماں جس کی زندگی کو اجیرن بنا دیا گیا۔

ذرا سُنیے ۔

کِسی نے دروازے کوتوڑ دیا تھا
اور جیسے مجھے آزاد کردیا
کہ میں دنیا میں گھوموں پھروں
آزاد اپنی ذات کے خول سے باہر آزاد

1983 میں جب تامل اقلیت اور سنہالی اکثریت میں خون ریز جھڑپیں ہورہی تھیں ۔وہ بھی اِس زد میں آئی اور گھر سے بے گھری اس کا مقدر بھی بنی ۔مہاجر کیمپ میں ڈرخوف، گھر بدری کا دُکھ، اپنی پہچان اور شناخت کا گم ہوجانا یہ سب وہ احساسات تھے جنہوں نے اس کی شاعری کو درد سے بھر دیا۔اس کی اسی زمانے کی شاعری پر نیشنل ایوارڈ دیا

گیا۔

باب نمبر:۸ آدم پیک

۱۔ پہاڑ پر پاؤں کا نشان سنہالی بدھا، تامل شیوا دیوتا، مسلمان حضرت آدم اور عیسائی سینٹ تھامس کا خیال کرتے ہیں۔

۲۔ چوٹی پر مشرقی سمت طلوع آفتاب اور مغربی جانب مخروطی سایے کا عمود اُزمین تک پھیلنا اور چند لمحوں بعد غائب ہو جانے کا منظر کسی انوکھے سے جادوئی تاثر کا حامل ہے۔

۳۔ جب %70 اکثریت %30 کو نظر انداز کرے گی تو مسائل پیدا ہوں گے۔ عام آدمی اب بنیادی سہولتوں سے زیادہ امن کا متلاشی ہے۔

سفر اب اختتـــام پر تھا اور محسوس کچھ یوں ہوتا تھا جیسے وجود کو کسی نے اُٹھا کر سبزے کے سمندر میں پھینک دیا ہو۔اگر کوئی میری آنکھوں میں جھانکتا تو شاید اُن کی ہر چھوٹی بڑی شریان سبز رنگ میں رنگی نظر آتی۔

نورو ڈگروپ کے گاؤں سے جب گاڑی مُڑی تب دریا کا دیدار ہوا۔سمندروں سے گھرے ہوئے جزیرے کے اِس دریا کو بھی دیکھ کر حیران ہونا پڑا کہ وہ دریاؤں والا رعب دوب کہیں نہیں تھا۔بیچارہ سمندروں سے رجّی پُجّی اِس دھرتی کا بِلا مسکین سا نالہ دِکھتا تھا۔چُپ چاپ خاموش لیٹا ہوا،ٹکڑیوں میں بٹا،کٹاؤ دار،کہیں ایسی صورت گری جیسے کسی فیشن ایبل لڑکی نے اپنے لباس میں جگہ جگہ میچنگ کپڑے سے کٹاؤ کے جوڑ ٹانک دیئے ہوں۔

جسٹمن پریرا اپنی مخصوص دھیمی آواز میں ہمیں سری پاڈا کے تاریخی گلی کوچوں کی سیر کرانے لگے تھے۔

آدم پیک کا مقامی نام سری پاڈا سمنولا کنڈا(Samanola Kanda) ہے۔سری پاڈا کا مطلب مقدس فٹ پرنٹ اور سمنولا کنڈا سے مراد سمن دیوتا کا پہاڑ ہے۔مغربی سیاحوں نے اسے آدم پیک کا نام دیا ہے۔سری لنکا کے ساحلوں سے باہر پوری دنیا میں اسکی وجہ شہرت 7437 فٹ اسکی بلندی نہیں بلکہ چوٹی پر دھرے پاؤں کے نشان کا تقدس ہے۔جسے بدھ مت کے پیرو کار بُدھا،کیتھولک عیسائی سینٹ تھامس (حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں میں سے ایک جو ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے منتخب ہوئے)،مسلمان حضرت آدم اور ہندو شیوا دیوتا کا مانتے ہیں۔

جب ابھی بدھ مت نے جزیرے پر قدم نہیں رکھا تھا۔تب بھی یہ دیوتا کا پہاڑ کہلاتا تھا۔ہاں البتہ تب انسان نہیں بلکہ پورے جزیرے کی پیلی رنگی تتلیاں اکٹھی ہو کر یہاں آیا کرتی تھیں۔

''ہائے بیچاریاں کسی زیارتی مشن پر آتی ہونگی۔''ہنسی بے اختیار ہی اندر سے نکل کر ہونٹوں پر پھوٹ پڑی تھی۔مسٹر جسٹمن بھی مسکرا دیئے۔

یہ زیارتی سلسلے تو کہیں گیارھویں صدی میں جا کر شروع ہوئے۔ویسے آپ

بڑے اچھے موسم میں آئی ہیں۔دسمبر سے مارچ تک زیارتی مہینے ہیں۔بعد میں بارشوں کی کثرت راستے کو خطرناک بنا دیتی ہے۔

''چلو شکر ہم نے بھی کوئی ڈھنگ کا کام کیا۔''

دفعتاً مسٹر جسٹمن بولے۔

''ذرا سامنے تو دیکھیے۔''

دُور شفاف آسمان کے نیچے نیلگوں دھوئیں کا بادل تھا جس کے سائے میں سفید گنبد سا نظر آتا تھا۔مُمّی سی قامت والا پہاڑ۔اب کے ٹو، نانگا پربت، راکاپوشی اور ترچ میر جیسی دیو قامت چوٹیوں کو دیکھنے والی آنکھ کو بھلا یہ کیا جچتا۔لیکن ایسا کب تھا؟ پورے وجود میں جیسے تھرتھلی سی مچ گئی تھی۔آنکھوں نے کس والہانہ پن اور وارفتگی سے دیکھا۔بچپن سے کہیں ساتھ جو تھا۔

اور پھر جیسے میرے بچپن کے وہ خوابوں کے سے دن ہنستے مسکراتے سامنے آکر رقص کرنے لگے تھے۔

گرمیوں کی راتوں کے اولین پہروں میں چھت پر پڑی قطار در قطار چارپائیوں پر لوٹنیاں لگاتے منجلی خالہ سے کہانیاں سنتے جب وہ اپنے لہجے میں بڑا ڈرامائی سا انداز پیدا کرتے ہوئے کہتیں۔

ہاں تو پیارے بچو رب کریم نے حضرت آدم کو اُس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا تھا۔مگر وہ اماں حوّا کی باتوں میں آگئے۔انہوں نے پھل کھالیا اور جنت سے نکالے گئے۔

میرے اللہ اس تصور کی فینٹسی کہ وہ فضاؤں میں کیسے لڑھکتے ہوئے نیچے آئے ہوں گے۔سمندروں سے گھرے اس خوبصورت جزیرے کی چوٹی پر گرتے ہوئے انہیں چوٹیں نہ آئی ہوں گی اور یہ بھی کتنا مقام شکر تھا کہ وہ زمین پر گرے، جو کہیں پانیوں میں گر جاتے تب کیا ہوتا؟ ساری رات ایسے ہی بے تکے ڈراؤنے سپنوں میں گزر جاتی۔

آدم پیک کی حدود میں گاڑیوں کا اژدہام نظر آیا۔پر بدنظمی اور بے ترتیبی کہیں نہیں تھی۔سڑک کے دونوں جانب گاڑیوں کی لمبی قطاریں کچھ اسی شان بان سے کھڑی تھیں جیسی کسی شہر کی اچھی انتظامیہ سڑک کو دو رویہ درختوں سے سجا دیتی ہے۔

سورج پوری آب و تاب سے چمکتا تھا اور ہواؤں کی رفتار میں بھی وہی آب و تاب

تھی ۔میں تو چھاتا لے کر فوراً باہر آگئی ۔بڑے دلفریب منظر تھے ۔کہیں لڑکے لڑکیوں کی چہلیں تھیں۔کہیں بھرے پُرے خاندان درختوں کی چھدری چھاؤں تلے اپنے اپنے برتن بھانڈے کھولے کھانے میں مُصروف تھے۔

''اللہ کیسے میرا جی چاہا تھا کہ جا کر انکے ساتھ ہی بیٹھ جاؤں ۔ایشیائی لوگوں کا من بھاتا کھاجا اُبلے چاول، دال، کباب اچار اور سلاد۔

پھر میں مارا والا سے آئی ہوئی ایک فیملی کے ساتھ باتوں میں جُت گئی ۔یہ زیارتی جگہ سری لنکا کے چاروں مذہبی گروہوں کے نزدیک حد درجہ مقدس اور محترم سمجھی جاتی ہے ۔یہ سب ہمارے ہاں کیطرح گروپ بنا کر حج یا عُمرے پر جانے والے لوگوں کی طرح ہی تھے ۔ مختلف عمروں اور رشتوں پر مشتمل خوش دل لوگوں کا ٹولہ جو ہنس ہنس کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں باتیں کرتا تھا۔

تبھی مسٹر پریرا مجھے کھوجتے ہوئے آئے ۔میرے اوپر نظر پڑتے ہی وہ اونچی آواز میں چلائے۔

''جلدی آیئے۔''

میں بھاگی ۔مجھ سے دس قدم آگے وہ تقریباً دوڑتے ہوئے پیچھے پلٹ کر میری رفتار کا بھی جائزہ لیتے جاتے تھے ۔انکی چال ڈھال اور انداز و اطوار سے جو بے چینی نمایاں تھی وہ کچھ ایسی ہی تھی جیسے کہیں ڈاکہ مارا ہو اور اب تعاقب میں پولیس ہو۔

میں سیٹ پر ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ ایکسلیٹر کی کلی دب گئی ۔ہارن کی چیخ وچنگھاڑ کے ساتھ گاڑی دوڑ رہی تھی ۔یہ دوڑ بڑی مسرور کن تھی ۔ایسے جان پڑتا تھا جیسے کہیں کے مہاراجہ ہوں ۔کسی ملک کے سربراہ ہوں ۔کوئی وی آئی پی ہوں کہ دورویہ کھڑے لوگوں کی قطاریں کہیں تعجب اور کہیں رشک وحسد سے دیکھ رہی تھیں۔

''میرے اللہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پورا سری لنکا زیارتی مشن پر نکل آیا ہے ۔ اسقدر گاڑیاں، اتنے لوگ، احساس تفاخر کے ہنڈولے میں جُھولتے جُھومتے میں نے گائیڈ سے پوچھا۔

''پر یہ معجزہ ہوا کیسے؟''

پولیس کو بتایا تھا کہ مجھے دو غیر ملکی عورتوں کو wathsala ہوٹل میں پہنچانا ہے جہاں اُنکے قیام اور دوپہر کے کھانے کی بکنگ ہے۔

احساس کمتری کی تہوں میں ڈوبا ہوا بیچارہ شعوری اور لاشعوری وجود اُس دم کسی بھیگے ہوئے پرندے کی مانند کسی کونے میں سکڑ گیا تھا۔تکلمر نے اصیل مرغ کی طرح پر پھڑپھڑائے اور شرمساری سے ہم نے دائیں بائیں نظر ڈالی۔

مہرالنساء پیچھے بیٹھی ہنس رہی تھی اور اُردو میں اونچی آواز سے ہانک سی لگا رہی تھی۔

''ارے واہ دوپہر کا کھانا۔کیا بات ہے اِن بیچاری غیر ملکی عورتوں کی۔وہ پھر کھلکھلا کر ہنسی۔

اوّل درجے کی شوم جنھوں نے نوریا علیہ سے دوپہر کے کھانے کے لیے سموسے اور رول صبح ہی خرید لیے تھے۔گزشتہ دن کی خریدی ہوئی مولیاں اور شلجم بھی کلیجے سے لگا کر ساتھ لے آئی تھیں کہ سلاد کا کونا بھی اس سے پورا کرنے کا ارمان تھا۔''

اُس کی طنزیہ ہنسی ہمیں مزید شرمندگی کے پاتال میں دھکیل رہی تھی۔میں بھی ہنس پڑی تھی۔

جہاں کہیں سڑک کا گھیرا کسی جانب کشادگی لیے ہوتا وہاں کڑاھیوں اور پتیلیوں میں جوان اور بوڑھی عورتیں کھانا پکانے میں جُتی ہوئی تھیں۔

مجھے یاد آیا تھا۔پچاس کی دہائی میں میری نانی اور دادی حج پر یوں ہی برتن بھانڈوں اور کھانے والی اجناس کے بوروں کے ساتھ گئی تھیں۔میرے تصور کی آنکھ نے حرم کعبہ کے نواح میں انہیں بھی اسی روپ میں چند لمحوں کے لیے دیکھا اور حظ اُٹھایا۔

wathsala ہوٹل کا کمرہ چھوٹا ضرور تھا پر خوبصورت اور آرام دہ تھا۔مچھروں سے بچاؤ کے لیے بیڈ کے گرد تنی ریشمی سفید دیدہ زیب جالی نے اُسے عروسی چھپر کھٹ سا بنا دیا تھا۔

سامنے شیشوں سے گہرے سبزے میں گھری آدم پیک،اسکا سفید گنبد اور راستہ آسمان پر سجے قطبی تارے اور کہکشاں کی مانند نظر آیا تھا۔چوٹی سے نگاہوں کو اُٹھا کر نیچے پھینکا تو ہریالیوں میں گھرا گاؤں اور کیلانی دریا نظر آیا۔

بیرا کولڈ ڈرنک کے ساتھ خالی پلیٹیں بھی رکھ گیا تھا۔لنچ نکالا۔سلاد بنایا اور غیر ملکی عورتوں نے پچاس روپے میں پڑنے والا کھانا خوشدلی سے اُڑایا۔ڈکار لیا۔وضو کیا اور اُس سرزمین پر جہاں ہمارے باپ آ کر گرے تھے سجدہ کیا۔

یہ تو گائیڈ نے ہی بتا دیا تھا کہ پیک پر جانے کا بہترین وقت رات کو دو بجے کا

ہے۔4800 سیڑھیاں درمیانی رفتار کے ساتھ چڑھ کر صبح دم جب آپ اوپر پہنچتے ہیں تو ایک دلفریب منظر اپنی پوری رعنائیوں سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔اس نظارے کی گرفت ابھی ڈھیلی نہیں ہوتی کہ اس سرزمین کا ایک اور خوبصورت منظر طلوع آفتاب آپ کو اپنے آپ میں جذب کر لیتا ہے۔

ذرا کمر سیدھی کرنے پر ہم دونوں ہی تیار نہ تھیں۔ڈل ہاؤس روڈ پر گاڑیوں کی چیخم دھاڑ کلیجہ دہلائے دیتی تھی۔کسی چابک رسیدہ سہمے ہوئے گھوڑے کی طرح بدک بدک کر ہم کبھی سڑک کنارے اور کبھی ملحقہ کچے کے سرے پر ہوتے۔چھوٹے چھوٹے کھوکھے فوڈ انڈسٹری کی ماڈرن صورتوں سے پوری طرح لیس راہگیروں کو لذت کام و دہن کی دعوت دیتے تھے۔

میل بھر چلنے کے بعد ہم ایک رنگ رنگیلے جیسے بھریا میلے کی حدود میں داخل ہوئے۔دورویہ دکانیں مقامی مصنوعات سے پُر تھیں۔نسواری،لال اور زعفرانی رنگوں والے تقریباً تین انچ چوڑے اور 10 انچ لمبے گلیجے سے جیلی نما حلوے کے ٹکڑے جنہیں سنہالی زبان میں دُودُل کہا جاتا ہے ہر مٹھائی والی دوکان کی زینت بنے زائرین کو خریدنے اور کھانے پر اُکساتے تھے۔ہم نے خریدا۔کھایا اور لطف اٹھایا۔واقعتاً بہت مزے کا تھا۔

ہم یقیناً اُن دوستانہ اور مخلص مسکراہٹوں سے جو عورتوں کی آنکھوں اور ہونٹوں پر ہمیں دیکھ کر پھیل جاتیں محظوظ ہوئے تھے۔

بدھ عبادت گاہ میں (Monk) مونک زمین پر بیٹھے سینکڑوں پیروکاروں کو لیکچر دے رہا تھا۔قریبی چوک میں شیشے میں مقید بدھ کا بلند قامت مجسمہ عقیدتوں کے ہزار رنگوں کا ترجمان تھا۔قریب ہی چوبی پُل کے نیچے کیلانی دریا ذرا زیادہ شور اور زور سے بہتا تھا۔بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتے جھاگ اُڑاتے اسکے دودھیا پانیوں میں نوجوان لڑکیاں آدھی ننگی،آدھی ڈھکی،صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کی تصویر پیش کرتی تھیں۔نوجوان لڑکے شارٹس پہنے چھینٹے اُڑانے اور چہلوں میں مصروف تھے۔مرد اور عورتیں بھی زیارت پر جانے سے قبل جسم کا گند اُتار رہے تھے کہ اوپر جانے سے قبل غسل کرنا اور سفید کپڑے پہننا زیادہ بابرکت خیال کیا جاتا ہے۔

کیلانی پُل کی ریلنگ پر دونوں کہنیاں ٹکائے میں نے شفاف پانیوں میں نہاتے اور اٹھکیلیاں کرتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

یہ دھرتی پر اوپر والے کا نائب دنیا کی گھمن گھیریوں میں کیسے کولہو کے بیل کیطرح آنکھوں پر کوپے چڑھائے چک پھیریاں لیتا رہتا ہے یوں کہ من پر میل کی تہیں چڑھائے چلے جاتا ہے۔پھر جب ہانپنے لگتا ہےتو اِس گند کواُتارنے کے لیے کتنے جتن کرتا ہے۔کہیں ماتھے رگڑتا ہے۔کہیں دان پُن کرتا ہے۔کہیں سُر تال سے اُسکو نُبھاتا ہے۔پر بندے کا پُتر نہیں بنتا۔یوں ہی چڑھانے اوراُتارنے کےاس عمل میں ایک دن دھڑام سے گرجاتا ہے۔

خود میں دیر تک گم رہنے کے بعد جب باہر آئی تو چاروں طرف بکھرے انسانوں کے اس اژدھام میں مہرالنساء کہیں نہیں تھی۔اُسے کھوجنے کی بجائے میں نے اطمینان بھرا سانس لیا۔شاید میں اُسوقت فطرت اورانسانوں کے خاموش مطالعہ کی متمنی تھی۔

پھر میں اُس کچے راستے پر جو دوکانوں اور لوگوں سے اٹا پڑا تھا چلنے لگی اور Makara Thorona پہنچی۔جہاں سے چوٹی پر جانے کا سفر شروع ہوتا ہے۔بدرنگ سے سنگ میل کے چوڑے پتھر پر آدم پیک انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔پانی کی بوتل خریدنے کے لیے قریبی دوکان میں گئی خوش طبع سے دوکان دار سے گپ شپ ہونے لگی۔آدم پیک کے لیے تین بڑے راستے ہیں پہلا ہٹن، دوسرا رتناپورہ اورتیسرا کرڈونا سے۔مگر سب سے بہترین اورآسان ہٹن کا ہےجس سے سفر کرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔رتناپورہ اور کرڈونا دونوں خاصے مشکل اور کسی حد تک خطرناک ہیں۔چند اور چھوٹے چھوٹے راستے بھی ہیں۔میری معلومات میں اضافہ ہوا۔

دکان دار تامل ہندو تھا۔رنگ برنگے لوگوں سے روزانہ کے رابطوں سے بڑا گھاگ اور حالات حاضرہ کی جڑوں تک سے آشنا لگتا تھا۔سری لنکا کی اس بیس سالہ جاری لبریشن ٹائیگرزاف تامل کی پیدا کردہ خانہ جنگی کے بارے میں دبے دبے لفظوں میں کچھ جاننا چاہا۔پہلے تو اس نے میرا حال احوال دریافت کیا۔یعنی پاکستان کے ملکی حالات جاننے چاہے۔میری کھری کھری باتوں سے کھل گیا۔

دراصل انگریزوں کے تربیت یافتہ اُن جیسے طرز زندگی کے عادی لوگ عام غریب آدمی کے مسئلے مسائل کو کیا سمجھیں۔اکانومی کی طرف،غریب آدمی کے سدھار کی طرف تو انکی توجہ ہی نہ تھی۔چاہے وہ بندرانائیکے کی فریڈم پارٹی ہو۔ Senamayake کی یونائیٹڈ نیشنل پارٹی یابائیں بازو والوں کی Lsspہوسب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھیں اور ابھی بھی ہیں۔جب 70%اکثریت 30% کونظر انداز کرے گی۔تو پھر ایک دن وہ

مقابلے پر کھڑی تو ہوگی۔ پہلے تو یہ لبریشن ٹائیگرز اف تامل اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی تھی ۔سیاست میں اپنا حصّہ مانگتی تھی۔ پھر خودمختاری اور ایلام نام سے علیحدہ مملکت کا مطالبہ کرنے لگی ۔ریاست اندر ریاست جو غلط بات تھی۔ملک کے کتنے تو سربراہ مارے گئے ۔راجیوگاندھی بھی انہی کے ہاتھوں مرا۔

اب ہر طرح کی کوششیں تو ہورہی ہیں۔حکمرانوں کوبھی احساس ہوگیا ہے ۔اور تامل ٹائیگرز بھی سمجھ رہے ہیں کہ اس خون خرابے والے راستے پر کتنی دیر تک چلا جائیگا۔

اب ان کے مطالبات میں زیادہ سے زیادہ حقوق کا تقاضا ہورہا ہے۔بھگوان کرے گا ایک دن امن ہوگا۔سچ تو یہ ہے کہ لوگ اب دال بھات سے زیادہ امن کے خواہش مند ہیں۔

میں نے امین کہا اور اپنے ملک کیلئے بھی دعا کی۔

کوئی گھنٹہ بھر وہاں بیٹھنے کے بعد جب باہر آئی تو انسانوں کی اس بھیڑ بھاڑ میں کسی نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔جو عورت میرے سامنے تھی اسکے تن پر گوشت کی تہہ کچھ ایسی ہی تھی جیسے لکڑی کے کسی ڈھانچے کو کپڑا پہنا دیا گیا ہو۔ ملائمت بھرے چہرے پر پڑی جھریوں کے اڈے کھڈے ابھی نہیں بنے تھے۔پر آنکھیں کیسی تھیں۔باتیں کرتی، کچھ کہتی بولتی، زمانے نے گرم سرد جو چکھایا تھا اُسے اُگالتی۔حوادث نے جو جھولی میں ڈالا تھا اُسے اُچھالتی، کہانیاں کہتی اور آپ کو جٹ پٹ چھا ڈالتی۔

''انڈیا سے''۔ صاف ستھری انگریزی میں لپٹا سوال ہوا۔

''پاکستان سے۔''

''انڈیا سے''ایسا صرف یہیں نہیں بیشتر ملکوں میں ہوتا تھا۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جابجا ہونے والا یہ سوال میرے لہجے میں کھلی شگفتگی اور چہرے پر بکھری مُسکراہٹ کو ایسے ہی غائب کرتا جیسے کاغذ پر لکھے گئے حروف ریمور سے مٹ جاتے ہیں۔پردیس میں یہ صورت چھچھوندر جیسی مثال کی عکاسی کرتی تھی جسے گلے میں پھنس جانے پر نہ اُگلے بنے اور نہ نگلے۔

تاہم مخاطب بڑی سیانی عورت تھی۔چہرے کی زبان پڑھنا جانتی تھی۔میرے بازو پر دوستانہ انداز میں تھپکی دیتے ہوئے بولی۔

''سری لنکن پاکستان کو بہت پسند کرتے ہیں۔''

میں ابھی چہرے پر بکھری خجالت کی دُھول کو صاف کر رہی تھی جب اُسنے رات کو اوپر جانے کے لیے اپنی خدمات کی پیشکش کی۔

میری تو ہنسی چھوٹ گئی۔منہ سے تو کچھ نہ پھوٹی پر میرے اندر نے تو فی الفور سب کچھ چہرے پر لکھ دیا۔

''لو بھئی کس زعم میں ہے یہ۔ دھان پان سا اسکا وجود ایک تیز بلھے کی مار ہی تو ہے۔''

ہنستی آنکھوں میں لکھی جانے والی یہ تحریر بھی اُس نے فوراً پڑھ لی۔

''میری ہڈی ہڈی جوڑ جوڑ میں مشقت رچی ہوئی ہے۔ ان چڑھائیوں ،اُترائیوں سے دیرینہ یاری ہے۔آپ جیسی ہی کئی عورتوں کو سہارا دیتی ہوں۔

بڑا کھلا چیلنج تھا۔وہ اگر مشقت پرست تھی تو ہم کونسا آرام پرست تھے۔اب تک کی تو ساری زندگی عمراں ''لنگیاں پیّاں پھار'' کی عملی عکاس تھی۔

''تو بھئی خود ہی چڑھیں گے۔''دل میں فیصلہ ہو گیا تھا۔

اسکے ہاتھوں کو تھپتھپا کر اجازت لے کر نیچے اُتری۔بڑے بڑے پتھروں سے اٹا پڑا راستہ خاصا دشوار تھا۔کہیں اٹھک،کہیں بیٹھک،کہیں چھوٹی موٹی چھلانگوں سے دریا میں نہاتے لوگوں تک پہنچی۔

میں تو بڑا ڈرتی تھی۔پر کیسے کھلے ڈُھلے لوگ تھے۔ذرا سا منہ ہلایا اور وہاں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو والی صورت تھی لڑکیوں نے ڈھیروں تصاویر بنوائیں۔بلکہ ماؤں نے پوز بنوانے میں ہدایات دیں۔

بڑے سے پتھر پر بیٹھ قریبی چائے کے کھوکھے سے ایک کپ چائے منگوا کر چائے کے کپ کو ہاتھوں میں تھامے اوپر نیلے شفاف آسمان اور نیچے لوگوں کے پُروں کو دیکھنا،گھونٹ گھونٹ چسکوں سے چائے پینا اور موجودلمحوں سے مسرت کشید کرنا بھی کس قدر دلچسپ کام تھا۔ایک گھنٹے تک میں نے پوری دلچسپی سے یہ کام کیا۔

تبھی پھولدار سکرٹ اور منی بلاؤز میں وہ اُدھیڑ عمر عورت جو زیارت کے لیے دمبولا سے آئی تھی میرے پاس آبیٹھی تھی۔اُس نے اپنے گریبان سے خوشبو میں بسا بُدھا کا سونے کا چھوٹا سا مجسمہ نکالا اور سامنے پڑے بڑے پتھر پر سجا دیا۔میں مُسکرا دی تھی۔واہ ری محبتیں اور عقیدتیں۔جس کی جتنی توفیق اور ہمت۔

رجھانے کے من پسند انداز جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

جب میں ہوٹل آئی ۔مہر النساء سورہی تھی ۔دھیمے سے دروازہ بند کیا اور دھیرے سے جالی کا کونا اُٹھا کر اندر داخل ہوئی ۔ تکیے پر سر رکھا اور خود کو چھپر کھٹ میں کیا پایا کہ یوں محسوس ہوا جیسے کسی بوسیدہ گھن زدہ لکڑی سے اچانک ماضی کی یادوں کا برادہ گرنا شروع ہو جائے ۔چھپر کھٹ اور حجلہ عروسی کا کچھ ایسا ہی سمبندھ ہے جیسے چولی دامن کا ساتھ ہو۔

ہماری سہاگ رات بھی کیسی پھسپھسی سی تھی ۔چھپر کھٹ تو کہیں دور کی بات ہے پھل پھول ،لڈو پیڑے کچھ بھی نہیں تھا ۔مدقوق سی روشنی میں ایک شگفتہ سا چہرہ ضرور چمکتا تھا ۔میں خود دوپہر میں سُسرالی عزیزوں کی جانب سے دیئے گئے ریمارکس ''ہائے ہائے نی ووہٹی تے چیری لگدی اے'' (ہائے ہائے دُلہن تو دانے بھوننے والی لگتی ہے) کے تحت ڈپریس سی تھی ۔اور پھر یہ چیری پتہ نہیں کب چھپر کھٹ کو تکتے تکتے کہیں گم ہوگئی۔

رات کو کھانے کے لیے ڈائننگ روم میں آئے تو دنیا جہان کی نسلوں کا ایک اکٹھ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہا تھا۔فضا میں کھانوں کی مہک تھی ۔گلاسوں میں ڈرنک انڈیلنے کا شور تھا۔ہماری قریبی میز پر دو اُدھیڑ عمر کنفرمڈ بیچلر جرمن جو تین بار سری لنکا اور سات چکر انڈیا کے لگا بیٹھے تھے اور ستم ظریفی یہ کہ ایک بار بھی پاکستان نہیں آئے تھے۔

''کیوں کیا پاکستان میں باگڑ بلے بیٹھے ہیں تمہیں کھانے کے لیے۔''

انڈیا کے سات چکر لگانے کا سُن کر میں تو یوں حسد سے تڑخی تھی جیسے گرمی سے گیلی مٹی تڑختی ہے۔

''پاکستان تو دہشت گردی کا شکار ہے۔القاعدہ کے لوگ گھروں میں چھپے بیٹھے ہیں ۔آئے دن بم دھماکے ہوتے ہیں ۔اُنہنے ....''

وہ آگے کیا کہنا چاہتا تھا۔میں نے تو بات پوری نہ ہونے دی۔بیچ میں سے ہی اُچک لی۔

''انڈیا تو امن کی جنت ہے نا۔وہاں تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔انڈیا سے زیادہ بم بلاسٹ اور کہاں ہوتے ہیں؟انڈیا اور امریکہ سے بڑے دہشت گرد اور کون ہیں۔''

ایسی تلخ باتوں پر اُنکے بندر کی پیٹھ جیسے رنگ والے چہرے اور لال گلال ہوئے۔ ہنسے ضرور پر تھوڑی سی خفت بھی نمایاں ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا۔اور میں نے پاکستان کی خوبصورتی اور اسکے تاریخی مقامات پر قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے۔

لاہور کے دروازوں اور گیٹوں کی تفصیل، دلّی دروازے میں مسجد وزیر خان اور شہزادیوں کے حمام جن میں شہزادیوں کے حماموں اور خواب گاہوں کا بڑھ چڑھ کر تذکرہ کیا۔ شاہی قلعہ اور شیش محل کی نشست گاہوں کا دلفریب نقشہ، پرانے شہر کے بازار اور انکی بُھول بھلّیاں، کناری بازار سے داخل ہو کر چھتہ، گُمٹی اور آگے بازار در بازاروں کے سلسلے کہیں لوہاری گیٹ، موچی دروازہ، اکبری منڈی، شاہ عالمی، رنگ محل لاہوری تہذیب و ثقافت کے مرکز۔

ارے اندرون لاہور کا تو چپہ چپہ تاریخ میں اُلجھا پڑا ہے اور جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ تو پیدا ہی نہیں ہوا۔"

اپنی زبان کی یہ کہاوت جب انہیں سُنائی تو انکے ہنسنے کے ساتھ ساتھ ہم بھی خوب ہنسے۔

کھانے کی میز پر سری لنکا کے کھیتوں میں اُگنے والے چاول قاب میں پڑے یوں دِکھتے تھے جیسے سُچے موتی سجے ہوں۔ درمیان سے موٹے، اطراف سے پتلے، چھوٹے چھوٹے اف وائٹ کلر لیے ہوئے۔ ساتھ میں ہم نے چلّی فش کری منگوائی۔ سلاد کی پلیٹ تھی۔ مسٹر جسٹمن نے ہمیں سلاد کی ایک ڈش گوتو کولا سمبل Gotukola Sambol کا بھی کھانے کا کہا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے پتوں کی سبزی تھی جسے کاٹ کر ناریل، گوشت اور پیاز کے ساتھ بنایا جاتا ہے۔ سیاحوں کی بڑی پسندیدہ تھی۔

ہوگی بھئی۔ میں تو ہوٹل کے کچن میں جا کر اِسے دیکھ آئی تھی۔ باورچیوں سے ترکیب بھی پوچھ لی تھی اور چکھ کر رد بھی کر بیٹھی تھی۔

باب نمبر:۹ سری پاڈا کی مہم جوئی

۱۔ چوٹی کا راستہ روشنیوں، ایمبولینس پوسٹوں اور ریفرشمنٹ سٹالوں سے سجا جنگل میں منگل کا ساسماں پیش کرتا تھا۔

۲۔ مسلمان تنگ نظر، ہٹدی اور متعصب ہیں؟ جیسے موضوع پر پٹو ول شہر کی فیملی سے زوردار مکالمہ۔

۳۔ دنیا کے بیشتر مذاہب کی بہت سی چیزیں مشترکہ ہیں۔

بڑی میٹھی اور گہری نیند تھی۔ جگانے کیلئے دستک بھی بڑی زور دار قسم کی تھی۔ آنکھوں میں جھری سی پیدا ہوئی۔ چوٹی پر جانے کا یاد آیا۔

"ہائے" کی ایک درد انگیز کراہ نکلی۔ روزے کے لیے سحری کے وقت اُٹھنے والی مجبوری اور بیزاری کی سی کیفیت تھی۔

''سری پاڈے کو دفع کرو۔ اسے گولی مارو'' نیند نے جیسے سرگوشی کی۔

پر اسے ہرگز دفع نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ اسے گولی ماری جا سکتی تھی۔ اتنے

پینڈے کی مارو ماری آخر کس لیئے تھی؟

شراٹے مارتی آوائل فروری کی اس تیسرے پہر کی خوشگوار خنکی سے لبالب بھری ہوائیں ڈھلائی پہاڑیوں پر اُگے چائے کے پودوں سے گتھم گتھا ہوکر آنے کا بھرپور تاثر دیتی تھیں۔ نیچے گھاٹیوں میں خوفناک گہرا اندھیرا تھا جہاں ہوائیں سیٹیاں بجاتی اور شور مچاتی تھیں۔

رات کے اس پہر بھی ہر عمر اور ہر سائز کے ہجوم عاشقاں کا سیل رواں تھا۔ نوعمر لڑکے لڑکیوں کی اٹھکھیلیوں اور چھوٹے بچوں کی اُچھل کود نے حرم کعبہ کی بہت سی یادوں کو تازہ کر دیا تھا۔ بس کچھ فرق تھے جن میں متانت اور سنجیدگی سرفہرست تھی جو وہاں تھی اور یہاں نہیں۔

آدم پیک کا راستہ آغاز میں خاصا کشادہ، کلیجی مائل سرخ بجری سے ڈھنپا اطراف میں جا بجا سٹالوں سے سجا پڑا نظر آیا تھا۔ رات کے گھور اندھیرے ارد گرد کے نظاروں کی باریکیوں کو دیکھنے اور سراہنے کی راہ میں حائل تھے۔ تاہم مصنوعی روشنیاں جہاں تک ممکن تھا راستے صاف کرتی تھیں۔ نوجوان بُدھ بھکشوؤں کی زائرین کی طرف دلچسپی اور بھرپور توجہ متاثر کن تھی کہ اطراف میں لگائے گئے چھوٹے سے کیبنوں میں کھڑے وہ نوجوان لڑکیوں کی کلائیوں میں دھاگہ نما ڈوریاں باندھنے اور انہیں ہدایات دینے میں بڑے انہماک سے جُتے ہوئے تھے۔

مسلسل چلنے اور موڑوں کی چڑھائیوں سے ہم ہونکنے کی کیفیت میں تھے شاید اسی لیے چائے کے سٹال کے سامنے دھری کرسیوں پر ڈھے سے گئے۔ پر یہاں چائے نہیں کافی تھی۔ اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض کے لیے کافی خطرے کا سگنل ہے۔ پر تھوڑا سا تازہ دم ہونے تھوڑی سی بشاشت اور بوڑھی ہڈیوں کو متحرک کرنے کے لیے چند گرم گھونٹوں کا اندر جانا بھی بہت ضروری تھا۔ سوڈرتے ڈرتے آدھا کپ پیا۔

سٹال پر کھڑا خوش طبع اور تعلیم یافتہ لڑکا ''غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا'' کی عملی تفسیر نظر آیا تھا کہ جونہی میں نے یہ جاننے کے لیے لب کھولے کہ حضرت آدم سے متعلقہ اس روایت کا کوئی تاریخی حوالہ بھی ہے یا یونہی ساری قصہ کہانی ہی ہے۔ اُس نے تو پل نہیں لگایا اور حوالوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

پہلا تو اُن عرب تاجروں کا تھا جو یقیناً بڑا معتبر بھی تھا کہ جب وہ پہلی صدی عیسوی

میں سیلون (سری لنکا کا پرانا نام) آئے تو چوٹی سے نکلتے مختلف رنگوں کی بوچھاڑ نے نہ صرف انکی رہنمائی کی بلکہ انہیں یہ یقین دلایا کہ بابا آدم یہیں تو گرے تھے۔

دوسرا طاقتور حوالہ مارکوپولو، ابن بطوطہ اور مریگنولی کی تحریروں کا تھا۔ تیسری تفصیل اُس راہب کی تھی جو 1346 میں اوپر گیا اور جس نے واپس آکر یہ کہا کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اوپر پہاڑ پر جاکر انہیں کوئی جنت یا کوئی ماورائی چیز نظر آئے گی کیونکہ اس سے پہلے دنیا بھر میں یہی نظریہ کارفرما تھا سخت غلطی پر ہیں۔ ہمارے آباؤاجداد اب وہاں نہیں ہیں۔ ہاں اُن کی کچھ نشانیاں ضرور وہاں ہیں۔

ہم دونوں میں سے کسی کی کلائی پر رسٹ واچ نہیں تھی۔ سٹال پر گھڑی کی ٹک ٹک کچھ کہتی تھی کہ تمہارا پینڈا اچوکھا بھی ہے اور کٹھن بھی۔ پو پھٹنے سے پہلے اوپر نہ پہنچیں تو سفر کھوٹا ہو جائے گا۔ تاریخ کی کتاب کو بند کر دو اور راستہ ناپو۔ پس تو ایم۔ پی سنا سنی کو خدا حافظ کہا۔

بڑھاپے کے عشق اکثر و بیشتر بڑے مہنگے پڑتے ہیں۔ سانس لوہار کی دھونکنی کی مانند پھولا پڑتا تھا۔ اوپر والے سے میری سرگوشی بڑی رازدارانہ تھی۔

''سر میرا کلیجہ پھٹ کر سری پاڈے کے اس پہاڑ پر ہرگز ہرگز بکھرنا نہیں چاہیے۔''

پسینے سے تر بتر پیشانی، پھولتے سانس، خشک ہونٹوں اور سانولی رنگت والی اس ناٹے قد کی عورت کو پیچھے سے آنے والے اُس حلیم طبع آدمی نے بہت ہمدردانہ نظر سے دیکھا تھا جو پورے خاندان کی لام ڈور کے ساتھ تیز اور پُراعتماد قدموں سے چلتے ہوئے ہمارے ساتھ آن ملا تھا۔ ڈی ایس کرونا رتنا (Karunaratna) نے ہماری حالت کے پیش نظر یہ کہنا شاید ضروری سمجھا تھا۔

''اطمینان سے چلیے۔ اگلی دو میل کی عمودی چڑھائی تو آپکا پٹرہ کر دے گی۔''

میرے جیسی دلیر پاکستانی عورت کے لیے تو یہ بات شرمندگی کا باعث تھی۔ جواب دینا بہت ضروری سمجھا تھا۔

میں نے اپنے ملک میں اس سے زیادہ اونچی اور خطرناک چڑھائیاں چڑھی ہیں مگر تب جب یہ آتش جوان تھا۔

وہ بھی مسکرایا میں بھی مسکرائی۔ بندہ بیبا اور دلچسپ لگا۔ سگریا کا رہائشی اور وہیں کالج میں فزکس کا اُستاد تھا۔ بدھ مسلک کا جان کر میں نے بدھ لوگوں کے اِس مقدس نشان کے بارے میں تاویل جانی ضروری سمجھی۔ جواب کچھ ان الفاظ میں تھا کہ تیسری صدی قبل

مسیح میں بدھ مت کے پیرو کاروں نے اس نقش کو بدھا کا پاؤں ہی جانا۔ کیونکہ برصغیر کی قدیم تاریخ میں اسطرح کے نشانات صرف دیوتاؤں کے ہی تصور ہوتے تھے۔

ایک اور پڑاؤ آیا۔ یہاں پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ چائے دستیاب ہے۔ یہ کیسی رنگ رنگیلی مہم جوئی تھی۔ جگہ جگہ بکتی کھانے پینے کی اشیا۔ اعزازی رضاکاروں کے قائم کردہ فسٹ ایڈ اسٹیشن اور چائے کافی کے سٹال آپکو چند لمحوں کے لیے توانائی اور سرشاری و لطف کا احساس ضرور دیتے ہیں۔ دائیں بائیں ہنستے مسکراتے چہرے یہی کام کر رہے تھے۔ جوانوں کی چہلیں کہیں تصویر کشی، کہیں باتوں کے سلسلے۔

اب ایک اور بات بھی مشاہدے میں آئی جسکا شاید میں نے خیال نہیں کیا تھا کہ مردوں نے سروں پر سفید کپڑا پگڑی کے سے انداز میں لپیٹا ہوا تھا۔ سفید لباس کو بھی اِس زیارت کیلئے بہت پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے۔ بیشتر مرد اسی پہناوے میں نظر آئے تھے۔ تاہم استثنائی بھی موجود تھی۔

گو رات تاریک تھی۔ مگر آسمان پر چمکتے ستارے بہت روشن تھے۔ چڑھائی کے دوران ذرا سا سانس کی درستی کیلئے رُکتے تو کہیں کہیں گھاٹیوں، کہیں پہاڑی ڈھلانوں پر کھلے پھول اور اُنکے رنگ شب دیجور میں جگنوؤں کی مانند جگمگا سے جاتے۔ ٹھنڈی اور جنگل کی خوشبوؤں سے لدی پھندی ہوائیں تازگی اور فرحت کا احساس بخشتیں۔

ان ہواؤں کے جھلاروں میں ہم نے خود کو" کیا ٹائم ہے؟ اور کتنا باقی ہے؟" جیسے سوالوں اور جوابوں کی پریشانی سے آزاد کر لیا تھا کہ ساتھ چلنے والے بھی تو اسی مار دھاڑ میں لگے ہوئے تھے۔ ساتھ چلتے بوڑھوں اور جوانوں کو کم و بیش اپنی جیسی کیفیات میں مبتلا دیکھتے اور مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے ہانپتے کانپتے راستہ طے ہونے لگا تھا۔

ذرا تھم اے راہرو کہ پھر مشکل مقام آیا۔

اور وہ مشکل مقام آپہنچا تھا۔

عمودی چڑھائی کا ٹوٹا افسانوی بیانات اور رنگوں سے قطعی کم نہ تھا۔ میرا سانس اور ٹانگیں تب بھی پھولتیں اگر اسکے پیچھے تازہ خون بھی ہوتا۔ تاہم اس ٹکڑے کو ممکنہ حد تک آرام دہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ سُرخ پتھر کی سیڑھیوں کو درمیان کی ریلنگ سے الگ کرتے ہوئے اُترنے اور چڑھنے والوں کو اطراف سے بھی سہارا فراہم کرنے کی کاوش بہترین تھی۔ کہیں بہت زیادہ کشادہ اور کہیں قدرے چوڑے راستے پر کھلے ڈھلے انداز میں

چلنے والے ٹولے اب سمٹ کر ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ یوں جیسے کوئی چوڑے پاٹ کا دریا کسی پہاڑی پیچ وخم میں آکر سکڑ جائے۔

حکومت کی مسلسل توجہ نے اسے بہت روشن اور آرام دہ بنا دیا ہے۔گزشتہ صدی کے نصف میں سفر کرنے والوں سے کوئی پوچھے کہ اس پر چڑھنا کتنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے نے کہا تھا۔

1950 کے اوائل اور اس سے قبل حج بھی ایسی ہی صعوبتوں کا نام تھا۔میری یاداشتوں میں اپنی نانی اور ماموں ابھرے تھے جو حج سے واپسی پر دنوں بیمار رہے۔جن کے پاؤں صفا اور مروہ کے پتھروں پر سعی کرتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے۔

صبح کاذب نے اُمید اور منزل کے قریب آنے کی نوید سنائی تھی۔اور جب صبح صادق کا اُجالا مقدس عمارت اور اردگرد کے خوبصورت مناظر کو آشکارہ کر رہا تھا۔ہم چوٹی پر پہنچ چکے تھے۔انسانوں کے اژدہام کے باوجود نظم و ضبط کمال کا تھا۔ دھکم پیل نہیں تھی۔میرے لیے یہ بات خاصی تعجب انگیز تھی۔

مقدس عمارت کی طرف بڑھنے کی بجائے ہم دونوں ریلنگ کے ساتھ ایک جانب ہو کر سانسوں کی تیز رفتاری کو اعتدال پر لانے،سورج نے کس سمت سے برآمد ہونا ہے کا جائزہ لینے اور لوگوں کو سیڑھیوں کے پوڈوں پر ہی سجدہ ریز ہوتے دیکھنے کے لیے رک گئیں۔

ذرا سا رُخ پھیرنے پر منظروں تو ایک جہان نظر آتا تھا۔پہاڑوں کی چوٹیاں اور ڈھلانیں نیلگوں کہرے کی چادر اوڑھے لمبی مسافتوں کے بعد ستانے جیسی کیفیت کی عکاس تھیں۔تاحد نظر پھیلے ہوئے ہرے کچور جنگلوں کا سلسلہ مختلف النوع پھول پودوں سے سجا اور چھوٹے بڑے جانوروں سے بھرا پڑا تھا۔جنہیں صبح صادق نے نیند سے اٹھا کر متحرک کر دیا تھا۔ان جنگلوں کے پھول بوٹوں پر سے تیر کر آتی ہوائیں اپنے دامنوں میں چُرائی ہوئی خوشبوؤں سے مالامال رخساروں کو چھوتے ہوئے ناک میں داخل ہو کر جیسے سارے سریر کو سرشار سا کرتی تھیں۔دھنک رنگوں والی ہزاروں تتلیاں سروں پر یہاں وہاں اُڑتی نظروں کو لُبھا رہی تھیں۔

صرف ہم ہی نہیں بلکہ وہ سب بھی جو پینڈا مارتے یہاں تک پہنچے تھے لوگوں کو کہنیاں مارے اور دھکے دیئے بغیر اُس قطعہ پر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے جو طلوع آفتاب کے نظارے کے لیے مخصوص تھی۔

قطعہ غیر ملکیوں اور مقامی لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ چھوٹے بچوں کو بڑوں نے اُٹھا رکھا تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے ان لمحوں میں وقت کی گردش رُک گئی ہے اور ارد گرد کا ماحول سنگی بُت بن گیا ہے۔ ہر آنکھ مشرق کی جانب اُٹھی ہوئی تھی۔ سچی بات ہے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مشرق کا سینہ نظروں کے تیروں سے چھلنی چھلنی ہو جائے گا۔

اس بڑے سے قطعے کے اگلے حصے کو تین ساڑھے تین فٹ اونچی اور خاصی لمبی دیوار سے محفوظ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ دیوار میں جا بجا لگائے گئے بانسوں پر یقیناً منتوں مرادوں کے پھریرے جو موسم کی نرم گرم سختیوں سے بدرنگے اور بوسیدہ ہو چکے تھے ہوا کے جھونکوں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے کچھ یاد دلا گئے تھے۔

کون جانتا ہے ان لیروں میں سے کتنی ایسی ہوں گی جنہیں دو دلوں چار ہاتھوں اور چار آنکھوں نے جانے کیسے کیسے خوابوں کے زیر اثر باندھا ہو گا۔ اور جانے کوئی زندگی اس شعر کی بھی تفسیر بن گئی ہو گی۔

ہسن کھیڈن نال لے گئیوں
ست گئیوں وچ فکراں
پاٹی لیر پرانی وانگوں
ٹنگ گئیوں وچ کِکراں

ترجمہ: میرا ہنسنا کھیلنا تو سب تم اپنے ساتھ لے گئے ہو
فکروں میں مبتلا کر کے چھوڑ گئے ہو
کسی پھٹے پرانے کپڑے کی طرح
مجھے کیکر کے درخت پر ٹانگ گئے ہو

مجھے اپنی ٹانگیں منوں وزنی پتھروں کی لگ رہی تھیں۔ پر اُس سمے نہ تو میں پل بھر کے لیے ستانے اور نہ ہی نظروں کے زاویوں کو ادھر اُدھر کرنے کی روادار تھی کہ ڈر لگتا تھا کہیں ظالم وقت اُس شہزادی کی طرح ہمارے ساتھ ہاتھ نہ کر جائے جو ساری رات شہزادے کے جسم سے سوئیاں نکالتی رہی تھی۔ صبح دم پل بھر کے لیے اُٹھی اور اپنی منزل کھوئی کر بیٹھی۔

پھر چوٹی کے عقب میں رو پہلی تلوار کی تیز چمک دار دھار جیسے منظر نے آنکھوں کے سامنے لشکارا مارا۔ گہرا نارنجی جیسے آگ کا شعلہ پہاڑ کی پیشانی پر لپکا۔ پہاڑ کا دامن دھند

میں ملفوف اور پیشانی نیلگوں سبزے میں لپٹی ہوئی تھی ۔دور بہت دور اس پیشانی پر یہ آگ کا شعلہ ۔نصف سورج کی روپہلی دھاریں چند بار مشرق کی پہنائیوں میں ڈوب ڈوب کر اُبھریں جیسے آسمان کے سینے پر آنے سے قبل مقدس نشان کو تعظیم دیتی ہوں ۔

اچانک جیسے محو تماشا لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی ۔تیزی سے بے شمار سروں کے رُخ مغرب کی جانب مُڑے ۔برقی انداز میں ہم نے بھی گردنوں کو گھمایا ۔

''میرے خدایا! کسقدر عجیب و غریب منظر مجسم ہو کر آنکھوں کے سامنے تھا۔

پہاڑ کا گہرا مخروطی سایہ عمودی ہو کر سر سبز زمین سے چوٹی تک پھیلا ہوا تھا ۔اور چند ساعتوں بعد غائب بھی ہو گیا ۔میرا سانس سینے میں کہیں اٹکا ہوا تھا۔ میرے وجود کی ساری حسیّات اس جادوئی اظہار پر عجیب سی سنسناہٹ کا شکار تھیں ۔

پھر جیسے کسی جذب کے عالم میں میں نے اوپر دیکھا۔ رعب حسن سے آنسو رخساروں پر بہہ گئے اور جیسے میں نے سرگوشی میں کہا ہو ۔

''اِس درجہ کمال کی فنکاریوں اور شعبدہ بازیوں کا اظہار تیرے علاوہ کون کرسکتا ہے ۔یہ توفیق تجھے ہی نصیب ہے ۔''

فضا میں گھنٹیاں بج اُٹھیں ۔سدھو سدھو ۔سدھو سینکڑوں کیا ہزاروں زائرین کی آوازیں اپنے اُس خدا کے حضور مقدس گیت گانے لگیں ۔جو تخلیق کائنات کے وقت سے ہر روز، ہر صبح، یہ معجزہ زمین کے باسیوں کو دکھاتا اور اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے ۔

قدرے آرام دہ جگہ دیکھ کر ہم بیٹھ گئیں ۔اپنی ٹانگوں کو باری باری پیار کر انکی مُٹھی چاپی شروع کی ۔آدھ گھنٹہ کی اس مار و ماری سے پتھر کیطرح اُنکے اکڑاؤ میں قدرے نرمی پیدا ہوئی ۔

پھر سری لنکا کے جنوب مشرقی ساحلوں کے شہر پٹوول (Pottuvil) کی سیام نکایا (بدھ مذہب میں اُونچی ذات) کا ایک خاندان ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا ۔دو بچے اور دو بڑے ۔بڑوں کے چہروں پر چھائی گھٹا توے کی کالک جیسی گہری تھی ۔چھوٹوں پر سرسوں کے پھولوں جیسی آمیزش نے سیاہی کا ہاتھ ہولا کر دیا تھا۔ دونوں بچے اور انکی ماں ڈاکٹر تھے ۔ باپ تاریخ میں پی ایچ ڈی تھا اور یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ Mr. T.B Galpothawela اُف کس قدر مشکل نام تھا۔ میں نے اُنکی طرف سے دیئے گئے کارڈ کو چند بار پڑھتے ہوئے سوچا ۔

دفعتاً مرد نے بڑی متانت اور حلیمی سے کہا۔

''پاکستان دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا حامل ملک ہے۔آپ لوگ بدھ مت کی گندھارا تہذیب کے بھی امین ہیں۔''

پر جب بیٹا بولا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے سڑاکے سے میری پشت پر چابک ماری ہو۔

''مسلمان اتنے متعصب، تنگ نظر اور ضدی کیوں ہیں؟ طالبان نے بامیان میں ہمارے بُدھا کے مجسمے کے ساتھ کیا کیا۔پوری دنیا چیخ اُٹھی۔پر انہوں نے کسی کی سُنی؟''

''دنیا کی سُپر طاقتوں کے مفادات کی کشمکش نے اُنہیں بھوک، ناداری، معذوری، دربدری، بدامنی اور بیرونی واندرونی جنگ کے تحفے دیئے۔اسوقت دُنیا کی آنکھیں بند تھیں جب انکے کٹے پھٹے اعضاء والے بچے بھوک اور دوائیوں کے لیے بلبلاتے تھے۔پر جب انہوں نے مجسمے توڑنا شروع کیئے تو دنیا کو تہذیبی ورثے کی تباہی نظر آگئی۔''

شاید میرے لہجے میں تلخی تھی اور یقیناً چہرہ بھی سُرخ ہوگا۔مرد نے فوراً ''سوری'' کہتے ہوئے مجھے خاموش کروادیا اور خود بولنے لگا۔

''میں متفق ہوں آپ سے۔تاریخ میرا مضمون ہے اور میں نے اسکی مبادیات کا مطالعہ ہمیشہ غیر جانبداری سے کیا ہے۔مسلمانوں نے غیر مُسلم لوگوں کی مذہبی املاک کو نقصان پہنچانے کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔افغانستان مسلمان خلیفہ عمر کے زمانے میں فتح ہوا تھا۔تب گوتم بدھ کے کسی مجسمے کو ہرگز نہیں چھیڑا گیا تھا اور کسی خانقاہ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچایا گیا۔لیکن اسے بھی تسلیم کریں کہ مسلمان فطرتاً جنگجو اور تشدد پسند ہیں۔''

''اسوقت تو پوری دنیا میں مسلمان مظلوم ہیں۔امریکہ عراق میں کیا کر رہا ہے۔اسکا چھ ہزار سالہ علمی تاریخی اور تہذیبی ورثہ بھسم کر دیا گیا۔میوزیم اور لائبریریوں کو آگ لگا دی گئی۔اسکے پھول سے بچے کس بربریت اور ظلم کا شکار ہوئے اسکا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

آپ برطانوی صحافی رابرٹ فسک کی رپورٹ پڑھیں تو انسان کی آنکھوں سے آنسو نہیں خون ٹپکتا ہے۔بدھا کے مجسمے پر واویلا کرنے والا امریکہ کتنا بڑا فراڈ ہے؟ اسکے قول وفعل میں کتنا تضاد ہے۔اسکے کتنے چہرے ہیں؟

مجھے بھی یقیناً دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع ملا تھا۔

بڑی دلچسپ، بہت معلوماتی اور بنسوڑ قسم کی نشست تھی۔ لطف آیا۔ بقیہ پروگرام ہم نے انکے ساتھ نتھی کیا کہ علم دوست گھرانہ تھا۔ کچھ ہمارے ہاتھ پلے آسکتا تھا۔

مقدس عمارت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مہر النساء بڑبڑائے بغیر نہ رہ سکی۔

''لگتا ہے یہ تو گئے گوڈوں میں بیٹھ جائیں گی۔''

دروازے کی کشادگی بس گزارہ تھی۔ خلقت زیادہ تھی۔ ابھی مقام شکر تھا کہ نظم وضبط والے لوگوں کے درمیان تھے وگرنہ پاؤں کا کچلا جانا تو یقینی تھا۔ میں احاطے کی دیوار کے ساتھ ٹک گئی تھی کہ میرے سامنے مقدس جگہ تک پہنچنے کے لیے پھر سیڑھیاں تھیں۔ دیوار پہاڑی سٹائل اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ ذرا سا سانس درست ہوا تو سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ پھر ٹرن آئی۔ سیڑھیوں کا رُخ بدلا۔ وقت کا تو پتہ نہیں پر ہجوم ضرور چیونٹی کی سی رفتار سے بڑھ رہا تھا۔ ماحول ہی اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ اسی طرح کی زور آزمائی کروں کہنیاں ماروں، دھکے دوں اور وہ سب حربے آزماؤں جو میں نے حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے جائز کیے تھے اور نتیجے میں افریکن حبشنوں سے جواب بھی موصول کیے تھے۔

اب کھڑے ہیں اور بے قراری عروج پر ہے۔ بارے خدا تھوڑی سی جگہ ملی۔ تانکا جھانکی نے تھوڑا سا منظر آشکارا کیا۔ چھوٹا سا حجرہ نما کمرہ، داہنی سمت لمبی سی کھڑکی، خاکستری سلیب کے ساتھ پیلی جھالروں والا قدرے شوخ گلابی رنگ کا ریشمی غلاف جس پر کڑھائی سے بیر کڑھا ہوا تھا۔ لوگ جھکتے سلیب پر سر رکھتے، غلاف کو چھوتے اور ہٹ جاتے۔

یہ تو سراسر تشنگی والا کام تھا۔ کنوئیں پر پہنچ کر پیاسا رہنے والی بات تھی۔ اتنی تکلیف اتنا کشٹ ضائع کرنے والا معاملہ تھا جو بہر حال قبول نہیں تھا۔ جی داری سے میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور آواز بلند کی۔

''بہت دور سے آئے ہیں اس غلاف کے نیچے جو کچھ ہے اسکا دیدار کروائیں وگرنہ سفر اور محنت ضائع ہو جائے گی۔''

کیسری چادر میں لپٹا بدھ راہب ذرا فاصلے پر بیٹھا اُٹھا۔ سجدے کرنے کے عمل میں تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ لائن کی حرکت جامد ہو گئی اور بدھ مونک مجھے دیکھتا تھا کہ میں کیا کہتی ہوں کہ اس کے لیے زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم والا معاملہ تھا۔

پھر شاید مسٹر ٹی۔ بی ویلا کی تامل چلی یا سنہالی۔ مونک نے سمجھا۔ پہاڑی اینٹوں سے بنی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر اُس نے دھیرے سے غلاف ہٹا دیا۔ ایک بڑے سے

پیر کا نشان جس کے گرداگرد ڈیڑھ دوانچ پتھر کے حاشیے نے اُسے نمایاں اور محفوظ کر رکھا تھا۔ گہرا خاکستری نقش۔ جیسے بارش سے گیلی زمین میں دھنسا ہوا کسی کے پاؤں کا نشان۔ لوگ دیوانہ وار جھکے ہاتھ پھیرنے، مٹی کے لمس سے انگلیوں کی پوروں کو مس کرنے اور انہیں ہونٹوں اور ماتھے پر لگانے کے لیے۔

باقی سب لوگوں کی طرح ویلا نے بھی وہی کچھ کیا تھا۔ اُس حجرہ نما دروازے کی چوکھٹ کے ایک طرف کھڑی جب میں اُس سے سُنتی تھی کہ زیارت کے موسم کے آغاز کی بہت سی رسومات میں سے ایک اہم اس مقدس نقش کا غسل بھی ہے۔ بدھ راہب کانسی کی گاگر میں عطر بیز پانیوں سے اسے دھوتے اور اس پر غلاف چڑھاتے ہیں۔

تب ایسے ہی یہ سوچ در آئی تھی۔ دنیا کے مذاہب کی کتنی باتیں مشترک ہیں۔ اور انسان بھی کیسے کیسے اعتقادات میں جکڑے قلبی سکون اور اغراض کے لیے یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اوپر والا تو یونہی محبتوں کے اظہار میں فیــــاضیـوں کا دعویدار ہے۔ نیچے والے کتنے بے بس، مجبور و محکوم، تیرے لکھے ہوئے کو بھوگتے ہوئے تیری یاد میں کرلاتے پھرتے ہیں۔ اور تو جب چاہے جس کی چاہے رسی دراز کر دے اور جسے چاہے نتھ ڈال دے اور جسے چاہے نواز دے۔ بڑے رنگ ہیں تیرے مولا۔

تبرکات کا کمرہ بدھا کی مورتیوں، رقص کرتی دیوتا کے حضور جُھکی گوپیوں اور ہیمس دیوتا کی تصویروں سے سجا ہوا تھا۔ باہر خنکی تھی پر کمرے میں گھٹن تھی۔ سب سے خوبصورت ترین چیز وہ پنجرہ نما ڈبہ یا صندوقچہ قسم کی چیز تھی جس کے گرداگرد لگی سفید خوبصورت ڈیزائن دار جالی میں سے بُدھا کا متبرک آبنوسی جسمانی ڈھانچہ، بدھا کی یادگار اور ہیمس دیوتا کا سفید صندل کا تقریباً ایک فٹ اونچا مجسمہ فوراً توجہ کھینچتا تھا۔

ویلا سے ہی یہ جاننے کا موقع ملا تھا کہ زیارت کا موسم شروع ہونے سے ایک دن قبل باقاعدہ تقریب کی صورت میں اسے پورے مذہبی لوازمات کے ساتھ انتہائی ادب و احترام سے چیف مونک اسے چوٹی پر لاتا اور یہاں سجاتا ہے۔ زیارتی سیزن کے اختتام پر اسے سری پاڈا کے ٹمپل میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس مجسمے کے بارے میں روایت ہے کہ اسے شہنشاہ پرا کرانے بنوایا تھا۔

پتہ نہیں کمرے میں آکسیجن کم ہو گئی تھی یا میرے خون کی سرکولیشن کا سارا رُخ میرے سر کی طرف مڑ گیا تھا۔ گھبراہٹ سی طاری تھی جس نے تھوڑا سا خوف زدہ بھی کر دیا

تھا۔حیاتی کا بھلا کیا بھروسہ۔اس سانس کی آؤنی جاؤنی پر ہی تو سب کچھ کھڑا ہے۔

چوٹی پر فی الوقع جنگل میں منگل والا محاورہ کس قدر سچا لگ رہا تھا۔چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی میں اس حصے میں آکر کونے میں بنی سیڑھیوں کے پوڈوں میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔اُسکے داہنے ہاتھ سنگل راڈ کی ریلنگ سے جگہ کی حد بندی کی ہوئی تھی۔سامنے بڑی پہاڑی کی اینٹ کی دیوار اور بائیں ہاتھ چپاتی کی طرح گول ایک بڑے سے پتھر پر لوہے کی تاروں سے گولائی میں بنا ہوا دائرہ نما جنگلا دھرا تھا جس میں اگر آگ کے شعلے لپکتے تھے تو کچے کوئلے سے اُٹھتا دھواں اور لوبان و اگربتیوں کی خوشبو بھی سارے میں پھیلی تھی۔

سونا لٹاتی دھوپ میں نہاتے ہوئے یکسر خالی الذہن ہو کر دائرے میں کھڑے دھوتیوں اور پینٹوں میں جکڑے مردوں اور سکرٹوں کے نیچے ننگی آبنوسی ٹانگوں، چہروں اور انکی حرکات کا مشاہدہ کرنا کس قدر دلچسپ شغل تھا۔شعلوں کے جھلملاتے عکس کے پیچھے میں نے کچھ متحرک لب بھی دیکھے۔شاید دعاؤں یا مناجاتوں کا ورد ہو رہا ہو۔

دفعتاً ایک بے حد سریلی چہکار کسی راکٹ کے چھوڑے ہوئے دھوئیں کی لمبی لکیر کی طرح میرے سر پر تنے آسمان کے سینے پر پھیلتی ہوئی کہیں دور جا رہی تھی۔اس اجنبی آسمان پر blue bird کی مانوس سی چہکار نے مجھے نہال سا کر دیا۔

چند لمحوں تک میں مُنہ کھولے آسمان کو ہی تکتی رہی تھی۔پھر نظروں کو نیچے ترائیوں میں لے گئی۔وہاں سے پلٹی تو مہرالنساء کہہ رہی تھی۔

''کیا گندی عادت ہے۔بغیر بتائے بھاگی پھرتی ہو۔''

اُسوقت انسانی زندگی کے ساتھ لپٹی ہوئی بے حد اہم ضرورتیں تنگ کر رہی تھیں۔پر میں ڈھیٹ بنی بیٹھی فطرت سے دل لُبھا رہی تھی۔اُسکے پیدا کیے انسانوں کا مشاہدہ کر رہی تھی۔پھر پتہ نہیں کہاں سے یہ سوچ در آئی تھی۔

دنیا کتنے رنگا رنگ مذاہب کے گرد گھوم رہی ہے۔لوگوں نے کیسے زندگیوں کو عقیدوں اور اعتقادات کی سانوں پر چڑھا رکھا ہے۔

مذاہب کے نام پر کیسی کیسی خوفناک لڑائیاں اور جنگ و جدل ہوئے۔انسانوں نے انسانوں کو کیسے کیسے تہ تیغ کیا اور کر رہے ہیں۔ہر مذہب کے لوگ کہیں نہ کہیں دوسرے مذہب والے لوگوں کو Paganism کا طعنہ مارتے اور انہیں مارنا مذہبی فریضہ سمجھتے رہے اور ابھی بھی سمجھ رہے ہیں بلکہ اس پر شدّ و مدّ سے عمل پیرا بھی ہیں۔

صلیبی جنگوں کے منظر، مسلمانوں میں مذہب بمقابلہ مذہب کے خوفناک سلسلے، یہودیت اور عیسائیت کے خون ریز معرکے، کمیونزم کی سفا کانہ تباہ کاریاں انسانیت کے نام پر وہ بدنما دھبے ہیں جن سے کوئی سبق اور عبرت حاصل نہیں کرتا ۔ بے چارے سادہ لوح مسلمان تو اسی زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ اُنکا دین ہی خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

سچی بات ہے مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خدا کے نزدیک سبھی مذاہب بہترین ہیں ۔پسندیدہ ہیں اور اس کی منشا اِن سب کو قائم دائم رکھنے کی ہے۔

مولانا رومی جب یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمانوں میں کیا کروں ۔ میں نہ ہندو ہوں نہ یہودی اور نہ ہی تمہاری طرح مسلمان ۔ میں محبت کا عاشق ہوں میری محبت ہر عقیدے پر غالب ہے۔

مشہور ہندو فلسفی دیویکانند خدا کی عالمگیریت کا درس دیتا ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم سب لوگ اپنے اپنے برتن لے کر کسی جھیل میں پانی بھرنے جاتے ہیں۔ کسی کے پاس لُٹیا ہے تو کسی کے پاس جگ ہے کسی کے پاس بالٹی ہے۔ جب ہم اپنے اپنے برتن بھر لیتے ہیں تو پانی قدرتی طور پر اسی برتن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح مذہب ہے ۔خدا بھی اسی پانی کی طرح ہے جو مختلف برتنوں میں بھر کر اسکی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن وہ ایک ہے۔ سکھ مذہب میں گورو گوبند کا بھی یہی درس ہے کہ خدا اسی طرح مندر میں موجود ہے جس طرح وہ مسجد میں موجود ہے۔

پھر میں اپنی ان بے تکی سی سوچوں کو مہرالنساء کے سامنے اُگل بیٹھی ۔ جس نے میری پُشت پر ایک زوردار جھانپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''بند کرو یہ بکواس ۔اُٹھو، وہ کام کرو جن کی اسوقت ضرورت ہے۔''

باب نمبر:۱۰ کولیو

۱۔ کولمبو بلند و بالا دلکش جدید و قدیم عمارتوں کے اُگے جنگل میں تیز تیز سانسیں لیتا تھا۔

۲۔ پاس ڈالر تھے، سری لنکن روپے تھے۔ ہوٹل کی بھری پری عمارت تھی مگر ہم بھوکے تھے۔

کولمبو

گہرے سبز پردے کے تلے
سانس لیتی سراندیب کی زمین
سُورج فطرت کی پچی کاری پر
خراج تحسین پیش کرتا ہے
وہ اپنی دھرتی پر انسان اور چرند پرند کو
محبت اور آشتی سے رہنے کا کہتی ہے
گرچہ جنگوں نے اس کی خوبصورتی کو گہنایا
اس کے دودھ اور شہد میں خوف گھولا
پھر بھی اس کا دور اور نزدیکی افقی حسن
مسلسل یاد دلاتا ہے
کہ آنکھ کی پتلی میں ٹھہرا ہوا ڈر
ایک دن ختم ہو جائے گا (ڈیلانتا گونوا ردانا)

صدیوں سے اس کے ساحلوں پر اُترنے والے لوگوں اور اس کی اپنی زمین کے باسیوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیسے کیسے نرالے انداز میں کیا۔

اس وقت جب دھوپ کا رنگ سونے رنگے قہوے جیسا ہو گیا ہے اور درختوں کے سائے لمبوتری صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ہم اس زمین کے مرکزی شہر کے مضافات سے گزر رہے ہیں۔

میری دائیں بائیں کی مسلسل نظر بازی نے مجھے تیسری کیا دوسری دنیا کے بڑے اور قابل ذکر شہروں کے مضافات کی یاد دلائی ہے۔ منظروں کی یکسانیت نے ماضی کے کچھ دریچے کھول دیئے ہیں۔ وہی بے ترتیبی اور بدنظمی کا پھیلاؤ، کہیں آبادی کی شکل میں اور کہیں

چھوٹے بڑے صنعتی یونٹوں کی صورت۔ غربت کی جھلکیاں بھی نمایاں تھیں۔ لیکن مجھے انہیں بند کرنا پڑا ہے۔

"کہ یہ کولمبو ہے۔" میں نے اپنے گائیڈ کی آواز کو سُنا ہے۔

شہر تو صرف چھ صدیاں پرانا ہے جو موجودہ سری لنکا کا نہ صرف دارالخلافہ ہے بلکہ کمرشل مرکز، مختلف نسلوں اور تہذیبوں کا دلکش کلچر بھی ہے۔ پرتگیزوں نے سولہویں صدی کے آغاز سے اس کے نقوش سنوارنے شروع کر دیئے تھے۔ ڈچ اور انگریزوں نے بھی اس میں اپنا حصّہ ڈالا۔ اور شہر کا چہرہ مہرہ سچی بات ہے اتنا دلکش اور دیدہ زیب بنا دیا کہ آنکھ جھپکنی مشکل ہو رہی تھی۔

اس کے یہ سارے رنگ گاڑی میں بیٹھے دیکھے جا رہے تھے۔ بلند و بالا، دلکش، جدید اور قدیم عمارتوں کا جنگل اُگا ہوا تھا۔ جسمیں شہر تیز تیز سانسیں لیتا تھا۔

ہماری جانب سے بہت ساری شرائط کا بار بار اعادہ ہو رہا تھا۔ ہوٹل سستا اور اچھا ہو۔ لوکیشن بہترین ہونی چاہیے۔ ساحل سمندر کے آس پاس ہو تو کیا ہی بات؟

مسٹر جسٹن چپ چاپ گاڑی سڑکوں پر دوڑاتے جاتے تھے۔ تھری اور فور سٹار ہوٹلوں پر رُکتے۔ ہماری طرف سے ناں پر آگے چل پڑتے۔ کچھ بولے بغیر، کچھ لعن طعن کیے بغیر۔

تھکاوٹ کی شدت اپنی جگہ کہ صبح سے گاڑی میں بیٹھے تھے۔ کوجگہ جگہ اُترنا چڑھنا لگا رہا۔ مسٹر جسٹن کی خاموشی کہ شرم کرو کچھ اور چہرے کے تاثرات ضرور ایک پیغام سا دے رہے تھے کہ اب کیا میرا ملیدہ کر دینا ہے۔

میں نے اِس سب کو قطعی نظر انداز کر دیا کہ میں اس وقت بڑی لالچی ہو رہی تھی۔ میرے لیے اِس بہتی گنگا میں نہانا نہ سہی پر ہاتھ دھونا تو ضروری تھا۔ اسی لیے کیا حرج تھا کہ تھوڑی سی ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ ہو جائے۔ آخر اس کے عوض ہمیں کچھ عنایت ہی ہو رہا تھا۔

ہم کولمبو سے متعارف ہو رہے تھے۔ اس کا نیا، اس کا پرانا حسن دونوں اپنی اپنی جگہ بے حد متاثر کن تھے۔ کہ شہر کا ابتدائی تعارف تو اسی انداز میں ہونا چاہیے۔ تاہم مہرالنساء کو میرے جذبات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے بے حد اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"اس وقت میرا بستر پر لم لیٹ ہونے کو جی چاہتا ہے۔" اُس کے لہجے میں ہلکی سی

تلخی بھی شاید اسی لیے تھی۔

''مسٹر جسٹن آپ کیا پہلی بار کولمبو آئے ہیں جانتے نہیں کہ اوسط قسم کے ہوٹل کہاں اور کونسے ہیں؟ دو گھنٹے سے چکریاں کاٹ رہے ہیں۔''

اور وہ بڑے دھیمے لہجے میں بولے تھے۔

''ہمارے گاہک زیادہ یورپی لوگ ہوتے ہیں۔وہ میریٹ Marriott، تاج سمودرہ Saamudra، کولمبو ہلٹن، ہولی ڈے ان اور ہوٹل لنکا اوبرائے میں ٹھہرنا پسند کرتے ہیں۔یہ سب پانچ اور چھ ستارہ ہوٹل ہیں۔''

بھئی بڑا اصلح جو قسم کا آدمی تھا۔کوئی تیز طرار ہوتا تو پھٹ سے ہمارے منہ پر کہتا۔

''تم جیسی چڑ قناتی عورتوں نے وختہ ڈالا ہوا ہے۔تمہاری پیش کردہ شرائط پر پورا اُترتا ہوٹل تلاش کرنا کتنا مشکل ہورہا ہے؟ اب تم ہو بھی عورتیں۔مرد ہوتے تو کہیں بھی پھینک دیتا۔تم ادھیڑ عمر ماں جیسی عورتوں کا تو لحاظ کرنا پڑتا ہے۔یوں بھی پانچ دن تم لوگوں کے ساتھ گزارے ہیں۔ہم مشرقی لوگوں کے دیدوں میں ابھی شرم ولحاظ کا پانی باقی ہے۔اور ہم اپنی مشرقی روایات کا بہت احترام کرتے ہیں۔

خدا کا شکر ہی تھا کہ کوششیں بارآور ہوئیں۔وائی ڈبلیو سی اے کی دومنزلہ عمارت اچھی خوبصورت تھی۔محل وقوع بہت موزوں تھا۔دو چھلانگیں مارو تو سمندر میں جا اُترو۔نظاروں سے دل بہلاؤ۔سیر کرو غوطے بھی مارے جاسکتے تھے اور اگر ڈوبنے کو جی چاہے تو اس کی بھی سہولت مہیا تھی۔گلی بہت کشادہ تھی۔مین سڑک کے ساتھ زمباوے کا سفارت خانہ تھا۔آتے جاتے اُن سے شناسائی کی جاسکتی تھی۔

مسٹر جسٹن پریرا کو ہم نے محبت سے چھوٹے موٹے انعام اور معافی شافی کی عرضی کے ساتھ رُخصت کیا۔

کمرہ اوپر کی منزل میں تھا۔کھلا ڈلا سا۔بستر آرام دہ۔لیٹے تو پل بھی نہیں لگا تھا دوسری دنیا میں پہنچنے پر۔جب آنکھ کھلی پردے ہٹائے تو جھٹ پٹے کا ساسماں تھا۔بھوک لگ رہی تھی۔چائے کی بھی طلب تھی۔مہر انساء بڑی نڈھال سی تھی۔اب ہمت مجھے ہی کرنی تھی۔منہ پر چھینٹے مارے تھوڑا سا حلیہ دُرست کیا اور نیچے اُتری۔

سیڑھیوں کے ساتھ ہی ویٹنگ لاؤنج دوسری طرف ہال نمائی وی روم اور ملحقہ چھوٹا سا آفس تھا۔وہیں جا کر میں نے مُدّعا بیان کیا۔کوراچٹا بے نیازی اور روکھے پن سے

لبالب بھرا جواب تھا۔

''آپ لسٹ پر نہیں۔آج تو نہ چائے ملے گی اور نہ ہی کھانا۔''

''یہاں کیا ناپ تول کر کھانا پکتا ہے''۔میں نے یہ سوچا۔مگر کہا نہیں اور جب کچھ کہا تو لہجے میں مسکینی تھی۔عاجزی تھی۔

''کوئی کنٹین نہیں ہے یہاں۔''

اُف یہ بتانا مشکل ہے کہ اُدھیڑ عمری عورت کے چہرے پر میرے سوال نے کیسی رعونت بکھیری۔ہونٹوں نے تو کچھ کہنا یا کوئی وضاحت دینے کی زحمت ہی نہ کی۔نہایت ناپسندیدہ سے جذبات کا اظہار فقط آنکھوں نے ہی کیا۔میں نے بھی دل میں کہا۔

''بھاڑ میں جاؤ۔کہیں آس پاس ریسٹورنٹ تو ہوں گے ہی نا۔کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائیگا۔

ابھی میں نے کمرے سے باہر آکر بیرونی گیٹ کی طرف رُخ پھیرا ہی تھا کہ ایک بے حد خوبصورت آواز نے مجھے پلٹنے، رکنے، دیکھنے اور سُننے کے لیے کہا۔ٹی وی پر کوئی گا رہا تھا۔وہ گیت جسے میں نے پانچ دنوں میں متعدد بار سُنا تھا۔جس کا ترجمہ جانی تھی۔ایک حساس شاعر کا گیت۔دل کو اداس کرنے والی آواز میں

کتنی تنہا اور اُداس سی تھی میں\
تمہارا میری زندگی میں آنا\
کبھی نہ بھولنے والی یادوں کا خوبصورت تحفہ\
تمہی نے مجھے دیا تھا\
پھر تم نے مجھے چھوڑ دیا\
میں نے چاہا میرے وہ خواب\
جو صرف تمہارے لیے تھے\
اُس آسمان پر لکھ دوں\
جو تم پر سایہ فگن ہے\
آخر میں یہ کیوں چاہتی ہوں\
کہ کبھی وہ وقت آئے\
جب تم میری آنکھوں کو صرف

ایک بار پھر دیکھنے کی تمنا کرو

باہر نکلی ۔گلی خوفناک سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی ۔مین سڑک پر پہنچی ۔سامنے تاحد نظر پھیلا سیاہی مائل سمندر تھا۔ہواؤں کے زوردار ریلے تھے۔ساحل پر بنے ٹریک پر اِکا دُکا لوگوں کی چہل قدمی تھی۔بڑی کشادہ سڑک اوراس پر بنی دکانیں بڑی خاموش سی تھیں۔قریب کی دو تین دکانوں میں گئی ۔پتہ چلا آفسز ہیں۔پوچھنے پر بھی کسی نے راہنمائی نہ کی۔میں نے گردو پیش کا جائزہ لیتے ہوئے ذرا مضطرب سے لہجے میں اپنے آپ سے کہا تھا۔

''میرے اللہ یہ ہم کہاں آگئے ہیں؟''اب کیا کروں۔واپس آکر پھر لاؤنج سے ملحقہ آفس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔وہی چہرہ پھر سامنے تھا۔میرے لہجے میں مسکینی تھی۔عاجزی تھی۔میں نے اپنی مشکل سے اُسے آگاہ کیا۔وہاں وہی کچھ تھا دل کو جلانے والا اصول اور قواعد کا سبق۔

میرے لیے یہ امر مقام حیرت تھا کہ اس عورت کے اندر کیسا پتھر دل ہے۔کیا اِس اندھی کو اس پردیسن کے چہرے پر پھیلے بھوک کے تاثرات نہیں دکھ رہے ہیں۔

کمرے میں آکر میں نے مہر انساء کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

''پلیز کچھ کرو۔میرے اندر تو اٹھنے کی ہمت نہیں ہے۔''

میں بالکونی میں آکر کھڑی ہوگئی۔کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔گلی بہت دور تک جاتی تھی۔آگے جاکر دائیں بائیں تقسیم ہوتی تھی۔سامنے ایک جیسے ڈیزائن کے دو بڑے خوبصورت سے گھر تھے۔

ایک گھر میں اُگے کیلے، پپیتے اور آم کے پیڑ مجھے نظر آئے تھے۔چھوٹا سا لان بھی تھا۔تاریکی دھیرے دھیرے اُتر رہی تھی۔سٹریٹ لائٹس جل اٹھی تھیں۔دفعتاً میں نے ایک گاڑی کو عین اپنے سامنے والے گھر کے آگے رکتے ،سیاہ عبایہ میں لپٹی خاتون کو اُترتے بیل بجاتے ،دروازہ کھلتے اور اندر جاتے دیکھا۔سیاہ عبایہ نے یکدم میرے سارے وجود میں سنسنی کی سی کیفیت پیدا کردی۔مجھے مانوس سی طمانیت کا احساس ہوا۔

ابھی میں قیاس آرائیوں کی گھمن گھیریوں میں تھی کہ خاتون باہر آئی۔گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی فراٹے بھرتی یہ جا وہ جا۔میں فوراً نیچے اُتری اور پل بھر میں اُسی گیٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔گھر اگر کسی مسلمان کا نہیں بھی ہے تب بھی یہاں آنے والے خاتون مسلمان تھی۔مکینوں کی سوچ شاید مثبت ہی ہو۔عیسائی کی تو پڑھ بیٹھی تھی۔

میں نے بیل کی بجائے چھوٹے دروازے کو دھکا دیا جو کُھل گیا۔اندر داخل ہوئی۔دائیں بائیں دیکھتی اُس سمت بڑھنے لگی جدھر سے کچھ کھٹ پٹ کی سی آوازیں آرہی تھیں۔یہ یقیناً باورچی خانہ تھا کہ کھانے کی ملی جلی مخصوص خوشبو اسی سمت سے آرہی تھی۔دروازہ کھلا تھا اور کمرے کی کرسی زمین سے تین پوڑے اونچی تھی۔سیڑھیاں چڑھ کر عین دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔

جدید وضع کا کچن میرے سامنے تھا۔ایک خاتون سلیب پر دھری پرات میں کچھ گوندھ رہی تھی۔سنک میں برتن تھے اور پائپ سے نکلتا پانی زور شور سے برتنوں پر گرتا ایک عجیب سے شور کو جنم دے رہا تھا۔قدرے گہری سانولی رنگت والی خاتون نے مٹیالے سر سبز رنگ کا اے ٹائپ کرتا پاجاما پہن رکھا تھا۔جانے کس دنیا میں گم تھی۔

میں نے قدرے اونچی آواز میں ''پلیز میری بات سُنیں'' کہا۔

کوئی اٹھائیس تیس سال کی موٹے موٹے نقوش کی حامل عورت نے اپنا چہرہ اٹھایا اور مجھے حیرت سے دیکھا۔میں نے جلدی جلدی تھوک نگلتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ چہرہ بڑا سپاٹ سا محسوس ہوا تھا۔

''میں پاکستانی ہوں۔سامنے وائی ڈبلیو سی اے میں ٹھہری ہوں۔''

خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اُسنے اندر آنے اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

آٹا گوندھ کر اُسے دوسری طرف کی سلیب پر رکھی مشین میں ڈالا۔پل جھپکتے میں موٹی لمبی سویوں کی ایک آبشار سی نکلی۔اُسنے پتیلے پر دھری چھلنی میں انہیں ڈالا۔واہ نوڈلز تیار تھیں۔

میں نے بیٹھنے کے ساتھ ہی اپنا مدّعا بتا دیا تھا کہ ہم بھوکے ہیں اور میں کھانے کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔اگر وہ گھر والی ہے تب بھی اِس درخواست کو پذیرائی دے اور اگر ملازمہ ہے تو مالکن کو بتائے۔معلوم ہوا تھا کہ وہ گھر والی ہی ہے۔

اُس نے دو سموسے فریج میں سے نکالے۔مُنے مُنے سے۔انہیں اوون میں گرم کیا اور چھوٹی سی پلیٹ میں ذرا سی ٹماٹو کیچپ کے ساتھ میرے سامنے رکھ دیئے۔

جی تو چاہا تھا پلیٹ اٹھا کر اِس چھینی پھڈ کر کے منہ پہ ماروں ۔اُف انسان اتنا ذلیل ہوسکتا ہے۔دو سموسیاں۔یہ حرام زادہ پیٹ بڑا ذلیل تھا۔دہائیاں دے رہا تھا کہ مرنے جارہا ہوں۔ایک سموسہ اٹھا کر منہ میں ڈالا جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ جانے والی بات تھی۔حلق تالو بھی گیلا نہ ہوا تھا۔

اُس نے فرج سے قیمہ نکالا۔آلو قیمہ کا سالن۔جب وہ سالن گرم کرتی تھی مجھے پتہ چلا تھا کہ اُسکی ساس کراچی سے ہے۔یعنی پاکستانی ہے۔چار بیٹوں کی ماں۔بڑے دو بیٹوں نے یہاں گارمنٹس کا کام کیا جو بہت نفع بخش ثابت ہوا۔پوری فیملی یہاں شفٹ ہوگئی۔وہ سب سے چھوٹے بیٹے کی بیوی ہے۔ساس ساتھ والے گھر میں رہتی ہے۔بڑے دونوں بیٹوں کے گھر عقبی گلی میں ہیں۔وہ خود تامل ہندو تھی۔مسلمان ہوئی ہے۔

"وہ نام کی مسلمان نہیں۔اسلام کا اُس نے بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور دل سے اسے قبول کیا ہے۔" یہ بات بڑے فخریہ لہجے میں کہی گئی تھی۔

میں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کرنے والی سے اِس عورت سے ڈھیٹ بن کر کہا۔کہ وہ مجھے تھوڑا سا کھانا دے کیونکہ ہم پردیسی ہیں اور بھوکے بھی ہیں اور اسلام میں بھوکوں کو کھانا کھلانے کا بہت ثواب ہے۔

اُس نے گتے کی ایک چھوٹی سی پلیٹ نکالی۔اس میں دو جگہ دو نوالوں کی مار جتنی نوڈلز رکھیں۔اُن پر تھوڑا تھوڑا قیمہ رکھا اور وہ میرے ہاتھ میں تھما دی۔

"کیا کہنے ہیں تمہارے فہم اسلام کے۔"میرا اندر مسلسل نکتہ چین تھا۔

ابھی میں نے شکریہ کہتے ہوئے ایک قدم اٹھایا ہی تھا جب دروازے میں ایک باریش نوجوان سر پر ٹوپی رکھے کچن کی سیڑھیاں چڑھتا نظر آیا۔میں نے فوراً اپنا تعارف کرواتے ہوئے اُسے یہ بتایا کہ میں ان کے ہاں تھوڑا سا کھانا مانگنے آئی تھی۔اُس نے میرے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کو دیکھا اور مطمئن نظروں سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔آپ آئیں۔یہ ہمارے لیئے باعث مسرت ہے۔میری والدہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں چلی جاتی ہیں ورنہ میں آپ کو اُن سے ملاتا۔"

وہ پاکستانی تھا۔وہ مسلمان تھا۔غالباً نماز پڑھ کر آرہا تھا۔اور اس نے میرے ہاتھ میں پلیٹ اور اس میں رکھا کھانا دیکھا تھا۔دو بندوں کا کھانا جو ہم جیسے لوگوں کے تین

نوالوں کی مار تھا۔

اسلام کے ایک پیروکار کے گھر سے میں باہر آئی اور اپنی عارضی رہائش گاہ میں داخل ہوئی جہاں یسوع مسیح کی ایک پرستار نے قیمتاً بھی کھانا دینے سے انکار کر دیا تھا۔

مہر النساء سے میں نے کہا۔

''بس سویوں کی ایک ایک تار اٹھاؤ اور اسے چٹکی بھر قیمے کے ساتھ میں منہ میں ڈالو اور دیر تک چباتی رہو۔ایسا ہی چند تاروں کے ساتھ میں کرتی ہوں۔دو گلاس پانی کے چڑھا جاؤ۔اللہ مالک ہے رات گزر ہی جائے گی۔''

جب بستر پر لیٹی زمانوں پہلے کا ایک بھولا بسرا واقعہ یادوں کی تہوں سے سر سراتا ہوا باہر آیا۔غالباً 1953 یا 54 کی بات تھی۔میری دادی فیصل آباد اس وقت لائل پور کی ایک تحصیل سمندری سے ہمارے پاس لاہور چند دن کیلئے آئی تھیں۔جب اُنکی واپسی ہوئی۔گرمائی تعطیلات کی وجہ سے میری والدہ ہم دونوں بہن کے ساتھ انہیں چھوڑنے اور چھٹیاں وہاں گزارنے ساتھ ہولیں۔ٹرین میں بیٹھی دونوں خواتین ایک دوسرے کے ساتھ باتوں کے لامتناہی سلسلے میں ایسی اُلجھیں کہ ٹانڈلیانوالہ اسٹیشن کب آیا اور کب نکل گیا۔انہیں معلوم ہی نہیں ہوا۔ہوش اس وقت آیا جب ٹرین اپنے آخری اسٹیشن شور کوٹ پر کھڑی تھی۔

تب حالات آج جیسے تھوڑی تھے۔نہ بسوں ویگنوں کی ریل پیل، نہ گاڑیوں کی۔ٹرین نے اگلے دن صبح کو پھر چلنا تھا۔ماحول پر سناٹا تھا۔جھٹ پٹے کا سماں تھا۔دو بچے اور دو خواتین پلیٹ فارم پر حق دق، کشش و پنج میں مبتلا کھڑی تھیں۔پلیٹ فارم کے کیروسین آئل لیمپ جل گئے تھے اور زمانہ آج جیسا نہ تھا کہ اسٹیشن آباد اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرے ہوں۔اسٹیشن ماسٹر شاید چھٹی پر تھا اور ملازم نے چھوٹا سا کمرہ کھول دیا تھا مگر موسم گرمی کا تھا۔باہر بیٹھنے کو ہی ٹھیک سمجھا گیا۔ہم سب بھوکے تھے۔

میری ماں رات کے سناٹے بولتی تاریکی میں مانگنے نکلی اور جب وہ واپس آئی اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا جس نے دو بستر سر پر اٹھا رکھے تھے اور میری ماں کی چادر کی جھولی میں روٹیاں اور کٹورے میں سالن تھا۔اُس سالن، تندوری روٹیوں کی لذت اور شور کوٹ کے جانگلیوں کی عنایت اور فراخ دلی کب مجھے کھینچ کر اُسی گم شدہ دنیا میں پھر لے گئی۔معلوم ہی نہ ہوا تھا۔

باب نمبر:۱۱ نیشنل میوزیم اور یورک York سٹریٹ

۱۔ سری لنکا کی نوجوان نسل اپنی روایات پر بڑی نکتہ چیں ہے۔
۲۔ کولمبو نیشنل میوزیم کی تعمیر و تزئین صدیوں پہلے سری لنکا میں آباد ہونے والی مسلمان شیخ فرید فیملی کے بیٹے آراسی مار یکر کا کارنامہ ہے۔
۳۔ جمعہ کے دن میوزیم کی چھٹی کی دلچسپ داستان۔

چلو شکر ناشتے میں پراٹھا آملیٹ تھا۔چائے تگڑی تھی اور چھوٹے سے ٹرانسسٹر پر دو شوقین لڑکیوں کے گانے سُننے کا چسکا تھا۔یہ سرزمین تو یوں بھی راگ و رنگ کی دلدادہ سمجھی جاتی ہے۔بّرصغیر کے پُرانے لوگوں کو اس کی بابت اور کسی بات کا علم ہو نہ ہو پر ریڈیو سیلون سے ان کی خوب شناسائی ہے۔خود میں بھی تو اسی صف میں شمار ہوتی ہوں۔
پراٹھا کوئی ہمارے ہاں کے پراٹھوں جیسا تھوڑی تھا۔نام کو گھی کا مسکہ تھا۔چلو شکر کچھ تو پیٹ بھرنے کو مل گیا تھا۔اگر رات کی طرح کورا چٹا جواب ہوتا تو بھئی ہم نے کیا کر لینا

تھا۔اسی لیئے ہرنوالے پرشکر الحمد اللہ بھی تھا۔

ڈائننگ روم میں زیادہ لڑکیاں نہیں تھیں۔یہ ایک طرح ورکنگ ویمن اور سٹوڈنٹس کاملا جلاہوسٹل تھا۔ایک حصہ ہم جیسے سیاحوں کیلئے بھی مخصوص تھا۔

لڑکیاں چائے پیتے ہوئے گپ شپ کرتی تھیں۔ایک ٹرانسسٹر کی نوب کوکھٹ کھٹ دبائے جاتی تھیں۔پھر ایک مدھری سی آواز پر دبانا رُک گئی۔گیت سنہالی میں تھا۔لڑکیوں سے مطلب پوچھاتو معلوم ہوا کہ سری لنکا کی ایک قدیمی فوک شاعرہ نونا کی شاعری ہے جسے عصر حاضر کی ایک گلوکارہ نے گایا ہے۔

اوہو اِس چھوٹے سے سنہری گھڑے
جسے میں نے پانی سے بھرا
اور کنویں کے کنارے رکھا
ایک بدمعاش جسے پانچ اور آٹھ نہیں آتا
اُس نے میرا گھڑا چھپالیا ہے
تم میرا گھڑا واپس کرو
تاکہ میں گھر جاسکوں

لڑکیوں کی انگریزی فراٹے مارتی گاڑی جیسی تھی۔مزہ آگیا۔ہم نے پوچھا کہ ابھی ہم باہر جارہے ہیں ہمیں کیا کیا چیزیں دیکھنی چاہیں؟

مجھے یوں لگا جیسے میں نے کسی گرما گرم موضوع پر کسی ٹاک شو کا بٹن دبادیا ہو۔

''ارے نیشنل میوزیم دیکھیں۔

کونے میں سے ایک تیکھی آواز اُبھری۔سری لنکا کے آرٹ،نوادرات،ثقافت اور تاریخ سے لطف اندوز ہوں۔''

''ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں جائیں۔ٹرانسسٹر سے کھیلتی ایک چلبلی سی لڑکی بولی۔

Slave Island کو ذہن میں رکھیں۔بیرا Beira Lake کے نظارے لوٹنے ہیں یاد رکھیں۔''

ایک اور نے کہا''کولمبو فورٹ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔Galle Face Road پر ایک بار نہیں کئی بار جائیں۔عمارتوں کی شاہانہ عظمت،تاریخ اور انکی قدامت سب آپ کی آنکھیں حیرت سے وا کریں گی۔آتے جاتے ہوٹلوں پر بھی نظریں ڈالتی رہیں

کہ مزہ آتا ہے انہیں دیکھ کر اور ہاں گینگرا Gangara بُدھ ٹمپل ضرور دیکھنا ہے۔ یہ یاد رکھنا ہے۔''

لڑکیوں نے ایک ہی سانس میں کِس تفاخر سے ڈھیروں ڈھیر نام گنوا ڈالے تھے۔ ایک اور لڑکی نے اٹھتے ہوئے گرہ لگا دی تھی۔ کولمبو کے بارے تو کہا جاتا ہے ''دیکھنے کی چیز ہے۔ اسے بار بار دیکھ۔ تھوڑا سا اضافہ ہم لنکن لڑکیاں اس میں اور کر دیتی ہیں۔ شہر ایسی دلربائی والا ہے کہ اس کی ہر چیز کا دیکھنے سے تعلق ہے۔

چلیے باہر آ کر رکشے میں بیٹھے اور اُسے نیشنل میوزیم کے لیے کہا۔ درمیانی فاصلہ بہت تھا۔ جہاں سے چلے تھے اسے فورٹ کہتے ہیں۔ میوزیم کولمبو نمبر 2 میں تھا۔ مگر وہ محاورہ کہیں اللہ میاں کے پچھواڑے والا بالکل درست تھا۔ یوں بھی رکشہ اپنی چھوٹی قامت کی وجہ سے باہر کے نظاروں میں حائل رہتا ہے۔ چلو بس یا ٹرین ہوتی تو اِس دُوری نے بھی لطف دینا تھا۔

یہ کولمبو کا بڑا بارونق علاقہ تھا۔ سر مارکس فمینڈو ماوا تا Sir Marcus Femando Mawatha روڈ پر سبزے کے وسیع و عریض لانوں کے پس منظر میں راج ہنس کی طرح ایک سفید براق عظیم الشان عمارت پر پھیلائے ہنستی مسکراتی تھی۔ وسیع و عریض لان کے عین درمیان آہنی جنگلے اور اُن میں کھلے رنگا رنگ پھولوں کے اوپر ایک مجسمہ کھڑا تھا۔ چند لمحوں کیلئے رُک کر اُسے بغور دیکھا۔

اس کے بانی ولیم ہنری گریگوری کا تھا جو برٹش دور میں جزیرے کا گورنر ہونے کے ساتھ لنکن ثقافت کے احیاء کا یقیناً باپ کہلانے کا مستحق ہے۔ ہاں البتہ ایک اور شخص بھی اِس بڑے کام میں حصّہ دار تھا۔ جس کا ذکر نہ کرنا زیادتی کے زمرے میں آتا ہے۔ آراسی ماریکر وپچی Arasi Marikar Wapchie جو شیخ فرید فیملی کی نسل سے تھا۔ سری لنکا کا یہ مور (مسلمان) خاندان کوئی لگ بھگ 1060 میں سری لنکا کے ساحلوں پر اُترا تھا اور پھر یہیں کا ہو گیا۔ سری لنکا کے فلاحی کاموں میں اس خاندان کی بڑی خدمات ہیں۔

آراسی 1829 میں پیدا ہوا۔ 1925 میں وفات ہوئی۔ کمال کا ماہر تعمیرات تھا۔ کولمبو کی قدیم اور شاندار عمارات جو اِس وقت شہر کا لینڈ مارک شمار ہوتی ہیں جن میں جنرل پوسٹ آفس، کولمبو کسٹم، پرانا ٹاؤن ہال، گیلی فیس ہوٹل، کلاک ٹاور جیسے نام ہیں جو اِس خاندان کے کولمبو کی تعمیر و ترقی میں حصّہ ڈالنے اور اس کا چہرہ سنوارنے کا اعتراف کرتے

ہیں۔

اِس میوزیم کو بنانے میں آراسی ماریکر کی خصوصی توجہ، دلچسپی اور محنت شامل تھی۔

افتتاح کے دن برٹش گورنر کے ہمراہ برطانوی افسران کے ساتھ ساتھ عمائدین شہر،معززین مملکت کی خاصی تعداد تھی۔مسلمان بھی کافی تھے۔رسم کے اختتام پر گورنر نے مسٹر آراسی ماریکر سے پوچھا کہ اس نے میوزیم کے سلسلے میں جو خدمات سرانجام دیں ہیں وہ انہیں خراج تحسین پیش کرنا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ کسی ایسی خواہش کا اظہار کریں جسے وہ پورا کرنے میں خوشی محسوس کرے۔آراسی میریکر نے میوزیم جمعہ کے دن بند کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ جمعہ مسلمانوں کا سبت Sabbath ہے۔اِس درخواست کو پذیرائی دی گئی اور اِسے قائم رکھا گیا۔

اور یہاں ایک بے حد دلچسپ، قابل غور، قابل عمل اور قابل فخر بات اور بھی ہے۔ جب آخری کینڈی شہنشاہ کا تخت و تاج اور دیگر شاہی اشیاء کو میوزیم کی زینت بنایا گیا اور اس کی باقاعدہ نمائش ہوئی۔یہ 1948 آزادی کے بعد کی بات ہے۔انتظامیہ کو احساس ہوا کہ چار روزہ نمائش کے تسلسل میں جمعہ کی چھٹی کی وجہ سے تعطل آرہا ہے جو نمائش کیلئے مناسب نہیں ہوگا۔بات ملک کے وزیر اعظم کو پہنچائی گئی۔مسٹر ڈی ایس Scnanayake نے آراسی ماریکر کے پوتے سر رزاق فرید سے صرف اُس جمعہ کو میوزیم کھولنے کی خصوصی درخواست کی جسکی سر رزاق فرید نے منظوری دی۔

واقعی آپ اپنے ملک وقوم کیلئے کام کرتے ہیں، آپ کسی مذہب، کسی رنگ نسل سے ہوں قابل عزت واحترام ٹھہرتے ہیں۔میرے ملک کا بھگوان داس مجھے شدت سے یاد آیا تھا۔جسٹس کارنیلس یاد آیا تھا۔کیا لوگ تھے۔اصولوں اور اخلاقی قدروں کے حامل۔

ٹکٹ خاصا مہنگا تھا۔غیر ملکیوں کیلئے ہر مقام پر جو تفریق روا رکھی جاتی ہے میرے خیال میں وہ اخلاقی لحاظ سے بہت نامناسب ہے۔دراصل یہ سب جدیدیت اور مادیت پرستی کے تحفے ہیں۔سیاح تو کسی بھی ملک کیلئے رحمت ہیں۔اُس ملک کا اپنے اپنے وطنوں میں جا کر اشتہار ثابت ہوتے ہیں۔بہر حال یہ سب تو اضافی باتیں ہیں۔

آرکیالوجی اور سنہالی ڈکشنری آفس سے پتہ چلا تھا کہ نیچرل ہسٹری میوزیم اس کے پچھلی جانب ہے۔سوچا کہ چلو اگر موڈ بنا تو اُس پر بھی ایک نظر ڈال لیں گے۔

یہ آرٹ اور نوادرات کی شاہکار دنیا تھی۔وسیع وعریض ہال اندر ہی اندر ایک

دوسرے میں کھلتے چلے جاتے تھے۔کمرے،اور راہداریوں کے طویل سلسلے نظروں کو بھاتے تھے۔

بدھا کے کانسی کے خوبصورت مجسمے اور چوبی کندہ کاری کے شاہکار تھے۔آرٹسٹوں کے کمال فن کی داد نہ دینا کتنی زیادتی کی بات ہوگی۔جنہوں نے اپنی مذہبی شخصیات کے مجسموں،اُن کے استعمال میں آنے والی چیزوں کو حسطرح تراشا،خراشا اور مجسم کیا۔اُس نے عقیدتوں پر مبنی داستانوں کو جنم دیا۔

کیسے فنکار تھے۔ایک ایک نقش میں رقص کے انداز،نشست و برخاست کے پوز،اُن میں جھانکتا اس کا قدرتی رنگ کیسے ایک ایک چیز میں نمایاں ہوا تھا۔کہیں قبل مسیح اور کہیں بعد مسیح کی چیزیں۔راجے مہاراجوں کے تاج،انکی شاہانہ کرسیاں،حنوط کیے ان کے سواری کے ہاتھی۔تاہم سب سے زیادہ دلچسپ حصّہ زیورات کا تھا۔کیا فنکاری اور کیا کاریگری تھی۔میرا جی چاہا تھا کہ میں پاکستان کے سناروں سے کہوں کہ وہ سری لنکا کا چکر لگائیں۔ہاتھی دانت کی چیزوں کا ہی شمار نہ تھا۔خیر وہ تو ہونی ہی تھیں کہ ہاتھی دانت تو ان کے کیلئے گھر کی مرغی کی طرح ہیں۔

یہاں جزیرے کا ماضی تھا۔یہاں اس کا ہر عہد تھا۔یہاں تاریخ تھی۔یہاں وہ دنیا تھی جس کا نام کل تھا۔یہ داستانیں حیرت انگیز تھیں۔انسانی نفسیات کے پہلوؤں کو اجاگر کرتی اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ انسان کی اخلاقیات نے اپنے ماضی سے کبھی کچھ نہیں سیکھا۔

اب بھوک زوروں پر تھی۔تھکن بھی تھی۔پیاس نے بھی حلق میں کانٹے سے اُگانے شروع کرر کھے تھے۔سو سب سے پہلے تو باہر نکل کر سڑک کنارے کھڑے ریڑھی والے سے ناریل پیا۔رکشے میں بیٹھے۔

میوزیم میں ملنے والی فیملی کی ایک خاتون خاصی پڑھی لکھی لگتی تھی۔میرے پُوچھنے پر کولمبو یونیورسٹی کا بتایا تھا کہ قریب ہی ہے۔مہر انساء کے دریافت کرنے پر شاپنگ سنٹرز کے بارے تفصیلاً روشنی ڈالی کہ سلیو آئی لینڈ کے بازار کافی سستے ہیں۔ہاں اگر کلاس کی خریداری کرنی ہے تو پھر Pettah چلی جایئے وہاں تو ہر چیز کا ایک بازار ہے۔ہاں اگر کولمبو کا روشن اور تین دہائیوں پر مشتمل تاریخی چہرہ دیکھنا ہے تو فورٹ Fort جایئے۔گھومیے پھریئے لطف اٹھایئے۔

میں نے اُسے بھوک کا بتایا کہ سب سے پہلے تو ہمیں پیٹ بھرنا ہے۔

''ارے بڑے مزے کی چیزیں ملیں گی وہاں۔''

تو اب اتنی تاب نہ تھی کہ بس میں بیٹھتے اور دھکے کھاتے۔رکشہ لیا۔رکشے والے نے جو گھمایا اور چکریاں دیں اُسنے ہماری چولیں تک ہلا دیں۔چلو شکر عین بازار میں لائٹ ہاؤس کلاک ٹاور کے پاس اُتار دیا تو یہ فورٹ کا علاقہ تھا اور ہم کلاک ٹاور کے سامنے کھڑے تھے۔

اپنا فیصل آباد کا گھنٹہ گھر یاد آیا۔مگر بھئی یہ کہیں زیادہ خوبصورت تھا اور آخر کیوں نہ ہوتا۔ڈیزائن کاری کرنے والی کون تھی۔برٹش گورنر سر ہنری کی بیوی لیڈی وارڈ۔کلاک ٹاور چوراہے پر کھڑا ہے۔اِن سڑکوں کے نام پہلے قابض حکمرانوں کے ناموں پر تھے اب مقامی شخصیات پر رکھ دیئے ہیں۔

مجھے ناموں کی اِس اکھاڑ پچھاڑ پر ہمیشہ بڑا اعتراض رہا۔غلامی کے دور کی یادوں کا ہر نقش مٹادو۔یہ کیا منطق ہے بھئی۔غلامی اگر نصیب ہوئی تو نالائقیوں کے کارن ہوئی۔تاریخ نے وقت کا وہ دورانیہ اپنے سینے میں محفوظ کرلیا اور تاریخ کو مسخ کرنا مذاق نہیں۔

میرے ملک میں بھی یہی تماشے ہوتے ہیں۔لائل پور کا نام فیصل آباد رکھ دیا منٹگمری کو ساہیوال بنا دیا۔کوئی پوچھے نئے شہر بنانے سے موت پڑتی ہے۔نئے شہر بساؤ اور اُنہیں اپنے پسندیدہ نام دو۔مگر یہ کام نہیں کرنا ہم نے۔

بلند و بالا عمارتوں کے جلو میں ہنستا مسکراتا گہما گہمی سے لدا پھندا۔سارے میں آبنوسی رنگ بکھرا ہوا۔بیچ میں ہم دونوں بھی شامل ہوگئیں۔ویسے تو میں اُن کی رشتہ دار ہی نظر آتی تھی۔مہرانسا تو خاصی گوری چٹی تھی۔

عورتیں لڑکیاں کہیں جینز اور ٹاپ میں کہیں چوڑی دار پائجامے قمیض میں، ساڑھیوں میں، لمبی میکسی ٹائپ فراکوں میں نظروں کو لبھاتی پھرتی تھیں۔مردوں کے ملبوسات میں بھی بڑا تنوع تھا۔دھوتیوں کے جلوے بھی تھے، پاجامے بھی چل رہے تھے اور پینٹ قمیضوں کی بھی بہار تھی۔بڑے رنگ بکھرے پڑے تھے۔یہاں ریڑھیاں بھی تھیں، بیچ میں ہی رکشے اور گاڑیاں تھیں۔

اب جو مناسب سی دکان نظر آئی اسی میں گھس گئیں۔جو مینو آیا اور ہم نے پڑھا تو پلّے خاک نہ پڑا۔شکر کہ ویٹر لوگ سب انگریزی بولتے سمجھتے تھے۔اپنی ضرورت بتائی تو سر ہلا کر بولا vegeterian kottu آپ کو کھلاتے ہیں۔

اب جو کوٹو کی پلیٹ آئی تو پتہ چلا کہ اسمیں سبزیاں ہیں، مچھلی ہے اور پراٹھا کے ٹکڑے ہیں۔سری لنکا مصالحوں کا گھر تو کھانے میں بھی خیر سے خاصی فراوانی جھانک رہی تھی۔چلو خیر ذائقہ چونکہ منہ کو نہیں لگا ہوا تھا اس لیے کچھ اتنا مزہ نہ آیا۔

تو جب گھومنے پھرنے نکلے اور شہر کے تجارتی مرکز، تاریخی اور ثقافتی سرگرمیوں کے منبع شہر کے خوبصورت ترین چہرے کے نقش و نگار دیکھنے شروع کیئے تو معلوم ہوا کہ اِن پرتگیزوں، ان ڈچ، ان انگریز پلانٹرز نے اپنے تجارتی مقصد کیلئے جو عمارتیں بنائیں انہوں نے تو اِسے حسین ترین بنا دیا۔یورک York street پر ہماری مال روڈ کا گمان گزرتا ہے۔شاندار عمارتوں کے منفرد تعمیری انداز بندہ گردن اٹھا اٹھا کر ضرور چند بار دیکھتا اور سراہتا ہے۔

کیا بات تھی کارگلز ڈپارٹمنٹل سٹور کی۔سرخ اینٹوں سے آراستہ چہرہ جس پر سفید دھاریاں اس کی زینت کو بڑھا دیتی تھیں۔

اندر کی دنیا تو حیران کرتی تھی۔دکانیں جیسے سامان کی اُگل اچھل سے چھلکتی۔دو گلیاں چھوڑ کر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی بلند ترین عمارت تھی۔کوئی چار گھنٹے ہم نے اس کی شاندار اور کہیں کہیں ماٹھی سڑکوں کی سڑک پیمائی کی۔پرانے پوسٹ آفس کی عظمت رفتہ کو دیکھا۔غفور بلڈنگز کی شاہانہ عظمتوں کو دیکھ کر اپنے لاہور کی شاہ دین بلڈنگز کو یاد کیا۔

لاکسالہ Laksala بھی اسی علاقے میں تھا۔کسی نے کہا تھا کہ وہاں فیر پرائس شاپ کی چند دکانیں ہیں۔مہر النساء ہینڈی کرافٹ کی دکان میں گئی اور میں کتابوں کی کھوج میں نکلی۔بک شاپ یورک York سٹریٹ میں تھی۔بہت بڑی جیسے کتابوں کا سمندر ہو۔سیلز بوائے کی مدد سے اُس ڈھیر میں سے جو میرے سامنے رکھا گیا تھا۔میں نے سکون سے بیٹھ کر چھانٹی کی جو اچھی لگیں وہ خریدتی گئی۔یہ ناول تھے۔شاعری کا مجموعہ تھا۔سری لنکا پر چند معلوماتی کتابوں کی بھی خریداری کی۔

پھر پبلک سکوائر کے ایک کونے میں کھڑی ریڑھی پر میٹھی سی خوشبو بکھیرتا انناس کٹوایا اور وہیں سڑک کنارے بیٹھ کر کھایا۔

ہوسٹل اسی ایریا میں تھا۔واپسی کی اور دو گھنٹے کا آرام بھی۔رات ٹی وی لاؤنج میں لڑکیوں سے خوب خوب باتیں ہوئیں۔لڑکیوں نے گیت گائے۔ترجمہ بتایا۔

اے میرے پیار مجھے افسوس ہے

میں نے تمھیں تکلیف پہنچائی
اپنے آنسو پونچھ ڈالو
اور مجھے اپنے ساتھ لے چلو

مگر ہنستی باتیں کرتی لڑکیاں سب اُس وقت خاموش ہو گئیں جب میگو نہ فرنینڈو نے دہشت گردی پر ایک نظم سُنائی ۔میگو نہ کا بھائی ایر فورس میں تھا۔اپنے اوسی کے ساتھ وہ ہیلی کاپٹر میں مینار پر پٹرولنگ کے دوران تاملوں کی طرف سے کی جانے والی وحشیانہ کاروائی میں ہلاک ہو گیا۔

اے۔ جے کینا گارتنا A.J.Canagaratna کی نظم واقعی اُس نے آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز کر دیا تھا۔

ساحل کی چہل قدمی سے
واپس گھر آئے ہوئے
یا سینما سے
یا ڈیوٹی سے
اچانک رائفل کی گولی
سنسناتے ہوئے
تمھیں لپیٹ لیتی ہے
سڑک پر خون آلود ایک جسم
جس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر
چند خواب بکھرے ہوئے ہیں
کوئی بھی تو
کچھ نہیں پوچھتا
خاموشی منجمد ہو جاتی ہے
لیکن
دلوں میں
غصے اور دکھ کی آگ کا بھانبڑ ہے

بہت سی باتیں سنہالیوں کی بابت ہوئیں لڑکیوں نے بڑی دلچسپی لی ۔انجیلی

انورادھاپورہ سے تھی ۔سری لنکا کا شمال مغربی ضلع یہاں کولمبو میں میتھوڈسٹ کالج میں فورتھ ایر کی سٹوڈنٹ تھی ۔

''ارے عجیب ہے یہ ہماری سنہالی سوسائٹی۔چودہ ذاتوں میں بٹی ہوئی ،برتر اور کمتر ذاتوں کا گھمنڈ۔اور میں نے اس کی دلداری کرتے ہوئے کہا تھا۔

''گھبراؤ نہیں ہمارے ہاں بھی ایسی ہی لعنتیں ہیں ۔برصغیر کیا ساری دنیا ایسے ہی نسلی تفاوات میں اُلجھی ہوئی ہے۔

دیہی علاقوں میں مذہب اور روایات کا بہت گہرا دخل ہے ہاں البتہ شہری زندگی پر مغربی تہذیب کے اثرات ،اعلیٰ تعلیم اور ماحول کا بہرحال اپنا اثر ہے۔شہری عورت میں دلیری اور رجی داری کے ساتھ ساتھ خودپر اعتماد اور معاشی کفالت میں مرد کا ہاتھ بٹانے کا اعتماد بھی ہے۔

اب جولڑ کی گفتگو میں شامل ہوئی۔وہ للکھشیتا تھی ۔اپنے نام کے معنی کی طرح کچھ منفرد بھی دکھتی تھی ۔جو سنہالی تھی مگر مذہب سے بڑی بیزار اور بے نیاز سی دکھتی تھی۔

تامل اور سنہالی کلچر میں بہت ساری چیزیں مشترک بھی ہیں اور مختلف بھی ہیں ۔تاہم افسوس ناک امر یہ ہے کہ دیہی تامل معاشرہ زیادہ قدامت پرست اور روایات کا اسیر ہے ۔لڑکی کو جوان ہونے پر سولہ دن ایک الگ ہٹ میں رکھا جاتا ہے۔کوئی پوچھے کہ ایک نوخیز بچی کو خاندان سے کاٹ کر ہٹ میں رکھنا کہاں کی دانائی ہے؟اِس ہٹ کو با قاعدہ تازہ پتّوں سے بنایا جاتا ہے۔جب اُسے نصف ماہ بعد نکالا جاتا ہے ۔فوراً غسل دینے والی خاتون مذہبی رسومات کے ساتھ اُسے پاک صاف کرتی ہے۔اِس عمل میں گھر کی عورتیں بھی حصّہ ڈالتی ہیں۔پھر اُسے ٹھوس غذا جن میں کچے انڈے،تل اور اس کا تیل اور پٹوPittu یعنی چاول کے آٹے سے بنایا ہوا پراٹھا کھلایا جاتا ہے۔ہاں البتہ سنہالیوں میں لڑکی کو اِس قیام کے دوران سوپ بھی پلاتے رہتے ہیں۔

سچی بات ہے کہ اس ظالمانہ رسم کے بارے کوئی اِن روایتی لوگوں سے پوچھنے والا نہیں ۔

بختی فرنچ ادب پڑھتی تھی اور وہ تامل ہونے کے باوجود تامل معاشرے میں مرد کی حاکمیت کے سخت مخالف تھی۔

اس کے ناک کے فراخ نتھنے پھڑ پھڑاتے تھے جب وہ بات کرتی تھی ۔تامل

عورت کا کیا کام ہے ۔صبح اٹھ کر کولہو کے بیل کی طرح کام کرنا ۔سارے ٹبر کو کھلا کر بعد میں ان کا بچا کچھا کھانا خود کھانا ۔کیا میں ایسی بیوی بنوں گی ۔ ہرگز ہرگز نہیں ۔ میں مر سکتی ہوں مگر یہ کام نہیں کروں گی ۔

میری سویٹ سی بختی ہمارے ہاں بھی ایسا ہی ہے ۔عورت تیسری دنیا کی یا پہلی دنیا کی ۔تھوڑے ،بہت فرق کے ساتھ کم وبیش ایسے ہی حالات سے گزرتی ہے ۔

یہ شام بہت خوبصورت تھی ۔ایسی محبت والی لڑکیاں اور ایسی کھلی ڈلی باتیں پھر ہرشنی نے ایک گیت سُنایا ۔کیا آواز تھی اور کیا شاعری تھی ۔

محبت ایک دوسری دنیا میں لے جاتی ہے
خوبصورت پھولوں سے ڈھکی ہوئی
سندر سے جذبات کی خوشبو سے مہکتی ہوئی
خزاں کے پتوں اور گلاب کی پتیوں سے
اپنا راستہ بناتی ہوئی

باب نمبر:۱۲ غلامان جزیرہ، بیریا جھیل اور دارسلام

۱۔ سیلو آئی لینڈ کے باسیوں کی ایک اکثریت روایتی سیاست، روایتی سوچ وفکر اور روایتی طرز زندگی کی عادی ہے ۔

۲۔ انتخابات میں چھوٹی سیاسی پارٹیاں پریشر گروپ بنانے میں بڑی مہارت رکھتی ہیں۔

۳۔ بدھ مذہبی رہنما بہت طاقتور اور تشدد پسند ہیں ۔

۴۔ سری لنکن خواتین لکھاریوں کے ادبی شعور نے حیرت زدہ کیا تھا۔

Slave Island کیلئے صبح سویرے نکلنا پڑا تھا۔کولمبو کے مرکزی حصے کی جنوبی مائل سمت کا علاقہ۔رات کولڑ کیوں نے کہا تھا کہ ٹرین سے جانا۔کورش بہت ہوگا مگر مزہ آئے گا۔

یہ نام اِسے انگریزوں نے جزیرے پر قبضے کے بعد دیا۔انگریز تو یوں بھی دنیا کو غلام بنانے کیلئے بدنام زمانہ ہیں۔یہاں تو انہوں نے وہ جگہ ڈھونڈ لی تھی کہ جہاں وہ اپنے مفتوحہ علاقوں سے باغیوں کو بھیج سکیں کہ یہ بھی کالا پانی تھا۔اس کے چچیرے، ممیرے رشتہ دار بھی اِن سے کم نہ تھے۔دنیا کو کوئی گوشہ تو انہوں نے چھوڑا نہ کہ جہاں اپنے غلاموں کی منڈیاں نہ لگائیں۔

ٹرین سے سفر کیا۔ٹرین کا سفر ہمیشہ سے کمزوری رہا۔اپنے ملک میں اس کا بیڑہ غرق ہوتے دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ڈبے میں مقامی لوگوں کی بھرمار تھی۔جتنے لوگ بیٹھے تھے اُس سے زیادہ کھڑے تھے۔جن دو چار لوگوں سے کھڑے کھڑے باتیں ہوئیں اُن کی وہاں دکانیں تھیں۔ایک کی گارمنٹس کی، دوسرے کی فش کی۔

ٹرین سرسبز درختوں کے بیچ سے گزرتی بہت خوبصورت مناظر دکھارہی تھی۔جھک کر دیکھنے پڑتے تھے۔پھر ایک نوجوان لڑکے نے اپنی سیٹ دے دی۔شکریہ کہتے ہوئے میں نے فی الفور اس پر قبضہ جمالیا۔مہرانساء کو بھی ساتھ میں ٹانگ لیا۔اسٹیشن آتے، لوگ اُترتے چڑھتے۔

مرکزی اسٹیشن کی کیا شاندار عمارت تھی۔ 1870 کی بنی ہوئی۔شاہانہ شان و شوکت والی جس کی محرابیں، جس کا چوبی کام، جس کا لوہے اور پتھر کی ڈیزائن کاری میں وکٹورین سٹائل۔ہم تو تصویر بنے بہت دیر تک عمارت کو ہی دیکھتے رہے۔

جاوالین میں ضرور جانا۔یہ سبق ہمیں ٹرین میں ایک بندے نے پڑھایا تھا کہ اگر آپ نے نچلے متوسط اور غریب لوگوں سے ملنا ہے تو وہاں جائیں۔مسائل بھی معلوم ہوں گے اور سری لنکا کا اصلی چہرہ بھی دیکھ لیں گی۔اور ہاں وہاں کا ہندو ٹمپل مروگن Murugun دیکھنا نہ بھولنا۔

واقعی ہم نے بھی یہ بات پلّے سے باندھ لی۔بس تیر کی طرح سیدھا اسی طرف کا رُخ کیا۔جسٹس اکبر اور رمیلے Malay سٹریٹ کی رونقوں سے آنکھوں اور دل کو شاد کرتے اس کے کوچہ و بازار میں جا پہنچے۔

سیلو آئی لینڈ Slave Island اُن لوگوں کا علاقہ ہے جو اپنا ایک تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ اپنی پہچان رکھنے میں بھی انتہائی سرگرم ہے۔ دراصل یہاں وہ لوگ آ کر بسے جنھوں نے ڈچ قبضے کے وقت مزاحمت کی۔ اِن میں راجے، مہاراجے، سرکردہ لوگ، سرفروش قسم کے محبِّ وطن جو شکست سے دوچار ہونے کے بعد جزیرے سے بھاگ گئے۔ پھر کہیں بعد میں وطن لوٹے اور یہاں آہستہ آہستہ سیٹ ہوتے گئے۔

تقریباً 160 ایکڑ کا یہ ٹکڑا کولمبو کے دل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ متوسط، نچلے متوسط اور غریب لوگوں کا علاقہ۔ یہاں جھونپڑیاں تھیں۔ یہاں رنگ و روغن سے سجے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ یہاں گلیوں میں ریڑھیوں پر بکتے سودے تھے۔ جنہیں خریدنے کیلئے ننگے پاؤں پھرتی مائیں چھوٹے بچوں کے ساتھ کھڑی بھاؤ تاؤ کرتی تھیں۔ یہاں کچی پکی گلیاں جن میں ایک ایک کمرے پر مشتمل گھروں کی بھی کثرت تھی۔ صحن سانجھے اور جن کے باورچی خانے شیڈوں کے نیچے بنے تھے۔

یہی وہ علاقے تھے جہاں ڈینگی حملہ کرتا اور ان کی جانیں بھی لیتا تھا۔ یہاں مندر تھے اور بے حد انوکھی وضع کے تھے۔ مسجدیں تھیں کہ یہاں مسلمان بھی خاصے ہیں۔ ان کی اکثریت ملائی زبان بولتی ہے۔ یہاں کے لوگ حکومت کی اپنے بھلے کیلئے بات کو بھی تھوڑی الٹی طرف کر کے دیکھنے اور سوچنے کے عادی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سی بات پر بحث و مباحثے بھی زور و شور سے ہوتے ہیں لڑائی بھی اُسی شدت سے اور محبتیں بھی ویسی ہی۔ کٹوریوں میں سالنوں کے لین دین اور گلاس بھر اُدھار چاول اور آٹا، شادی بیاہ، غمی خوشی پر اکٹھے ہونے اور روٹھنے کے منظر۔

دراصل راہ چلتے لڑکے لڑکیاں بڑے ہنس مکھ اور کچی پکی انگریزی میں مدّعا سمجھانے اور ماحول کی صحیح عکاسی کرنے والے تھے۔

مہرالنساء کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ یہ تو من و عن برصغیر کی تصویر کشی ہو رہی ہے۔

''ارے اُس کا ہمسایہ ہے۔ ایک جیسا تو ہو گا ہی۔''

ملکیت کا احساس یہاں شاید لوگوں کی نفسیات کا حصّہ بنا ہوا ہے۔ حکومت کی طرف سے ہر وہ قدم جو ان کی اصلاح کیلئے اٹھائے جانے کی کوشش ہوتی ہے وہ انہیں پہلے کھٹکتی ہے۔ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی انہیں فلیٹ بنا کر دینا چاہتی ہے۔ اِس ساری جگہ کو

ہموار کردینے پر تلی ہوئی ہے۔مگر یہ انہیں فی الحال قبول نہیں۔اب اِس پر احتجاج اور جلسے جلوسوں کا شور وغوغا ہے۔

ایک چھوٹے سے گھر میں خاتون خانہ سے باتیں کرتے ہوئے سونا،جہیز،شادی بیاہ زیر بحث آئے۔سچی بات ہے وہ ذہنیت کہ سونا کیش ہے۔لڑکی کو ہر صورت جہیز میں دینا ہے۔چاہے اس کے لیے اُدھار لیا جائے۔داج بھی چاہیے۔لڑکے والوں کے دماغ بھی اونچے ہیں۔خیر سے اب شہری پڑھی لکھی لڑکیاں بھی بڑی سیانی ہورہی ہیں۔

میرے لیے یہ قدرے تعجب انگیز بات تھی کہ مرد کیا اِس علاقے کی عورتیں بھی خاصی سیاسی سوجھ بوجھ کی مالک تھیں۔ہاں بندرا نائیکے خاندان سے کافی لوگوں کی وابستگی کا پتہ چلتا تھا۔سری ماؤ سے کچھ زیادہ ہی محبت کا اظہار تھا۔چندریکا کمارا تنگا پر چند نوجوان عورتوں نے غصّے کا بھی اظہار کیا کہ اُس نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کیوں کی؟

کوئی بات ہے بھلا۔ایک لڑکی کا لہجہ بڑا جوشیلا سا تھا۔پوچھنے پر جانا کہ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹ ہے۔

اُسے خود بھی سیاست میں رہنا چاہیے۔اور اپنے بچوں کو بھی لانا چاہیے۔

وہیں دو بوڑھی عورتوں نے اس کے حق میں ہمدردی کا علم بلند کیا۔

''ارے بیچاری کیا کرتی۔پہلے باپ قتل ہوا۔چودہ سال کی معصوم بچی نے یہ صدمہ جھیلا۔پھر شوہر کو آنکھوں کے سامنے خون میں نہلا دیا۔دونوں بچوں کے ساتھ گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔نا ہنجاروں نے بھون کر رکھ دیا۔کلیجہ ابھی بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا کہ اب اُسے دھر لیا۔بچنے کو تو بچ گئی پر آنکھ چلی گئی۔اب کتنے تو قہروں سے گزری ہے۔ممتا کو کیسے آگ اور خون میں جھونک دے۔

چند طالب علم بھی وہیں آموجود ہوئے۔اُن میں سے ایک کا کہنا تھا کہ انتہائی سمجھدار اور زیرک خاتون ہے۔اتنے خوفناک اور اذیت دہ حادثات کے بعد بھی وہ انتقامی کاروائیوں میں نہیں پڑی۔آج بھی غربت،بیماری،بے روزگاری اور نا انصافی کو ہی دہشت گردی کا سبب سمجھتی ہے۔

مجھے اس خاندان کی بھٹو خاندان سے بہت مماثلت محسوس ہوئی تھی۔جیسے کراچی کا لیاری پیپلز پارٹی کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔کچھ ایسی ہی کیفیت مجھے یہاں محسوس ہوئی۔

wauxhall لین اور اس سے ملحقہ علاقوں میں مسلمانوں کی خاصی اکثریت

تھی ۔گلیوں میں سیاہ برقعوں ، کہیں حجاب اور عبایا میں عورتیں گھومتی پھرتی سودے سلف لیتی نظر آئیں۔ یہ سنہالی بولتی تھیں ۔ کچھ کی مادری زبان تامل تھی ۔انگریزی بولنے میں اکثریت کوری ہی تھی ۔ہاں دکانوں میں بیٹھے نوجوان لڑکے مفہوم سمجھنے اور اظہار کرنے میں رواں تھے ۔لڑکیوں کی تعلیم کا پوچھنے پر پتہ چلا کہ مسلم کمیونٹی میں یہ پہلو اب ترجیحات میں شامل ہوا ہے ۔مسلم لڑکیاں میڈیکل کی تعلیم کیلئے گذشتہ دو دہائیوں سے پاکستان کا رُخ کر رہی ہیں اور یورپی ملکوں میں بھی جا رہی ہیں ۔

امتیازی سلوک،ملازمتوں میں ڈنڈیاں مارنے اور فرقہ ورانہ فسادات پر بھی رائے جاننا چاہی۔

سنجیدہ سے مرد نے کہا۔''یہ سب تو چلتا ہے ۔ہم نے اب ایک بات پر زور دینا شروع کیا ہے کہ ہمیں اپنی صفوں میں اتحاد رکھنا ہے۔''

یہیں ہمیں مسلمانوں کی فعال تنظیم ال سیلون مسلم کانگریس کا پتہ چلا ۔یہ بھی معلوم ہوا کہ مرکزی دفتر دارسلام زیادہ دور نہیں ۔ویکس ہال لین نمبر 53 پر ہی ہے ۔اب یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم مسلمانوں کے علاقے میں ہوں اور ہماری تواضع نہ ہو۔ہوئی اور بہت محبت بھرے انداز میں ہوئی ۔ابراھیم ارست کا چھوٹا سا گھر مسجد کی قریبی گلی میں تھا۔

علاقہ تو وہی ویکس ہال wauxhall کا ہی تھا۔

ماشاءاللہ پانچ بچے تھے ۔بڑا لڑکا ربڑ پلانٹ پر کیمیکل انجنیئر تھا۔شادی شدہ تھا ۔اس کی چار سالہ بیٹی یواے ای کے شیخ زید النیہان کی اہلیہ ہر ہائی نس شیخ فاطمہ کی طرف سے کھولے گئے اسکول میں پڑھتی تھی ۔گھر اوسط درجے کا نمائندہ تھا ۔ابراھیم ارست کا دادا ہندو تامل خاندان سے تھا۔صاحب علم تھا ۔اسلام اُس نے قبول کیا ۔ابراھیم سے ہی پتہ چلا تھا کہ یہاں مسلمانوں کی ایک تعداد تامل اور سنہالیوں کی دو تین نسلیں قبل کی قبول اسلام کرنے والوں کی بھی ہیں ۔

کھانے میں اُبلے چاول تھے ۔گاڑھے سے شوربے والی مچھلی تھی ۔کریلے کے چھوٹے چھوٹے روسٹ ٹکڑے تھے ۔سلاد اور اچار تھا۔مزہ آیا تھا۔کوئی تین گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد ہم لوگ رُخصت ہوئے ۔مین سڑک پر آئے اور یہیں سے رکشے پر چڑھے اور Beira Lake چلے گئے کہ قریب ہی تھی ۔بھئی کیا خوبصورت جھیل تھی ۔

سبز ہلکورے مارتے پانیوں پر جیسے تیرتا یہ ٹمپل ۔ایک لمبا چوڑا راستہ مرکزی جگہ

تک جانے کیلئے بنا ہوا جس پر چلنا بذات خود ایک دلچسپ شغل والا کام تھا۔مخروطی پگوڈا سٹائل عمارت جس کے بڑھے ہوئے ٹیرسوں کی دیواروں سے لگ کر کھڑے ہونا اور پانیوں میں جھانکنا اور شوخ وشنگ ہوا کے جھونکوں سے باتیں کرنے کی اپنی شان۔لوگ تھے۔بچے، بوڑھے تھے۔عورتیں تھیں۔شوخ وشنگ لڑکیاں جنہیں دیکھ کر کبھی ہم بھی ایسے تھے جیسے احساسات۔

عین درمیان میں بدھ کا ٹمپل۔کیا من موہنی سی چیز بنائی ہوئی تھی۔چبوتروں پر سجے سنورے بدھا کے ڈھیروں ڈھیر مجسمے کہیں اکڑوں بیٹھے، کہیں لیٹے۔برج پر چلے پر بوٹنگ کیلئے طبیعت نہ مانی۔دراصل جھیل کے پانیوں سے ہلکی ہلکی باس کا اٹھنا اور فضا میں اُس کے پھیلاؤ کو زیادہ دیر برداشت کرنا مشکل تھا۔

یہاں کسی نے سِنی من Cinnamon گارڈنز اور Viharama hadevi park کو بھی اپنی فہرست میں شامل کرنے کا کہا۔

دونوں جگہیں قابل دید تھیں۔یہ اب کولمبو 7 کہلاتا ہے۔واقعی سری لنکن چہرے کے ایک اہم نقش کو نہ دیکھنا بڑی محرومی ہوتی۔بڑا فیشن ایبل رہائشی علاقہ کبھی ہوں گے یہاں مصالحوں کے پیڑ بوٹے۔اب تو ایسا کچھ نہ تھا۔ہم نے یہ سارا سیر سپاٹا حیرت و مسرت بھرے جذبات سے کیا۔پرانے کولونیل مینشن ہائے کیا بات تھی ایسے تاریخی گھروں کی۔ابتدائی دور کی اِن عمارتوں کا حسن موہ لینے والا تھا۔ایسی کھتی ہوئی کندہ کاری کہ بندہ تو ہکا بکا دیکھتا رہ جائے۔یہاں قدیم سیلونی طرز تعمیر کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔پرانے درختوں ،خوبصورت پارکوں سے گھرے اس علاقہ کو دیکھ کر مزہ آیا تھا۔بہت پیاس محسوس ہورہی تھی۔قریب ہی چائے ،کافی اور کولڈ ڈرنک کی چھوٹی سی دکان تھی۔اسی میں جا گھسے۔بات چیت سے پتہ چلا کہ وہ بھی مور ہے۔مور سری لنکا میں مسلمانوں کو کہتے ہیں۔یہ اُنکا قدیمی نام ہے۔

میں دارسلام جانا چاہتی تھی۔مہرالنساء آمادہ نہ تھی۔بہر حال اُسے قائل کرنے کیلئے تھوڑی سی طرلہ منت کرنی پڑی۔چلیے ویکس ہال لین 53 پر جا پہنچے۔دفاتر بڑے رنگ ڈھنگ والے نظر آئے۔لوگ بھی خاصے تھے۔حسن علی نامی تنظیم کا سکرٹیری بھی ملا۔اب جو باتیں ہوئیں تو سری لنکا میں مسلمانوں کے حالات کھل کر سامنے آئے۔

تامل ہندوؤں کے بعد مسلمان جزیرے کی بڑی موثر اور معاشی لحاظ سے بھی اچھی

مظبوط اقلیت ہے۔فرقہ ورانہ فسادات کے حوالے سے میں نے سوال یہاں بھی کیا۔حسن نے کہا تھا۔

''یہ تو ہوتے رہتے ہیں۔بدھ سنہالی اکثریت مذہبی اقلیتوں کوتحفظ دینے میں اتنی کامیاب نہیں ہے جتنی ہم توقع رکھتے ہیں۔تھڈ دھوتا ہے۔تاہم مسلمان کولمبو میں 9.7 کی ریشو میں ہیں اور کولمبو میں اُنکا خاصا اثر ہے یوں بھی وہ کنگ میکرز میں شمار ہوتے ہیں۔تین چار وزارتیں ہماری پکی ہوتی ہیں۔

باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ جزیرے کے پانچ شہروں آم پارہ، ترنکو مالی، بیٹیکولا، کینڈی اور کولمبو میں مسلمان خاصی تعداد میں ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم بارے بات چیت کے دوران سری لنکا کے اُس سرکردہ بے حد معزز خاندان سر رزاق فرید کا ذکر آیا۔اس خاندان نے 1892 میں ال مدرستہ الا زہرہ کھولا۔آرسی مار یکر کا جونہی حسن علی نے نام لیا۔مجھے نیشنل میوزیم کی ساری تفصیل یاد آگئی۔میرے بات کرنے پر پتہ چلا کہ پورا خاندان بمعہ عورتوں کے فلاحی کاموں کیلئے بے حد سرگرم رہا۔ورابھی بھی ہے مسلم لیڈیز کالج کو آپ ضرور دیکھیے۔ایک ماڈل ادارہ، اسلامک کلچرل ہوم ایک اور بڑا ادارہ بھی اسی خاندان کا قائم کردہ ہے۔یہ بھی بہت شاندار اور کوئی پون صدی پرانا ہے۔شیخ فاطمہ ہوسٹل اور سکول یو اے ای کے سربراہ شیخ ہمدان بن زید النیہان کی اہلیہ کے نام پر کھولا گیا۔جس کی فنڈنگ اس خاندان نے کی۔ایک جدید موڈرن اور شاندار سکول۔

اس وقت پورے سری لنکا میں سنہالی ،تامل اورانگریزی میڈیم میں تعلیم دینے والے تقریباً ساڑھے سات سو ادارے کام کر رہے ہیں۔215 کے قریب مدرسے بھی سرگرم عمل ہیں۔

میرے جی میں آیا کہ کچھ اُس انتہاپسندی کے بارے پوچھوں جس کا مجھے تھوڑا سا تجربہ ہوا ہے۔مگر ہوا یوں کہ حسن علی نے خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بتا دیا کہ یہاں کے مسلمان اپنے عقائد اور اپنی پہچان بارے بہت حساس ہیں۔ہماری عورتیں حجاب لیتی ہیں۔اور ہم اِسے پسند کرتے ہیں۔

چائے پی۔مسلم لیڈیز کالج کو دیکھنے پر دوبارہ اصرار کیا۔پتہ کاغذ پر لکھ کر ہاتھوں میں تھما دیا۔

Kensington gardens, NO 22-B Bambala pitiya
Colombo 4.

شام کو جب واپسی ہوئی تو ہماری ہمسائی غلام فاطمہ کی خادمہ ملاقات کا پیغام لے کر آئی۔ ہم نے کوئی گھنٹہ بعد آنے کا کہہ کر بستروں پر چڑھائی کی کہ آج خاصی مشقت جھیلی تھی۔ پھر منہ ہاتھ دھویا کنگھی پٹی کی۔ تھوڑا ہونٹوں کو لال کیا اور خود سے پوچھا۔

''ہائے اتنے دنوں سے اچھا کھانا نہیں ملا۔ کیا یہ وطنی عورت ہمارے اوپر آج مہربان ہوسکتی ہے۔''

اندر نے کہا شودی عورت دیکھ تو لیا ہے تو نے سب کچھ۔ ہاں البتہ آج وطنی عورت ملے گی تو شاید وطنی پیاس کے کارن کچھ مل جائے۔''

اب بہو کے نہیں ساس کے گھر جا پہنچے۔ برآمدے میں بیٹھی آموں کی ٹوکری پاس رکھے شاید ہمیں کھلانے کے انتظار میں تھی۔

آم اتنے بڑے بڑے کہ ہم نے حیرت سے دیکھا۔ خوشبو برائے نام تھی۔ ذائقہ بھی بس ایسا ہی تھا۔ واقعی دل والی بات ٹھیک نکلی تھی۔ خاتون پیاسی تھی۔ تین بیٹے اور ان کی بیویاں بھی موجود تھیں۔

سیاست کی ٹوہ لی تو معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر بڑی سیاسی پارٹیاں دو ہی ہیں۔ سری لنکا فریڈم پارٹی اور یونائیٹڈ نیشنل پارٹی بقیہ سب اقلیتوں کی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں ہیں۔ ال سیلون مسلم کانگریس۔ کیمونسٹ پارٹی اف سری لنکا۔ ایلام پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی ایسی بہت سی پارٹیاں اپنے اپنے گروپوں کی نمائندگی کرتے ہوئے پریشر گروپ بن جاتی ہیں۔ بڑی پارٹیاں ان کے ساتھ دے لے کر اتحاد کرتی ہیں۔

ہائے وہی میرے وطن والی صورت۔

سنہالی بدھوں کے بارے بھی کھل کر باتیں ہوئیں۔ بڑے دونوں لڑکوں کی رائے تھی کہ یہ جو بدھ لوگوں بارے تاثر ہے کہ حد درجہ طبعاً شریف اور امن پسند ہیں۔ اتنا درست نہیں۔ اکثر بدھ مذہبی رہنما بہت طاقتور اور تشدد پسند ہیں۔ عام سنہالیوں میں بھی ایک کلاس انتہاپسندوں کی ہے۔ کوئی بھی ایسا قانون جسے اکثریتی آبادی اپنے مفادات سے ٹکراؤ سمجھے اُس پر احتجاج ہی نہیں بلکہ شدید ردِّعمل کا اظہار ہوتا ہے۔

اکثر حکومتی عہدہ داروں اور سربراہوں کا قتل بدھ مذہبی رہنماؤں کے ہاتھوں ہوا۔

چندریکا کے باپ اور شوہر دونوں کے قاتل مذہبی رہنما تھے۔ سنہالی انتہاپسندوں کیلئے بھی قتل کرنا کرانا عام بات ہے۔

تامل لبریشن اف ایلام جسے ایل ٹی ٹی ای یعنی لبریشن ٹائیگر زاف تامل ایلام کہتے ہیں وہ تو بہت ساری محرومیوں اور زیادتیوں پر کہیں بعد کی پیداوار ہے۔

سب سے چھوٹے لڑکے جس کی میں دو دن پہلے نمک خوار ہو چکی تھی نے بڑی پتے کی بات کی۔ دراصل پہلے وزیراعظم D.S.Scnanay Cke نے سنہالی بدھوں کی برتری کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے مذہب کو سیاست اور ریاست میں دخل دینے سے انکار کردیا تھا۔ مگر یہاں بھی وہ طاقتیں جو مارکسی نظریات کی حامل تھیں بدھ رہنماؤں کے ساتھ اثر انداز ہوئیں۔ کہیں بعد میں بھی انہیں نتھ ڈلتی رہتی تو حالات یکسر مختلف ہوتے۔

کھانا ہمیں ملا اور سچی بات ہے شاندار قسم کا ملا۔ فش پلاؤ، فش کری، قیمہ آلو۔ آم سویٹ ڈش کے طور پر کھائے۔ مزید ار تو نہ تھے پر آم تو تھے اور میٹھے بھی تھے۔

ٹی وی لاؤنج میں حسب معمول لڑکیوں کا جتھا کسی بحث میں اُلجھا ہوا دِکھا تھا۔ ہم بھی وہیں چلی گئیں۔ پتہ چلا کہ ٹی وی ڈرامے کی قسط ابھی ختم ہوئی ہے اور اسی پر گفتگو کا پٹارہ کھلا ہوا ہے۔

چندرا راتھنا بندرا جیسے بڑے ناول نگار کا ناول "میرو" جسے نیشنل لٹریری ایوارڈ کا ادارہ انعام دے چکا ہے۔ اُس کا سریل بنایا گیا ہے جو آجکل ٹی وی پر دکھایا جارہا ہے اور خاص و عام میں مقبولیت کی بلندیوں پر ہے۔ مصنف کے بارے مزید جانکاری ہوئی کہ بہترین ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ کہانی کار اور شاعر بھی ہے۔

میں چونکہ خود لکھنے والی تھی اس لیے قدرتی طور پر میرا تجسّس کچھ ان کے مردو خواتین لکھاریوں کے بارے میں جاننے کا ہوا۔ اور یقیناً میرے لیے یہ حیرت کا مقام تھا کہ لڑکیاں نہ صرف اپنا فکشن پڑھنے کی عادی تھیں بلکہ بیسویں صدی کی وسطی دہائیوں کے بعد دنیا بھر میں پیدا ہونے والے عالمی سطح کے مسائل جن کا اثر کسی نہ کسی رنگ میں پوری دنیا نے قبول کیا۔ جس پر بہت کچھ لکھا بھی گیا۔ ایسے ٹھوس ادب کو بھی بیشتر نے پڑھا تھا اور بڑی نپی تلی رائے رکھتی تھیں۔

بات بیسویں صدی کے آغاز کی بہت خوبصورت لکھنے والی ناول نگار روسالنڈ مینڈس سے شروع ہوئی۔ جس کا ناول سنہالی، تامل، انگریزی، ہندی اور گجراتی میں

ترجمہ ہوکرمقبولیت کی سند حاصل کیلئے بیٹھا ہے۔"ایک ٹریجڈی کااسرار۔"
روسالنڈ کے بارے میں نندو کی رائے میرے لیے قابل توجہ تھی کہ چلیے اُس کا ناول اپنے عہد کا نمائندہ ہے۔مگر وہ اہم مسائل جو اس وقت تیسری دنیا میں معاشروں اور حکومتوں کیلئے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔بڑے ملکوں کی ریشہ دوانیوں سے پیدا ہونے والی خانہ جنگیاں،لوگوں کی دربدری،اموات،والدین کے دُکھ جن کے بچے اِن وحشتوں کا ایندھن بنے،عورتوں کا ریپ،ڈرگ مافیا،منی لارڈنگ کیلئے عورتوں کا استعمال اور گھریلو تشدد پر سری لنکن عورتوں نے جی داری سے لکھا ہے۔

وجیتایایا نے اگرا کانومی اور investment جیسے موضوعات پر لکھ کرعورتوں کا ذہنی افق کشادہ کرنے کی کوشش کی تو وہیں Rajakarunanayaake نے بھی ممنوعہ موضوعات کو نہ صرف چھیڑا بلکہ کھل کراس پر لکھا۔اس نے مردوں اورعورتوں کی ہم جنس پرستی اور جنسی استحصال پر کھل کر لکھا ہے۔وہ کہتی ہے میں اپنی تحقیق کے ذریعے حقیقتوں کے چہروں سے پردے اٹھاتی ہوں۔

Sunethra Rajakarunnayaka سونیترا راجہ کرونانا ایوارڈ یافتہ لکھاری ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اُس نے بہت بہادری سے مردوں اورعورتوں کے سیاست اورمعاشرتی زندگیوں میں دہرے معیار پر لکھا اور خوب لکھا۔

لڑکیوں کی باتوں نے میرے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔اگر میں اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لڑکیوں سے اپنے ملک کے کسی بڑے لکھاری کے بارے بات کروں۔جیسا کہ اکثر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تھیسس اور ایم فل کرنے والی لڑکیوں سے گفتگو ہوتی رہتی ہے۔خدا شاہد ہے انہیں خاک نہیں پتہ ہوتا۔

میں نے ایک دن پہلے کی خریدی گئی کتابوں کا ذکر کیا۔اشوک فیری کا ناول The good little ceylonese girl،امینہ حسین کا The moon in the waterماریتو نام سنتے ہی اچھل پڑی۔

’’ارے بہت شاندار ناول ہے۔لیکن مسلم کمیونٹی کی سماجی،تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا نمائندہ۔امینہ نے کمال خوبصورتی سے کچھ خرابیوں اور مسلم وراثتی قانون بارے لکھا ہے جو اُس نے محسوس کیا۔میں نے پڑھا ہے اِسے۔‘‘

رومیش کے The Prisoner of Paradise اوراے وی سوراویرا کا

Softy Tread کے متعلق بتایا۔دونوں ناول کسی نے نہیں پڑھے تھے۔

میں نے سوچا اور دل میں کہا چلو کل اگر چہ روانگی ہے۔تا ہم صبح بازار کا چکر لگاؤں گی۔اِن میں سے جو بھی مل جائیں۔

باب نمبر:۱۴ پیٹہ، ڈچ میوزیم اور پاکستانی سفارت خانہ

۱۔ سری لنکا میں صحافت ایک پُرخطر کام ہے۔

۲۔ تعلیم اور صحت دونوں شعبوں میں اِسے جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں پر فوقیت حاصل ہے۔

۳۔ سر رزاق فرید کا خاندان سری لنکا میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کیلئے گذشتہ پون صدی سے سرگرم عمل ہے۔

ناشتے کے فوراً بعد پہلا کام تو مسلم لیڈیز کالج جانا تھا۔ واقعی نہ جاتے تو ایک بہت اچھا ادارہ دیکھنے سے محروم رہ جاتے۔ متاثر کرنے والی پہلی چیز تو عمارت کی شان تھی۔ ایک رفاعی ادارہ ہو اور ایسی شان وشوکت والا ہو۔ تعجب والی بات تو تھی۔ پانچ منزلہ عمارت کا نویلا پن اور اس کے سرسبز کھیل کے میدان فوراً توجہ کھینچتے تھے۔ ہم خاموشی سے اندر داخل ہوئیں۔ گیٹ پر کھڑے سیکورٹی کے آدمیوں نے پاکستان کا جان کر محبت بھری مسکراہٹ سے استقبال کیا اور آفس کا راستہ دکھایا۔ مگر وہاں جانے سے قبل برآمدوں میں ٹنگے ہم نے لمبے چوڑے بورڈوں پر بچیوں کی سال بھر کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنا ضروری سمجھا۔

بچیوں کے یونیفارم میں حجاب کو بہت خوبصورت انداز میں اس کا حصّہ بنایا گیا تھا۔ سفید یونیفارم میں چاق و چوبند لڑکیاں ڈرم بجا رہی ہیں۔ مارچ پاسٹ کرتی ہیں۔ ہر نوع کے کھیلوں میں سرگرمی سے حصّہ لینے کے منظر۔ مختلف کلبوں میں بچیوں کی پرفارمنس، لیب میں تجربات کرتی، کمپیوٹر پر کام کرتی۔ ماڈرن تعلیم کا کونسا ایسا شعبہ تھا جس کا اطلاق یہاں نہ کیا گیا ہو۔

ہاں ایک بات ضرور تھی کہ ان کے ہاتھوں میں جھنڈوں پر ایک نام تھا۔ ہاجرہ۔ عمارت کے مختلف حصّوں پر ایک نام تھا ہاجرہ۔ یہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سر رزاق فرید کی اکلوتی بیٹی تھی جو مدتوں پہلے گم ہوگئی تھی۔

پرنسپل بہت ملنسار اور سٹاف بین المذاہبی اور بین الثقافتی رویوں کی ایک دلکش تصویر تھا۔

ساڑھیوں میں ننگے سر، کٹے بالوں اور ڈھیپے بالوں والی ٹیچرز۔ تدریسی اساتذہ زیادہ مسلمان تھیں۔ تاہم ہندو، بدھ اور عیسائی بھی تھیں۔ ہم نے سائنس کی تجربہ گاہیں دیکھیں۔ چائے پی اور سر رزاق فرید اور ان کے قابل فخر ساتھیوں کے بارے مزید سُنا۔

اجازت چاہی اور باہر نکل آئیں۔

رات جب اپنی نیک دل ہمسائی کے ہاں سے ڈنر کر کے آئے تو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی لڑکیوں سے ہیلو ہائے ہوئی۔ ہمارے کل رات کے جانے کا سُن کر انہوں نے بیٹا کیلئے کہا تھا کہ کچھ ضروری خریداری نہیں کرنی۔

آپ لوگوں نے ہیرے، موتی، پتھر نہیں خریدے۔ مہرالنساء نے ہی تھوڑی سی آبرو رکھ لی۔

اور گرم مصالحے؟ ماریہ نے پوچھا تھا۔
''ارے وہ تو آپ کے آباؤ اجداد بھی لے کر جاتے تھے اور فدا تھے ان کی کوالٹی پر۔ ہاں بھئی اب اگر اُن پر پھر بھی دل نہ مانے تو پھر ہر بل دوائیں ہر بیماری کا شافی علاج۔ وہ تو نری سوغات ہیں۔ بڑی سکھی رہیں گی۔ لے جائیں انہیں۔
ماریہ مصر تھی۔ ماریہ قدیم تہذیب کے مرکزی شہر سگریا کی رہنے والی۔ یہاں کولمبو یونیورسٹی میں فزکس پڑھاتی تھی۔ سنہالی عیسائی تھی۔ گذشتہ تین دنوں سے مسلسل ہر رات ملاقات ہو رہی تھی۔ بڑی من موہنی سی، کھلی ڈلی مختصر سی ملاقاتوں میں ہی اُس شعر کی تفسیر بن گئی تھی کہ آنکھوں میں بس گئے دل میں سما گئے۔
اب ہم یہاں بمبالہ پٹیایہ میں کھڑے تھے۔ پہلے سوچا کہ کوئی اور موڈ تو نہیں رہ گیا جس کی ہم نے ٹرائیاں نہ ماریں۔ بسوں، ٹرین، رکشے کے مزے تو چکھ لیے ہیں۔ اب ٹیکسی رہ گئی تھی۔ پھر خود سے کہا۔ اب دو تو ہیں پس رکشا ہی پکڑا جس نے ہمیں خان کلاک ٹاور پر اُتارا۔ یہ پیٹا مارکیٹ کا مشہور لینڈ مارک ہے جسے ممبئی کی فریم جی خان پارسی فیملی کے بیٹوں نے اپنے باپ کی یاد میں بنوایا تھا۔
ہم کولمبو کے روایتی اور مصروف ترین بازاروں کی دنیا میں داخل ہو گئی تھیں۔ ایک بازار اگر برتن بھانڈوں کا تھا تو دوسرا کپڑوں کا، تیسرا سونے اور پتھروں کا۔ چوتھا الیکٹرک سامان اور فوٹوگرافی کا۔ بازار در بازاروں کے سلسلے جن میں دستی ریڑھیاں، رکشے، موٹر سائیکل، سائیکل گاڑیاں سب گزر رہے تھے۔
اب مصالحوں کے بازار میں کھڑی سوچتی تھی کہ مجھے تو لینا ایک نہ دینا دو۔ چھوٹی بڑی الائچی، دارچینی، لونگیں اب اگر ان کا بوجھ اٹھاؤں تو مجھے پاکستانی بھاؤ کا کیا پتہ کہ مدتیں ہوئی میں نے کبھی یہ چیزیں خریدی نہیں۔ میاں جانے یا بیٹی جانے۔ جب سے وہ اپنے گھر کی ہوئی۔ بہو نے ذمہ داری سنبھال لی۔ اب ہاتھ لٹکائے اِس اژدہام میں پھنسی ہوئی مہرانساء کی پھرتیاں دیکھتی تھیں کہ جس کا جی چاہتا تھا وہ چیزوں کا جہاز بھر لے۔
بھوک نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ کچھ میرا بھی خیال کرو۔ برگر اور ڈرنک لیے۔ تھوڑی سی پیٹ پوجا ہوئی۔
وہیں قریب ہی جامع الالفر تھی۔ پہلے سوچا چلو مسجد دیکھتے ہیں۔ نماز بھی پڑھ لیں گے۔ مہرانساء بولی۔

''ارے اِن مسجد کے رکھوالوں نے گھسنے تو دینا نہیں۔''

''چلو کہیں تو دھکا دیں گے ہی نا۔''

جامع الالفر Jamil-ul-Alfar مسجد اپنے وسیع و عریض وجود پر پھیلی شوخ وشنگ رنگ کی ڈیزائن کاری کے کارن دور سے اپنے کچھ خاص ہونے کا بتلاتی تھی۔بعض عظیم پرشکوہ مسجدوں کا وہ پُروقار سا جلال و جمال،اُن کی پیشانی اور سینے پر پھیلی کھتی کندہ کاری جیسی خصوصیت یہاں کو مفقود تھیں۔تا ہم اس کی وسعت،بلند و بالا قامت اور شوخی متاثر کرتی تھی۔حسب معمول عین ہماری توقعات کے مطابق نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ملی۔اندر بھی نہیں جانے دیا۔ملحقہ عمارت میں جانے کا کہا گیا۔یہ شاید خواتین کیلئے تھی۔ہم بھی چونکہ ذہنی طور پر تیار تھے اس لیے کسی بحث و مباحثے کے چکر میں نہیں پڑے۔چلو کچھ ٹانگیں تو سیدھی ہوں گی۔سوچا اور وہیں چلے گئے۔صبح سے نکلے ہوئے تھے۔یہ پیٹھ Pettah کا علاقہ تھا۔کہہ لیجیے بازاروں اور کاروباری دُنیا کا گڑھ تھا۔

ڈچ میوزیم کو دیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔مگر جب باہر نکلے تو ایک ساؤتھ افریقن جوڑا ملا جس نے ہم سے میوزیم کا پوچھا۔ہمیں تو خود معلوم نہیں تھا ہم نے کیا راہبری کرنی تھی؟معذرت کرتے ہوئے یونہی خیال آیا کہ یار نتھی ہو جائیں ان کے ساتھ۔چلو کچھ دیکھ ہی لیں گے۔پوچھا کہ ساتھ چلیں تو ناگوار تو نہیں ہوگا۔لو وہاں تو باچھیں کھل گئیں۔اب رکشا لیا۔اُس نے چاروں کو اُس میں سہولت سے ایڈجسٹ کرلیا۔تا ہم دھوپ چمک رہی تھی اور ٹریفک کا رش بے بہا تھا۔سانس رکتی تھی اور رکشا جوں کی رفتار سے چلتا تھا۔

باہر کی دنیا رش اور نفسا نفسی کی جس لپیٹ میں تھی۔اندر اتنا ہی پرسکون ٹھنڈا اور خاموش تھا۔ٹکٹ مہنگا تھا۔تا ہم عمارت،سرسبز لان اور اُسمیں بنا کنواں سب مزے کے تھے۔اندر کمروں میں جزیرے پر ڈچ دور کے حکمرانوں کے سامان تھے۔فرنیچر،کتابیں،کراکری،کرسیاں،میزیں،نقشے،دیواروں پر ٹنگی تصویریں اور پوٹریٹ۔

مہرالنساء اِس سب پر کچھ اتنی زیادہ خوش نہیں تھی کہ وقت اور پیسہ ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔یہاں ہے کیا؟میں خاموشی سے اُسے بولتے،سنتے اور چیزوں پر نظریں جمائے سوچتی رہی کہ یہ کیسی احمق ہے؟بھرے میلے میں چند لمحوں کیلئے رُک کر گزرے کل کے وقت کی ریت پر چھوڑے نشانوں کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچنا،کچھ غور کرنا کتنا دلچسپ اور

مزے کا کام ہے جو یہ کرنا ہی نہیں چاہتی۔

کمرے میں دھری واحد کرسی پر مجھے مٹی کی ہلکی سی تہہ نظر آئی تھی جیسے صفائی اوپرے اوپرے انداز سے کی گئی ہو۔میوزیم کے کمروں میں دیواروں پر دو پوٹر یٹ مقامی لوگوں اور ڈچ سپاہیوں کے درمیان جنگ و جدل کے تھے۔لاشیں بکھری ہوئی، ہیبت،تلواریں ،دھویں کے بادل،واہ مداری تماشے کرتے تھے۔صدیوں سے یہی تماشے ہوتے چلے آئے ہیں اور ہوتے چلے جائیں گے۔اورصرف باقی ایک نام نے رہ جانا ہے۔

باہر نکل کر افریقن جوڑے سے مسکراہٹوں کے تبادلے اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے رخصت چاہی۔میں سری لنکا پریس انسٹیوٹ جانا چاہتی تھی جو کہیں کولمبو 6 میں فورزروڈ پر تھا۔ابھی کسی رکشے کو پکڑنے کی کوشش میں ہپوہان ہورہے تھے کہ مصیبت نے دھرلیا۔سڑک کے پار کسی خالی رکشے کو اشارہ کرتے ہوئے مہرانساء نے آگے اور میں نے پیچھے سے سڑک پار کرنے کی کوشش کی۔

پل جھپکنے میں ہی مہرانساء سڑک پر گری پڑی تھی اور بریکوں کی چرچراہٹوں کا شور سارے میں گونج رہا تھا۔جس گاڑی کے سامنے گری اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے مرد نے برق رفتاری سے باہر نکل کر اُسے اٹھایا۔پاکستانی جان کر سیکنڈوں میں پچھلی سیٹ پر اُسے اور مجھے بٹھایا اور ہاتھ سے رُکی ٹریفک کو سب ٹھیک کا ہے سگنل دیتے ہوئے گاڑی چلا دی۔

بڑی ڈرامائی سی صورت پیدا ہوئی تھی۔یہ مقام شکر تھا کہ مہرانساء ٹھیک تھی۔اس کی فیشنی جوتی پھسل گئی تھی۔نوجوان پاکستانی سفارت خانے میں سیکنڈ سکریٹری تھا۔مجھے ہنسی آئی کہ پردیس میں درد ملاتو دوا بھی اپنے نے دی۔

گاڑی بگٹٹ بھاگتی ایمبیسی آگئی۔سفیر صاحب پاکستان گئے ہوئے تھے۔فرسٹ سکریٹری اپنی بیوی اور پاکستان سے سیر سپاٹے کیلئے آنے والی دو عدد سالیوں کے ساتھ کینڈی تھے۔مستعد نوجوان نے چائے منگوائی۔مزے دار بسکٹ ساتھ تھے۔میرے بارے میں جان کر بولا اچھا تو آپ اسی لیے سری لنکا پریس انسٹیوٹ SLPI جانا چاہتی تھی۔

مقصد تھوڑی سی واقفیت اور کچھ حالات سے آگاہی کا تھا کہ میں رائٹرز گلڈ کے بارے میں جاننا چاہتی تھی کہ عصر حاضر کے ادیبوں سے ملاقات کا کچھ سامان ہوجائے۔

انور زاہد بڑا مستعد، ہر سطح پر ملک کی نمائندگی کا خواہاں اور فعال قسم کا سفارت کار تھا۔ پریس سے اُس کے تعلقات ٹھیک ٹھاک لگتے تھے۔ انگریزی کے اخبارات "سنڈے لیڈر"، تامل اخبار Thinakkural، اخباروں کے پتے لکھوائے، اوقات بتائے کہ کب اُن سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ سنڈے آئی لینڈ کے چیف ایڈیٹر مانک ڈی سلوا کا فون نمبر لکھوایا۔ اور جب میں نے سری لنکا میں صحافت اور صحافیوں پر اُس کی رائے لینی چاہی۔ اُس کے ہاں کہیں کوئی ابہام یا رائے میں پس و پیش نہیں تھا۔ وہ بڑا واضح تھا۔

سری لنکا میں صحافت ایک خطرناک رسکی کام ہے۔ اٹھارہ انیس سال سے تاملوں اور حکومت میں جاری جنگ میں میڈیا ایک اہم اور متاثر کردار کے طور پر بہت نمایاں ہوکر سامنے آیا ہے کہ جہاں انہوں نے حکومت، فوج یا بیوروکریسی کے خلاف لکھا یا زوردار آواز بلند کی۔ وہیں انہیں ٹھکانے لگا دیا گیا۔

صحافیوں کا ایک طبقہ تاملوں کے ساتھ ڈائیلاگ چاہتا ہے مگر فوج اس کے حق میں نہیں۔ ان کے پاس اس ضمن میں دلائل ہیں۔ سہولتوں کے تعلیم اور روزگار کی فراہمی کے۔ ’’اللہ یہ تو بالکل پاکستانی صورت حال ہے۔ واقعی اگر ہم نے ہنگامی بنیادوں پر تعلیمی میدان میں کام کیا ہوتا۔ مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب کو موجودہ تعلیمی نظام سے ہم آہنگ کیا ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو رہا ہے۔

پاکستان کی طرح لفافہ سسٹم، مراعات اور نوازشات کی صورت کیا ہے۔ میرے پوچھنے پر پتہ چلا سب چل رہا ہے۔ صدور، وزیراعظموں اور وزیروں کے ساتھ ہنی مون کے سلسلوں کا زور و شور۔ ان کی انتخابی مہمات میں سپورٹ بعد میں تعلقات کی خرابی اور قتل و اغوا اور کہیں انعامات کی بارش میں نہلائی سب قباحتیں یہاں عروج پر ہیں۔

دو گھنٹے کی اس نشست میں اس نے مجھے بھی کرنے کو ایک کام دے دیا۔ میں نے کہا بھی کہ میں نہتی عورت نہ میرے پاس کوئی سفارش نہ تعلقات۔ مگر وہ مصر تھا کہ اس نے بہتری کوشش کر ڈالی ہے۔ بس تھوڑی سی کامیابی اُسے ضرور حاصل ہوئی ہے۔ مگر وہ مزید تعاون چاہتا ہے۔

’’ارے یہ لوگ دیوانے ہیں ڈراموں کے۔ ہم نے ڈراموں کی دو سیریل جو یہاں دکھائی ہیں۔ انہوں نے ہمیں غیر معمولی پذیرائی دی ہے۔ ہمیں اِس شعبے میں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔

انورزاہد ملاّ کی ڈور مسیت تک۔بشریٰ انصاری مجھے بڑی بہن کا سا مان دیتی ہے۔اُسی کوممکن حد تک قائل کروں گی ۔باقی وعدہ نہیں ۔

کوئی چار بجے ایر پورٹ کیلئے نکلے۔

ٹی وی لاؤنج اس وقت خالی تھا۔ایک خیال،ایک احساس نے اندر جھانک کر کہا تھا۔یہ چمن یونہی رہے گا اور ہم سب اپنی اپنی بولیاں بولتے اڑ جائیں گے۔کتنی صداقت، کتنی حقیقت ۔آبادرہو،شادرہو۔امن کا گہوارہ بنو۔

راستے میں رک کرانناس لیا۔کٹوایا۔لفافے میں ڈلوایا کہ چلو انتظار کے لمحوں میں مُنہ چلتارہے گا۔

سامان چیکنگ کے مرحلے میں اِس سوال کی تو توقع ہی نہیں تھی جو ہوا۔

''آپ نے کوئی چیز نہیں خریدی۔چائے نہیں، جم نہیں، گولڈ کی کوئی چیز نہیں ۔کوئی سووینیر نہیں ،کوئی لکڑی کا مجسمہ کندہ کاری سے سجا،بانس سے بنا کوئی تحفہ،کوئی ڈانسنگ ماسک، Brassورک کی کوئی سوغات ۔

مجھے محسوس ہوا تھا جیسے وہ لڑکا صدمے کی سی کیفیت میں ہو۔میں نے اس کے دُکھ کو سمجھا۔اس کا اتنا خوبصورت ملک اتنی سوغاتوں والا۔اور میرا چھوٹا سا اٹیچی کیس کسی فقیر فقرے کی کٹیا کی طرح خالی خالی،اجڑا اجڑا سا۔

میں نے انتہائی پھرتی سے اپنے چار جوڑے کپڑوں کے درمیان رکھی کتابوں میں سے پہلی کتاب اٹھائی ۔اُسے دکھائی اور بولی ۔

''اسے دیکھو یہ تمہارے بہت بڑے لکھنے والے اشوک فیری Ferry کا خوبصورت ناول ہے ۔ The good little Ceylonese girl۔میں نے دوسری کتاب اٹھائی ۔اس کے چہرے کے سامنے کی۔یہ The moon in the

water تھی۔پھر مزید The Prisoner of Paradise،اور Tread
Softy۔"

نچلی تہوں سے Insight Sri Lanka جیسی بھاری بھرکم اور
Sri Lanka بھی ہاتھ میں پکڑ کر لہرا دیں۔

"بولو۔کہو۔ابھی بھی شکایت ہے کہ میں نے کچھ نہیں خریدا۔میں تو اپنے ساتھ تمہارا سارا ملک لے کر جا رہی ہوں۔لڑکا مسکرایا۔میرے ہاتھوں کو تھاما اور بولا معاف کر دیجیے گا۔"

"جیتے رہو۔تم اور تمہارا ملک آباد رہے۔شاد رہے۔"

میری ہندیاترا

باب نمبر:۱ پٹیالہ

۱۔ **پٹیالہ یونیورسٹی میں کھانے کیلئے ہندوستانیوں کی قطاریں جبکہ پاکستانی کواچی گائیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔**

۲۔ **کلدیپ نائر کی طرف سے پیش کردہ تجاویز فی الوقع بڑی معقول اور قابل عمل تھیں۔**

۳۔ **شیش محل پٹیالہ کی دیواروں پر کانگڑہ اور راجستھانی فنکاروں کا فن دیو مالائی کہانیوں کی صورت بکھرا ہوا ہے۔**

پہلے چھٹی ملی پھر تھوڑی دیر بعد ہی ہوا میں تیرتی اُس دل کش و دلربا حسینہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔

یہ ڈاکٹر شائستہ نزہت تھی جو فون پر مجھ سے مخاطب تھی۔

''وزیر اعلیٰ پنجاب جناب پرویز الٰہی بھارت کے شہر پٹیالہ میں ہونے والی ورلڈ پنجابی کانفرنس کے مہمان خصوصی ہوں گے۔ آپکا نام اُن کے ساتھ جانے والے وفد میں شامل کیا گیا ہے۔ کاغذات فوراً بجوائیے''۔

''نزہت اگر تم سامنے ہوتیں تو میں تمہارا منہ چوم لیتی۔ ہندوستان جانے کی دیرینہ تمنا بر آنے کا کتنا خوبصورت موقع مل گیا ہے۔''

میری آواز کی پور پور میں خوشی کی لہریں رقصاں تھیں۔ کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھا۔ نومبر کا آسمان نکھرا نکھرا، کھلا کھلا، ہنستا مسکراتا محسوس ہوا تھا۔

کسی بھی ملک جانے کے لیے اتنی پابندیاں اور سختی نہ تھی جتنی ہمسائیوں نے اپنے گھر آنے کیلئے عائد کر رکھی تھیں۔اور سچی بات ہے انکے گھر جانے کی بھی بڑی حسرت اور تمنا تھی۔دونوں گھوانڈیوں میں بہت سے معاشرتی اور تہذیبی ناطوں میں خاصی کوڑی قرابت داری ہونے کے باوجود ایک دوسرے دیکھنے اور جاننے کو دل تھا کہ مچل مچل جاتا تھا۔اِک آہ سی سینے میں اکثر و بیشتر بھانبڑ مچاتی رہتی تھی۔

جالندھر تو یوں بھی جنم بھومی تھی۔اپنی جنم بھومی میں تو بندے کی جیسے نال گڑی ہوتی ہے۔

جانے کا نشہ دو آتشہ ہو رہا تھا کہ کم و بیش سب سہیلیاں جا رہی تھیں۔ایک سرکاری وفد اور دوسرا غیر سرکاری۔دراصل کچھ ماہ قبل وزیر اعلیٰ پرویز الٰہی کی دعوت پر انڈین پنجاب کے وزیر اعلیٰ کیپٹن (ر) امریندر سنگھ لاہور آئے تو وقت رُخصت انہوں نے اپنے ہم منصب وزیر اعلیٰ کو تو سرکاری طور پر مدعو کیا پر اپنے یار دیرینہ فخر زمان کو بھی دعوت دے گئے۔

فخر زمان جو ورلڈ پنجابی کانگریس پاکستانی چیپٹر کے چیئرمین اور روح رواں ہیں۔ پاک بھارت امن دوستی کی کاوشوں کے حوالے سے بھی اُنکا نام بڑا معتبر ہے۔بھارتی پنجاب کے وزراء سفراء سے گہرے تعلقات ہیں۔ہریانہ کے وزیر اعلیٰ اوم پرکاش چوٹالہ بھی اُنکے پگڑی بدل بھائی بنے ہوئے ہیں۔

اوم پرکاش چند ماہ قبل ہی اپنے مقدس مقامات کی زیارت کیلئے لاہور آئے تھے۔سوہدرہ میں بھائی کنہیا لال کے کنوئیں سے پانی کی بھری مشک بھی تبرک کے طور پر ہریانہ لے کر گئے تھے۔اور جاتے جاتے فخر زمان کو دعوت بھی دے گئے۔

اب اِن مشترکہ دعوت ناموں سے لکھاریوں کی تو موجیں ہو گئیں۔جو سرکاری وفد میں شامل ہونے سے رہ گئے انہیں فخر زمان گروپ نے پذیرائی دی۔ہماری کوڑی سہیلی سیما

پیروز کے میاں پیروز بخت قاضی اگر سرکاری وفد میں تھے تو سیما فخر زمان گروپ میں ۔نیلم احمد بشیر، پروین عاطف ،بُشریٰ اعجاز ،ثروت محی الدین ، فرخندہ لودھی سب اکٹھی تھیں ۔بچوں جیسا اضطراب اور خوشی رگ رگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی ۔دن میں کوئی دسیوں بار ایک دوسرے کو فون کیئے جاتے ۔کپڑوں پر تبادلہ خیال ہوتا ۔ جوڑے کتنے اور کیسے ہونے چاہییں؟ دعائیں مانگتے ۔

''ہائے ربّا چلے جائیں ۔بیچ میں کوئی پھڈا نہ پڑے ۔اللہ میاں جی گھر اور باہر سب جگہ خیریت رہے ۔''

شہزاد قیصر ہمارے سربراہ تھے ۔وزیر اعلیٰ کی آمد دو دن بعد تھی ۔

واہگہ بارڈر پر دونوں وفد اکٹھے ہو گئے تھے ۔سہیلیوں نے ایک دوسرے کو جپھیاں ڈالیں ۔منہ ماتھے یوں چومے جیسے زمانوں کی بچھڑی ہوئی ہوں ۔بڑا رش تھا۔ڈاکٹر شائستہ نزھت سر چھینک ،کاغذات کی خانہ پُری میں خود بھی جُتی ہوئی تھی ۔

چلیئے کاغذات کی خانہ پُری مکمل ہوئی ۔جانے کا اذن ملا ۔اپنے اپنے اٹیچی کیسوں کو دھکیلتے ،باب آزادی کو دیکھتے ،اُسپر لہراتے جھنڈ ے کیلئے دعائیں مانگتے ،قُلیوں کے سروں پر سامان کے ڈھیر اُنکے لاغر سے بدنوں کو گھورتے ،تجسس کی کُھلی آنکھیں چہار سو دوڑاتے ،ہندوستانی علاقے میں داخل ہو گئے ۔اٹاری بارڈر ۔قدموں کی چھوٹی سی گنتی نے ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل کر دیا تھا ۔پل جھپکتے میں سارے جذبات بدل گئے ۔ ہر شے اجنبی ہو گئی ۔

پہلا موازنہ دونوں ملکوں کی امیگریشن آفس کی عمارات اور طریق کار کا ہوا ۔ ہندوستان کو دُکھ کے ساتھ نمبر زیادہ دینے پڑے ۔اپنے حکمرانوں پر لعن طعن اور پھٹکار بھیجی کہ اللّے تللّو ں سے فرصت ملے تو قوم کا سوچیں ۔ماحول اور لوگوں کے رویّو ں سے متعلق

عناصر کو آنکھوں میں فٹ ترازو میں تولتی امیگریشن کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی تو اُدھیڑ عمر کے سکھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تہاڈا خط تے بڑا سوہنا اے۔''(تمہاری لکھائی بڑی خوبصورت ہے)

میں تو اتنے ڈھیر سارے سکھوں کو ہی شوق و تجسّس کی بلندیوں سے مسلسل تا نک رہی تھی کہ ایسا پیارا کمپلیمنٹ ملا۔شکریہ ادا کیا اور محبت سے اُسے دیکھا۔یہ میٹھے بول اور ایک دو تعریفی جُملے بھی کیا چیز ہیں کہ دل کی دنیا کو پل میں ہی زیرزبر کر دیتے ہیں۔

کسٹم کے مراحل سے نکلے تو کسی نے کرنسی کی بابت پوچھا۔مجھے ضرورت نہیں تھی۔میاں نے ایک دن قبل بندوبست کر دیا تھا۔

باہر گاڑیوں کا ایک ہجوم تھا۔گیندے کے ہارمنوں کے حساب سے تھے۔ڈھول تھے۔اور رنگارنگ شلوار قمیضوں،ساڑھیوں اور پگڑیوں والوں کے جھرمٹ میں بڑا والہانہ استقبال تھا۔کوئی دو گھنٹے محبت و پیار کے کُھلے عام مظاہروں میں صرف ہوئے پھر گاڑیوں میں لدلدائی ہوئی۔پولیس کی ٹولیوں اور انکی گاڑیوں نے ہمیں آگے پیچھے سے اپنے حصار میں لے لیا۔یہ حفاظتی اقدامات تھے۔ہم پر بے اعتباری تھی یا ہماری حفاظت مقصود تھی۔نیتوں کا حال تو میرا رب جانتا ہے۔

ہائے منظروں میں کتنی اپنائیت اور یکسانیت تھی؟ ذہن تو فوراً ہی اپنے اور ہمسائے کے تقابلی جائزوں میں جُت گیا۔سڑک کی کشادگی بس مناسب تھی۔اطراف میں تاحدنظر کھیتوں کا پھیلاؤ،سڑک کنارے جنج گھر جواب میرج ہال بن گئے ہیں بڑی چھب دکھارہے تھے۔چھوٹے چھوٹے کارخانوں کی خاصی کثرت تھی۔

کہیں کہیں ماٹھے گھروں کی دیواروں پر چِپاں اُپلوں کی گلگاریاں،کہیں کوڑے اور روڑیوں کے ڈھیر،کہیں جانوروں کے ریوڑ،چلتے ٹیوب ویل جنکی موٹی دھاریں گویا جیسے

مائع چاندی بہہ رہی ہو۔کہیں عالیشان گھر، کہیں سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے گندے نالوں سے اُٹھتی بدبوئیں، گاؤں اور قصبوں کے بے ہنگم سے پھیلاؤ خاصے مُطمئین کرنے والے تھے۔

اندر کہیں اطمینان بھری سرگوشی سی تھی کہ بھئی یہ سب کچھ تو اپنے جیسا ہی ہے۔آخر کو ہم ایک ہی ہیں۔

بس انہی موازنوں میں امرتسر میں داخلہ ہوا۔شہر بھی جانا پہچانا سا لگا۔بس ایک منظر بڑا مختلف تھا۔لڑکیاں گھیر دار شلواریں اور کہیں جینز پہنے سکوٹروں پر بیٹھی تتلیوں کی طرح اُڑتی پھرتی تھیں۔

''ہائے کہیں یہ منظر کاش میرے لاہور کی سڑکوں پر ہوتا۔مار ڈالا ہمیں تو ملائیت کی انتہا پسندی نے۔''

چائے تھی۔محبت کی گرمی تھی۔خوشبوں کی مہکار تھی۔امرتسر کے ذائقے دار سموسے اور مٹھائیاں تھیں۔خوش آمدید کہنے والے بچوں بچیوں کے شوخ وشنگ کرتے، لاچے اور گھیر دار شلواروں قمیضوں میں سروں کو ڈھانپے گوٹے لگی چنریوں کی بہار تھی۔

جالندھر میں سے گزرتے ہوئے جی چاہا تھا اُتر جاؤں۔کوئی چار کوس پر سمّی پور نام کا گاؤں تب تھا۔جہاں بس بیٹھی حسرت سے باہر تکتی اِس عورت کے اندر کی بچی نے جنم لیا تھا۔پتہ نہیں وہ گاؤں اب وہاں ہے بھی یا مٹ مٹا گیا۔

اُس وقت جانے کیوں میرا جی چاہا میں دروازہ کھول کر چھلانگ ماروں اور بھاگتی بھاگتی اُس گاؤں چلی جاؤں جسکے ہجر میں میں نے اپنی ماں اور ماسیوں کو آہیں بھرتے دیکھا تھا۔جو اُنکا دیس تھا۔جنکی گفتگو کی ہر تان ''دیس'' کے ذکر پر ٹوٹتی تھی۔

اپنی اِس احمقانہ سی خواہش پر ہنسی بھی آئی۔آنکھیں بھی گیلی ہوئیں کہ ماں یاد آئی

تھی۔

لُدھیانے میں استقبال بہت شاندار تھا۔ڈھول ڈھمکوں اور بھنگڑوں نے فضا کو گرما رکھا تھا۔لدھیانہ ساحر کا شہر ہے۔لدھیانہ کیول دھیر کا شہر ہے۔اِنسانیت کے علمبردار پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت کرنے والے ڈاکٹر کیول دھیر جنہیں ساحر سے محبت ہے جو ہر سال جشن ساحر مناتے ہیں۔لدھیانے کو روشنیوں سے سجا اور جگمگا دیتے ہیں اور پاکستانیوں میں ساحر ایوارڈ بانٹتے ہیں۔

شُدھ پنجابی میں لپٹی یہ تقریریں ہمارے پلّے تو کچھ زیادہ نہ پڑیں تاہم لوگوں کے چہروں پر بکھرے سُچے اور سچے جذبات ہی یہ سمجھا رہے تھے کہ یہ سب چاہتوں سے یہاں آئے ہیں اور ملنے کے متمنّی ہیں۔

اب رات ہوگئی تھی۔رات میں پٹیالہ کا حُسن تو کیا نظر آتا۔البتہ بس میں بیٹھے لوگوں کے تبصروں نے خوب ہنسایا۔عقبی نشستوں سے آواز آئی تھی۔

''بھئی پٹیالہ میں کیا چیزیں دیکھنے والی ہیں۔''

ایک تیکھی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''پٹیالہ کی عورتوں کی چال۔موریوں کو تو ایسے ہی ہم لوگوں نے ٹلّے پر چڑھا رکھا ہے۔اُنکی چال پر محاورے گھڑ لیے ہیں۔کوئی پٹیالے کی عورتوں کو دیکھے۔شاہانہ انداز سے چلتی ہیں کہ بندے کا کلیجہ پھڑکنے لگتا ہے۔

میں نے گردن موڑی کہ ایسی خوبصورت بات کہنے والے منچلے کو تو دیکھوں۔مگر عقبی نشستوں کے سہارے اتنے اونچے تھے کہ کسی چہرے کو دیکھنا گویا ہمسائے کی اونچی دیوار سے تانکا جھانکی کی ناکام سی کوشش تھی۔

ایک آواز اور اُبھری۔

''یہاں کے پراندوں کا بھی جواب نہیں۔ اتنے خوبصورت جیسے قوس وقزح کے رنگوں میں غوطے کھائے ہوئے ہوں۔ سلمے ستاروں میں گندھے، اشکارے مارتے، دلوں میں ہلچل مچاتے۔''

ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

''دیکھو تو ذرا اِن کمبختوں کی ڈبی سوئیاں صنف نازک کے گرد ہی گھوم رہی ہیں۔

پھر ایک نسوانی آواز نے جیسے ہنسی کا گولہ چھوڑا۔

''ارے بیبا اِن عورتوں کی جوتیاں بھی شاندار ہیں۔ کسی نے اُن کے رعب ودبدبے کا مزہ چکھا ہے۔''

اِس پر شور وغوغا ہوا۔ بہر حال کھٹے میٹھے تبصروں میں پٹیالہ آ گیا تھا۔

یونیورسٹی کے وسیع وعریض لانوں میں عشائیہ تھا۔ کھانے کے لیے ہندوستانیوں کی قطاریں تھیں جبکہ پاکستانی گواچی گائیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ کھانوں میں ورائٹی تھی۔ مقامی رنگوں کا ٹچ تھا۔ چپہ بھر سائز کی روٹیاں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ایک روٹی اگر ہم جیسی شہری عورتوں کی تین چار بُرکیوں کی مارتھی تو پنجاب کے جیالوں کا تو بس ایک نوالہ تھا۔

رات کو بڑا ہنگامہ رہا۔ سرکاری وفد کے دو بسوں کے مسافروں کیلئے تو کہیں پٹیالہ میں ٹھور ٹھکانہ نہ تھا۔ گاڑیوں میں لد کر 69 کلومیٹر پرے چندی گڑھ جانا پڑا تھا۔ راستے میں منو بھائی کی پھلجڑیاں تھیں۔ شاید پی کچھ زیادہ گئے تھے۔ ہمارے مایہ ناز کمپیئر طارق عزیز اور اُنکے ساتھی کارٹونسٹ جاوید کی گھمبیر سی خاموشی تھی۔

چندی گڑھ کا ویزہ نہ ہونے اور ہوٹلوں میں فوری کمروں کی دستیابی نے بسوں میں

بھرے لوگوں کو پریشان تو کیا مگر وفد کے سربراہ ڈاکٹر شہزاد قیصر کی بھاگ دوڑ نے حالات کو نارمل رکھا۔بہر حال کوئی آدھی رات آ گے اور آدھی پیچھے دو تین ہوٹلوں کے آ گے اُترائی اور چڑھائی کے تکلیف دہ مرحلوں سے جان خلاصی ہوئی۔

صبح پھر ناشتے کے بغیر ہی گاڑیوں میں لدلدائی شروع ہوگئی۔کیمپس میں ناشتے کا انتظام اعلیٰ درجے کا تھا۔

ہندوستان میں اخبارات کِس حد تک آزاد ہیں اُسکا اندازہ پہلی صُبح ''دی ٹریبون'' کو دیکھنے سے ہوا۔فرنٹ پیج پر پہلی بڑی رنگین تصویر اُن مظلوم کشمیری خواتین کے واویلا کرنے کے دُکھی انداز کی تھی جو وہ بھارتی فوجی کے سامنے گھر کے بوڑھے آدمی کے پکڑے جانے پر کر رہی تھیں۔

یہ یقیناً خوش آئند بات تھی کہ تقریب میں 22 ملکوں سے آئے ہوئے مختلف علوم کے ماہر مختلف ہالوں میں ہونے والے سیشنوں میں اپنا اپنا علم بانٹ رہے تھے۔پاکستانیوں کے مقالوں کو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں سراہا بھی گیا۔یہ امر تھوڑا سا افسوسناک بھی ہے کہ اِن سیشنوں میں پاکستانیوں کو بھرپور انداز میں شرکت کرنی چاہیے تھی۔بہت سے یار دوست تو لگتا تھا جیسے کھانے پینے اور سیر سپاٹے کیلئے ہی آئے ہوں۔ ہمہ وقت باہر ہی گھومتے پھرتے دیکھے جارہے تھے۔

پہلے اور دوسرے دن مقالوں کی بھرمار رہی ۔پٹیالہ یونیورسٹی کے پروفیسر بہل کی تیار کردہ کمپیوٹر سوفٹ ویئر کی رونمائی بھی ہوئی جو صرف ایک کمانڈ سے شاہ مکھی اور گورمکھی کے سکرپٹ ترجمہ کرنے کی اہل تھی۔اِسے بہت سراہا گیا اور یہ امید کی گئی کہ اس سے دونوں پنجابوں کے ادیبوں میں مزید محبت اور یگانگت بڑھے گی۔

کلدیپ نائر بڑے دردمند ہندوستانی ہیں۔وہ ہندوستان کے انتہا پسندوں کے

نزدیک پاکستانی ایجنٹ خیال کیے جاتے ہیں ۔معتدل سوچ رکھنے والے کلدیپ نائر کی طرف سے جوتجاویز پیش ہوئیں وہ فی الوقع بڑی جامع اور قابلِ عمل تھیں ۔

ان کی تقریر کے بنیادی نکات میں اِن امور پر زور تھا کہ جنگ نے کبھی مسائل حل نہیں کیے۔اکسٹھ سال پہلے جوظلم اور خون خرابے دونوں جانب سے ہوئے اُن پر ایک دوسرے سے بغیر الزام تراشی کے معافی مانگی جائے ۔نومین زون والی جگہ پر ایک میوزیم بنایا جائے ۔اُن کا کہنا تھا کہ اگر دنیا کی ایک چھوٹی سی قوم یہودی ایک ایسا میوزیم بنا سکتی ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟ دونوں پنجاب اپنی ایک مشترکہ مارکیٹ بنائیں ۔

انہوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی راہ میں روڑے اٹکانے والے عناصر کا بھی تفصیلی تجزیہ پیش کیا،نیز امن کی ضرورت پر بہت زوردیا۔کلدیپ نائر کو بہت توجہ اور دلچسپی سے سُنا گیا ۔

پٹیالہ یونیورسٹی کے سینئر پروفیسر مانک میاں نے اپنی تقریر میں کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اس issue سمیت سب معاملات پر بات چیت ہونی چاہیے ۔انہیں بھی بہت سراہا گیا۔

پوربی پنجاب اپنے کلچر میں کس قدر امیر ہے ۔اسکا اندازہ اُس شام ہوا جب لڑکیوں نے گِدّا ڈالا ۔سُچا،سچا اور کھرا روایتی گِدّا،پاؤں کی مخصوص بیٹ اور رسٹائل آواز کا کھرج،تالی کا ردّھم اور مکمل روایتی کاسٹیوم ۔ ہمارے گاؤں میں اب یہ سب نظر نہیں آتا ۔بیچارے سادہ لوح دیہاتیوں کی سوچیں مشرف بہ اسلام ہوگئی ہیں ۔

بھنگڑے راجستھانی رقص اور کتھک ناچ سبھوں نے دل خوش کیا ۔سب سے بڑھ کر ہنس راج ہنس کے خوبصورت گانوں اور نصرت فتح علی خان کے حضور انکا نذرانہ عقیدت ۔ہماری تو آنکھیں گیلی ہوگئی تھیں ۔

تاہم اس شام کا میلہ طارق عزیز نے لوٹا۔ پاکستان کے نمائندے نے اپنی پاکستانیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے جذبات کو بہت خوبصورتی اور حُسن دیا۔ بہت سراہا گیا انہیں۔

کلچر کا تعلق زمین اور رہتل کی ایک جیسی بے شمار چیزوں کی مماثلت کے ساتھ ہی نہیں جڑا ہوتا۔ مذہب جیسا اہم فیکٹر بھی اسپر اثر انداز ہوتا ہے۔ دونوں حصوں کے کلچر کا موازنہ کرتے ہوئے یہ بات ہمارے مدّنظر ہونی چاہیے۔ تاہم ہمیں اپنے ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے کی اشد ضرورت ہے جواب معدوم ہوتا جارہا ہے۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ اس کانفرنس کے مہمان خصوصی تھے۔ الیکٹرونک میڈیا پر تو انہیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ پرپرنٹ میڈیا نے انہیں بھرپور کوریج دی۔ ممتاز ہندوستانی اخبارات کے صفحات پر وہ روسی صدر پیوٹن سے زیادہ اہم نظر آئے تھے جو اِن ہی دنوں ہندوستان کے دورے پر تھے۔

سبھی کچھ اچھا تھا۔ وائس چانسلر سے لے کر پروفیسروں اور طلبہ و طالبات کے رویّے اور شاندار کلچرل شو۔ بس اگر کچھ کھٹکا تھا تو وہ باتیں تھیں جو سرِ عام ہوئیں۔

افتتاحی اجلاس میں پنجاب کی ڈپٹی وزیر اعلیٰ میڈم ٹھل سے لے کر بعض ذمہ دار لوگوں کی باتوں تک کہ جنہیں لکیر کے کھینچنے کا دُکھ تھا۔ روایات اور رہتل کے ایک ہونے اور ایک ویہڑے کے دو ویہڑے ہو جانے کا بھی قلق تھا۔

کچھ ایسی تجاویز، کچھ ایسی باتیں کہ یہ پھر دو سے ایک ہو جائیں۔ ہمارے جیسے لوگوں کیلئے جنکی شعور کی آنکھ آزاد فضاؤں میں کُھلی تھی۔ جن کی جذباتی وابستگیوں میں اِس خطہء زمین سے محبت اور اپنائیت کے احساس کا دُور تک وہ تعلق نہیں تھا جو ہماری ماؤں، دادیوں، نانیوں کی باتوں سے چھلکتا تھا جنکا یہ دیس تھا۔

سچی بات ہے ہماری دنیا، ہماری کائنات، ہمارا اپنا ملک پاکستان ہے۔جسے ہم ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔افتتاحی سیشن میں وزیراعلیٰ پنجاب جناب پرویز الٰہی آرہے تھے۔سٹیج پر دونوں پنجابوں کے وزیراعلیٰ کیپٹن امریندر سنگھ،میڈم رُٹل سنگھ جو دیسی سادگی کی مکمل تصویر تھیں۔بڑی دل کش شخصیت کی حامل مہارانی امریندر سنگھ بھی موجود تھیں۔وہ باتیں پھر دہرائی گئیں۔میڈم رُٹل نے بڑے شہد آگیں لہجے میں کہا تھا۔دونوں بھرا(بھائی) بیٹھ گئے ہیں فیصلہ کرلیں۔ہمارا تو سچی بات ہے دم خشک تھا۔سانس روکے انتظار میں تھے کہ دیکھیں وزیراعلیٰ اُنکے جواب میں کیا فرماتے ہیں؟خدا کا شکر تھا کہ کانفرنس میں اُنکا ایڈریس مدلل،زمینی حقائق کو اجاگر کرتا،اپنے تشخص کی پہچان پر زور دیتا اور ٹو دی پوائنٹ تھا۔

اُنکے خطاب میں گردواروں کی حفاظت،ننکانہ کو ماڈل شہر بنانے کی خواہش، زراعت اور ریسرچ جیسے اہم شعبوں میں بھارتی پنجاب کے تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی خواہش کا اظہار تھا۔

وزیراعلیٰ اِس اہم نقطے کو بھی زیر بحث لائے کہ ہندوستان،چین،افغانستان اور وسطِ ایشیا کی ریاستوں سے پاکستان کے تعاون کے بغیر تجارتی اور مواصلاتی تعلقات نہیں بڑھا سکتا۔نیک نیتی اور خلوص سے تعلقات قائم کیے جائیں تو پاکستان کی صرف موٹروے اربوں روپیہ سالانہ ٹول ٹیکس کے طور پر کمائے گی۔اگر ایسا ہوگیا تو دونوں ملک ترقی کی شاہراہ پر تیز رفتاری سے دوڑ پڑیں گے۔

چلیے جناب ٹھنڈک اُتر گئی تھی سینوں میں۔خوش تھے کہ بے حد شائستہ زبان میں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے۔جس کی ضرورت تھی۔یقیناً شہزاد قیصر کی بریفنگ کا بھی بڑا دخل ہوگا کہ اُنکا تو مضمون بھی ذہانت اور مہارت کا خوبصورت عکاس تھا۔

سچی بات ہے مجھے تو پرویز الٰہی سے اِس درجہ فراست اور تدبر کی اُمید ہی نہیں

تھی ۔وزیرِاعلیٰ پٹیالہ امریندر سنگھ نے فخر زمان کا ذکر محبت کے ساتھ کرتے ہوئے انہیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔

فخر زمان صاحب بھارتی پنجاب کے خواص سے لیکر عوام تک کی بے حد ہر دل عزیز اور پسندیدہ شخصیت ہیں ۔کچھ سیشن انکی زیرِصدارت بھی ہوئے ۔

اب پٹیالہ یونیوسٹی میں لاکھ شیڈول سخت تھا۔بیچ بیچ میں سے دوبار میں نے اور نیلم نے ڈنڈی ماری اور رکشے میں چڑھ کر شہر کے خوبصورت شاہانہ اور امیرانہ ڈھنگ سے محظوظ ہوئیں۔راجپوت،مغل اور پنجابی ثقافتوں کے مشترکہ رنگوں سے تھوڑی سی شناسا ہوئیں ۔روایتی اور جدیدیت کے عکس چلتے پھرتے دیکھے۔

سڑکوں پر سکوٹر چلاتی لڑکیوں کا اعتماد دیکھ کر ہمارے ہوکے تھے کہ آخر ہم اپنے ہاں یہ ماحول کیوں پیدا نہیں کر سکتے کہ ہماری لڑکیاں بغیر کسی ڈر خوف کے پہیوں والی اس سواری سے فائدہ اٹھائیں ۔بےچارے باپ بھائی جو کام کاج چھوڑ کر بھاگے بھاگے انہیں سکولوں کالجوں سے پک ڈراپ کرنے نکلتے ہیں اس تکلیف سے بچ جائیں۔یقیناً نچلے متوسط طبقے کی جان ایسے بہت سے اضافی خرچوں سے بچ سکتی ہے۔

بالعموم پٹیالہ کو شاہی ریاست کہا جاتا ہے۔تقریباً دو صدیاں پرانا شہر۔

قلعہ مبارک،موتی باغ محل ،شیش محل اور میوزیم دکھانے کا تو باقاعدہ اہتمام کیا گیا۔شیش محل ہمارے لاہوری شیش محل جیسا بلاشبہ نہیں تھا مگر اسکی حفاظت زیادہ بہتر انداز میں ہورہی تھی۔کو خستگی ضرور نظر آتی تھی۔

اُسکا دروازہ رنگین نقاشی سے یوں سجا تھا جیسے سارے میں ہیرے موتی جڑے ہوں ۔یہ مہاراجہ نیریندرہ سنگھ Narendra Sing نے 1847ء میں تعمیر کروایا ۔موسیقی اور آرٹ سے محبت کرنے والا راجہ جسنے کانگڑہ اور راجستھان سے فنکار بلائے۔

جنھوں نے اسکی دیواروں پر دیو مالائی کہانیاں بکھیر دیں۔منی ایچر پینٹنگ میں جیا دیوا کی شاعری نمایاں ہوئی۔کپورتھلہ سکول کی کانگڑہ پینٹنگ میں رادھا سہیلیوں کے ساتھ دیکھ دیکھ کر میرا تو جی نہیں بھرتا تھا۔دوزخ اور جنت کے تصور پر مشتمل تصویری پیشکش۔لطف آیا تھا۔

موتی محل میں مہاراجہ امریندر سنگھ اور انکی بیگم مہارانی کی طرف سے عشائیہ کس غضب کا تھا۔ایک تو موتی محل کی سفید پرشکوہ عمارت اوپر سے شالیمار باغ لاہور جیسے وسیع و عریض لان ۔اسپر اور ستم کھانوں کی بھرمار۔اتنی ورائٹی کہ بندے کی آنکھیں تھک جائیں دیکھتے دیکھتے۔کہیں جلیبیاں تلی جارہی ہیں تو کہیں پوریاں۔اللہ مجھے تو نام بھی نہیں آتے تھے اُن ون سوئے کھانوں کے۔

مہمان نوازی کی انتہا تھی کہ کلیر کوٹلہ سے حلال گوشت اور باورچی Non veg ڈشیں تیار کرنے کیلئے بُلائے گئے تھے۔

مہارانی اور اُنکی ساس کیسی شاندار خواتین تھیں۔پڑھی لکھی،سمارٹ،خوش شکل۔
مگر یہ کہنا پڑے گا کہ پرویز الٰہی کا پورا خاندان بیوی،بیٹیاں،بہوئیں سب سیاہ عباؤں میں لپٹی اطمینان اور سکون سے نیچے دو میزوں پر بیٹھی خوش گپیوں میں مگن تھیں۔جبکہ پرویز الٰہی سٹیج پر اپنے میزبانوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ایک وضع دار گھرانہ اپنی روایات پر مطمئن و مسرور پُراعتماد اور پُریقین۔

دونوں طرف کے پیارلوگوں کا یہ بڑا بھرپور اجتماع تھا۔میل ملاقاتیں،تعارف، پرانی دوستیوں اور ملاقاتوں کے قصے،محبت بھری باتیں،شعر اور لطیفے سب چلے۔بشریٰ رحمٰن نے اپنی دلچسپ اور ہنسوڑ باتوں سے خوب رنگ جمایا۔

ہر آنکھ میں محبت اور ہر زبان پر ایک دوسرے کے ہاں جانے کی شدید خواہش کا

اظہار تھا۔لوگ پاکستان آنے کیلئے کس قدر بے قرار تھے۔کاش ہمارے بس میں ہوتا تو اسی وقت ویزے بانٹ دیتے۔

شادی بیاہ کے مسائل بھی بڑے مشترکہ تھے۔لڑکیاں زیادہ پڑھ لکھ رہی تھیں اور لڑکے غیر ذمہ دار اور لا اُبالی سے۔لڑکے والوں کے دماغ بھی ہمارے ہاں کی طرح اُسکے ذرا سی اچھی پوسٹ پر ہونے کی وجہ سے ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔وہی ایک سا کلچر۔

چند باتوں نے بہت متاثر کیا۔کھانے اور راشتے پر لوگوں کا ڈسپلن قطار کی صورت میں تھا۔ایسی لائنیں ہمارے لوگوں کو بھی بنانی چاہئیں۔شرح خواندگی بہت زیادہ تھی۔جلال پور گاؤں جہاں ہمیں لیجایا گیا وہاں کی کم و بیش ہر لڑکی ہی ایم اے اور پی ایچ ڈی کرتی ملی۔

شہر میں سائیکل رکشے دیکھ کر دُکھ ہوا۔خدا کا شکر ہے ہمارا ملک اِس لعنت سے پاک ہوا۔

ڈاکٹر شہزاد قیصر بہت مستعد اور فعال رہے۔

"پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوئج آرٹ اینڈ کلچر" کا یہ پہلا وفد تھا۔پہلا وفد اور گھر کا پہلا بیاہ دونوں تقریب کے حُسن و خوبی سے سرانجام پا جانے کے ذمہ درانہ احساس کے تحت قدرے پریشان سے ہوتے ہیں۔بعد میں تجربہ رنگ دکھاتا ہے۔

بہر حال یہ نہ صرف دونوں طرف کے لوگوں کے ساتھ ملنے کا ایک ذریعہ تھا بلکہ اپنے اپنے لوگوں کو بھی جانچا۔اور انہیں ایک دوسرے سے گھلنے ملنے کا موقع فراہم کیا۔

جونہی اپنی سرزمین پر قدم رکھا۔ڈاکٹر شائستہ نزھت کے مسکراتے ہوئے حسین چہرے نے خوش آمدید کہا۔اذان کی آواز نے جیسے اُس نعمت کا احساس دلایا جس سے ہم نوازے گئے ہیں۔میری طرح فرخ زہرہ گیلانی بھی اس سے سرشار ہو رہی تھی۔

باب نمبر:۲ جالندھر اور چندی گڑھ

۱۔ "حویلی" جالندھر شہر کا وہ ثقافتی لینڈ مارک ہے کہ جس کے اندر جانے اور اُسے دیکھنے سے پورے پُوربی پنجاب کا کلچر سامنے آجاتا ہے۔

۲۔ راک گارڈن کے پستہ قامت دروازوں کا سلسلہ دراصل نک چند کا انسان کو حلیمی، عاجزی اور انکساری کا درس دینے کی ایک شعوری کاوش ہے۔

یہ میری ہندوستان کیلئے دوسری یاترا تھی۔ ورلڈ پنجابی کانگریس کا انیس 19 رُکنی وفد فخر زمان کی زیرِ صدارت واہگہ کے راستے ایک بار پھر بھارت کیلئے روانہ ہو رہا تھا۔ اِس بار سیما پیروز اور رخشندہ نوید ہمراہ تھیں۔ ثروت محی الدین تھی۔
اِس دفعہ میں نے کوئی ستر بہتّر بار واہگہ کو جانے والی سڑک اُس پر بنی عمارتوں، راستے کی دُھول مٹی کا مشاہدہ ایک پاکستانی کی آنکھ سے نہیں بلکہ ہندوستان سے آنے والی آنکھ سے کیا۔ مجھے واہگہ پر دھول اُڑاتے راستوں، پھل، سبزی فروش پٹری واسوں اور چنگڑوں جیسے حلیے والے دوکانداروں نے کوفت زدہ کیا۔
میرے کلیجے سے ہوک سی اٹھی پتہ نہیں اندر کیوں چاہتا تھا؟ ہر چیز لش لش لشکارے مارتی ہو۔ صفائی ستھرائی کا وہ عالم ہو جو یورپ جیسے ملکوں میں ہوتا ہے۔ تقابلی جائزے میں پیچھے رہ جانا بڑی سبکی اور شرمندگی والی بات لگتی ہے۔ پر منظر تو مایوس کن ہی تھے۔

سب مراحل سے گزرتے ہوئے اٹاری بارڈر پر آئے تو ڈاکٹر رویندر کواور چندی گڑھ کے میز بانوں نے استقبال کیا۔ پیجارو ٹائپ گاڑیوں سے باہر تانکا جھانکی ضرور تھی پر وہ پہلے جیسا تجسس اور اسرار نہیں تھا۔ جالندھر کے قریب اسکے مشہور ریستوران "حویلی" میں کھانا کھانا خوبصورت اور دلچسپ تجربہ تھا۔

میری ناقص رائے میں "حویلی" جالندھر شہر کا وہ ثقافتی لینڈ مارک ہے کہ جسکے اندر جانے اور اُسے دیکھنے سے پورے پنجاب کا کلچر سامنے آ جاتا ہے۔ سیالکوٹی اینٹوں سے بنی اس عمارت کے دروازوں پر کھڑے دربان پنجابی ثقافت کے نمائندے تھے۔ دروازے سے ہی کلچر اپنی دھنک رنگ رعنائیوں سے سامنے آتا ہے۔ ایک طرف کہیں کنویں سے پانی نکالا جا رہا ہے۔ کہیں رنگ رنگیلے ٹرک میں بیٹھا سکھ ڈرائیور اُسے چلا رہا ہے۔ حسین چہروں والی دوشیزائیں پُھلکاریاں کاڑھ رہی ہیں۔ کہیں کیکلی ڈل رہی ہے اور میرے جیسی یکدم اپنے ماضی میں جا کھڑی ہوتی ہے۔ جہاں وہ دائرے میں گھومتے ہوئے اونچے اونچے گاتی تھی۔

کیکلی کلیر دی

پگ میرے ویر دی

شیشہ میری پابھو دا

سڑ فٹے منہ جنوائی دا

کہیں روٹیاں تنور میں لگائی جا رہی ہیں۔ کہیں چاٹی مدانی سے مکھن نکل رہا ہے۔ چھابوں، چھجیوں، کٹوریوں اور ہاتھ بھر لمبے گلاسوں میں لسّی۔ واقعی پنجاب کتنا رنگین ہے؟ مجھے اپنے پنجاب پر افسوس ہو رہا تھا۔ ہم نے اپنی روایات اور کلچر سے بہت دُوری کر لی ہے۔ وہ گدّے، وہ بھنگڑے، وہ ملڈیاں جو میں نے اپنے بچپن میں گاؤں میں دیکھی تھیں۔ اب مجھے وہ سب رنگینیاں گاؤں جانے پر نظر نہیں آتی ہیں۔ مذہب کی انتہاپسندی نے اسے ہندو

کلچر کہتے ہوئے صدیوں پرانی روایات کوٹھوکر ماردی ہے۔

میوزیم کا نام رنگلا پنجاب رکھا گیا ہے۔تھوڑی سی تحقیق سے جانکاری ہوئی کہ یہ کسی انجینئر کا کارنامہ ہے۔تو بھئی کیا خوبصورت کارنامہ ہے۔ ہمارے لاہور میں ایم ایم عالم روڈ پر "ولیج" میں بھی یہ سب کچھ تھوڑے،بہت فرق سے نظر تو آتا ہے۔مگر "حویلی" میں جورنگوں کی برسات ہےوہ اپنا ایک بھرپور تاثر چھوڑتی ہے۔

کھانا تھال میں دھری چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں پروسا گیا تھا۔ثابت مسور ،چاول،اچار،پنیر پالک،دہی روٹی۔واہ خوب مزہ آیا۔

''دلیجیئے بھگواڑا آ گیا۔''

گاڑی میں اُبھرتی آواز نے بے اختیار ہی ہونٹوں کو مسکرانے پر مجبور کردیا کہ کچھ یاد آیا تھا۔کسی انڈین چینل پر تھرکتا شور مچاتا ایک اشتہار جو بھگواڑہ کی بنی ہوئی ساڑھی سے متعلق تھا۔

سارے پنڈ وچ پہ گیا ساڑا (سارے گاؤں نے جلنا اور حسد کرنا شروع کردیا جونہی میں نے بھگواڑہ کی ساڑھی پہنی)۔

ہمارا پہلا پڑاؤ چندی گڑھ کا تھا۔

چندی گڑھ انڈیا کے شمالی حصہ میں پنجاب کا کیپٹل سٹی،فرانسیسی ماہر تعمیرلی کوربیوسر Le. Corbusier کا ڈیزائن کردہ شاہکار ہے۔

ہریالیوں میں گھرا،پھولوں میں ہنستا،اشجار میں سے مسکراتا ،انوکھی سی چھب دکھاتا اور اپنے اسلام آباد جیسا تاثر دیتا۔ایک خوبصورت شہر گل لالہ سے سجا پیشوائی کررہا تھا۔تھکن تو ساری اُڑنچھو ہوگئی تھی۔شوالک ویو ہوٹل شوالک پربت مالا جیسا حُسن لیئے ہوا تھا۔

خوبصورت ٹی وی لاؤنج میں ہی بتا دیا گیا تھا کہ تیار ہو کر نیچے آنا ہے کہ دیو سماج کالج میں وفد کے اعزاز میں تقریب تھی۔

استقبالیہ بڑا رنگ رنگیلا سا تھا۔ ڈھول کی تھاپ تھی۔ دل کش اور من موہنی لڑکے لڑکیوں نے رنگوں کی برسات میں جو رقص کیا اُسنے مسحور کیا۔ کالج کے آڈیٹوریم کی سٹیج پر پنجاب کے وزیر تعلیم شری ہرنام داس، جوہر کالج کی پرنسپل مسز ڈھلوں اور پٹیالہ یونیورسٹی کے رجسٹرار پرم بخشیش سنگھ فخر زماں کے ساتھ بیٹھے خوب سج رہے تھے۔ برقی روشنیوں میں نوخیز بچیاں بھی بڑی دلکش لگتی تھیں۔

وزیر تعلیم کی تقریر میں بڑا اوا لہانہ پن تھا۔ اچھا لگا۔ اگر اچھا نہیں لگا تو اُس نوخیز بچی کا انداز گفتگو جو بڑے میٹھے لہجے میں سوال کرتی تھی کہ ایک کلچر، ایک جیسی رہتل اور ایک جیسی وسیب کے ہوتے ہوئے بھلا الگ ہونے کی کوئی ضرورت تھی۔ کچھ اسی سے ملتا جلتا انداز وزیر تعلیم کے سکریٹری کا تھا۔ جو ہمیں بھارتی پنجاب کے اناج کا گھر ہونے کا مژدہ سُناتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ویزہ کی پابندیاں نرم ہونی چاہئیں تا کہ جب اور جس وقت پاکستانی پنجاب کے لوگوں کا دل چاہے بے شک سائیکلوں پر امرتسر آئیں اور گندم کے توڑے اپنے کیئر یئر پر رکھ کر لے جائیں۔

چھوٹی سی بچی کے منہ سے بڑی بڑی باتیں اور بڑے آدمی کے منہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں تکلیف دہ تھیں۔ جی تو چاہا اٹھ کر کہوں۔

”خدا کیلئے بھگوان کیلئے غصے گلے جانے دیں۔ مان لیں ہمیں۔ نصف صدی سے بھی کہیں زیادہ عمر ہوگئی ہے ہماری۔ پر سچی بات کہنا کتنا جی جوکھوں کا کام ہے۔ بندے کے نیچے یا گھوڑا ہو یا مصلحتوں سے بے نیاز ہو۔ یہاں دونوں میں سے کچھ بھی نہ تھا۔

میرے ساتھ بیٹھی سیما بڑبڑائی تھی۔

''پاکستانی تو ان کی گندم لے جائیں اور ہندوستانی لاہور سے کیا لے کر آئیں اسکا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ہمیں اِس سستی گندم کی بجائے آسٹریلیا کی مہنگی گندم قبول ہے۔''

میں نے ترچھی نظروں سے اُسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''قبول ہے۔قبول ہے۔''

افضال شاہد مرحوم کا ایک گیت 'بوہے کھول دیو' جسے شوکت علی نے کمپوز کیا تھا۔ سُنوایا گیا۔

خدا کا شکر کہ اعزاز احمد آذر نے سٹیج پر آ کر ہمارے اندر کے مچلتے جذبات کو زبان دی کہ سرحدیں تو اب بن گئی ہیں۔سلامتی امن قائم کرنے اور اچھے ہمسائیوں جیسے تعلقات رکھنے میں ہے۔اِسے مزید ٹھنڈک پرم بخشیش سنگھ کے بیان نے دی۔جنھوں نے پاکستان اور ہندوستان کو دو آزاد مُملکتیں قرار دیتے ہوئے کہا کہ سرحدیں تو قائم رہیں گی کہ تقسیم کی دستاویزات پر گاندھی نہرو، جناح اور لیاقت علی کے دستخط ہیں۔ہاں تعلقات بہت اچھے ہونے چاہیئں۔

چلو شکر کوئی تو کلمہ حق بولا۔کلچرل شو دیکھا اور واپسی ہوئی۔

میں بہت سویرے اُٹھنے کی عادی ہوں نماز سے فارغ ہو کر باہر نکل آئی۔چندی گڑھ اسلام آباد سے بہت ملتا جلتا شہر ہے۔

نو بجے سے بارہ تک تقاریر اور تجاویز کی بھرمار رہی۔دونوں ملکوں کی فوج اور بیوروکریسی ویزہ پالیسیاں نرم کرنے کی راہ میں حائل تھیں۔یقیناً دونوں کے مفادات تھے۔ لُطف آیا۔دونوں کے لتے لیے گئے۔

فائدہ؟ میں نے خود سے پوچھا تھا۔

شاید کبھی ہو۔اندر سے جواب آیا تھا۔

سیما اور میں راک گارڈن دیکھنے کے لئے مری جارہی تھیں۔ جونہی لنچ سے فارغ ہوئے اور سیر سپاٹے کے لئے گاڑی ملی بگٹٹ اس کی طرف بھاگے۔

نک چند سینی کا عظیم الشان کارنامہ۔

1924ء میں پیدا ہونے اور ایک متوسط کسان برادری سے تعلقات رکھنے والے نک چند سینی جسنے اٹھارہ سال کی عمر میں میٹرک کیا۔ جسکا گاؤں لاہور سے کوئی چھپن میل پر بریاں کلاں تھا۔ 1947ء کی تقسیم میں نقل مکانی ہوئی اور جب شوالک سلسلہ ہائے کوہ کے دامن میں چندی گڑھ شہر بسانے کا فیصلہ ہوا۔ خوش قسمتی سے اُسے چندی گڑھ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں روڈ انسپکٹر کی نوکری مل گئی ۔ سچ تو تھا کہ وہ شوالک کے پہاڑوں اور فطرت کی خوبصورتیوں سے سحر زدہ تھا۔

مرکزی دروازے پر رُک گئے تھے ۔ سنگِ مرمر کی تختی پر لکھے ہوئے کو پڑھنے کیلئے۔

اس عظیم کارنامے کا ۷ جولائی 1988ء کو افتتاح ہوا تھا۔

ایک سادہ، عام سے انسان کا عظیم کارنامہ، ایک دیسی بندے کا تخلیقی شاہکار جس کی دھوم دنیا میں مچی تھی ۔ پستہ قامت دروازوں کا ایک سلسلہ تھا۔ قدرے جھک کر ایلس ان ونڈر لینڈ کی طرح ایک نئی دنیا سامنے آتی تھی۔

یہ پستہ قامتی یقیناً قصداً اپنائی گئی تھی کہ انسان کو عاجزی انکساری اور حلیمی کا درس دینا بھی نک چند کا موٹو تھا کہ وہ بذات خود ایسا ہی ہے۔

ہر پل ایک نئی دنیا میں داخل ہوتے ہوئے میں سوچتی تھی کہ نک چند ایک خود ساختہ فنکار ہیں ۔ ایک خیال پرست مصور جسنے اپنی تخلیقات کو روپ دیا۔ ناکارہ اور دھتکاری ہوئی چیزوں سے مگر ضروری تفصیلات جن میں نفاست اور باریک بینی آتی ہیں انہیں اپنانے

سے انکار کر دیا۔

سائیکلوں کے ناکارہ حصے، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں، بلب، ٹیوبیں، بوتلوں کے ڈھکن ،ٹوٹی پیالیوں، ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتن، جلی ہوئی اینٹوں ،نائیوں کی دوکانوں کے باہر پھینکے ہوئے بال، اِس جگہ پر بنے گاؤں کو مسمار کرتے اور نئے خوبصورت شہر کی تعمیر کے دوران فالتو سامان سیمنٹ پتھر جنہیں وہ اپنی سائیکل پر جتنوں سے لاتا اور اِس خفیہ جگہ پر جو تب ایک جنگل تھی لاتا۔

اِس جگہ پر اُسکا آنا بھی ایک معجزہ ہی تھا۔کام کے دوران وہ کہیں اِس مضافاتی جگہ پر آنکلا تھا۔پرسکون درختوں اور سبزے سے گھری آبشاروں سے سجی نیلے چمکتے آسمان کی رعنائیوں بھری چھت سے ڈھکی اُس جیسے مذہبی آدمی کو بھگوان ہی متحدد روپ میں نظر آیا تھا۔

ایک اور بات بھی تھی چندی گڑھ کی تعمیر نے اُن سب لوگوں کو جو یہاں کاشت کار تھے جو یہاں رہتے تھے اور جنہیں اِس نئے شہر کے تعمیری منصوبے نے بے گھر کر دیا تھا۔ انکے بین اور آہوں نے اُسے بھی متاثر کیا تھا۔اُس نے خود بھی دربدری کا مزہ چکھا تھا۔ یہاں اُسے سکون ملا تھا۔

اب یوں ہوا۔وہ کام سے فارغ ہوتا۔سائیکل کے پیڈلوں سے کشتی کرتا یہاں آجاتا۔ناکارہ ٹائر جلاتا اور انکی روشنی میں کام کرتا رہتا حتیٰ کہ صبح ہو جاتی۔ اُس کے لیے یہ کام ایک عبادت تھی اور یہ جگہ مقدس ترین۔

آغاز میں یہاں اُس نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنائی جو ایک ندی کے کنارے تھی ۔نہ اُسے جنگل کے مچھروں کا ڈر نہ اُسے سانپوں کا کوئی خوف اور نہ اُسے جنگل کے بھیڑیے اور اژدھوں کا کوئی احساس۔وہ مجسمے بناتا جاتا۔اپنے تصور کی سرزمین سے نکال کر

اُنہیں حقیقی دنیا میں لاتا جاتا۔جانوروں، پرندوں اورانسانوں کے مجسمے۔انکے چہروں پر اپنے ذہن کے مطابق احساسات بکھیرتا جاتا۔ ہر ایک دوسرے سے مختلف، تاثرات میں منفرد، قدرت کے عناصر، تبدیلی کے نمائندہ، پانی، جانور، پرندے سب اُسکے تخلیقی دوست تھے۔ایک جہان تخلیق ہورہاتھا۔دنیا سے چوری چُھپے۔

پھرایک دن ایسا ہوا کہ راز فاش ہوگیا۔گورنمنٹ کی ایک سروے ٹیم اتفاقیہ اِس طرف آنکلی۔ٹیم کے افراد دنگ کھڑے اِس جہان فن کو دیکھتے تھے۔جسکی خوبصورتی اور حُسن نے انہیں سحرزدہ کردیا تھا۔

کھوج کیا۔پتہ چلا ایک سادہ سے،ایک عاجز سے بندے کا یہ عظیم کام ہے۔ لوگ ششدر تھے۔

’’یہ غیر قانونی حرکت ہے۔گورنمنٹ کی زمین پر ناجائز طور پر قبضہ ہے۔اِسے مسمار کردینا چاہیے۔‘‘

درمیان میں شازشی اور حاسدی ٹولے بھی تو تھے۔گلے کی پُھولتی رگوں سے چلاّ ے تھے۔

تاہم بھگوان سے پیار کرنے والے، اُسے اپنے من میں بسانے والے کی مدد خود بھگوان نے کی کہ بیچ میں سے ہی اُسکے حامی لوگ پیدا کردیئے جنہوں نے نہ صرف اُسے بلاّ شیری دی بلکہ ہر سہولت بھی مہیا کی۔

لیبر کی آسانی اُسے دستیاب ہوئی تو وہ ایک بڑا مجسمہ تین چار دن میں مکمل کرنے لگا۔حاسدی بیوروکریٹ، سازشی وکلاء اُسے عدالت میں بھی گھسیٹ کر لے گئے۔مگر وہ جیتا، اُسکا عزم جیتا، اُسکی لگن جیتی اور اُسکی کاوشیں سرخرو ہوئیں۔اُس نے دنیا کو بتادیا کہ ناکارہ چیزیں کارآمد ہوسکتی ہیں۔اور یہی اُسکا آرٹ ہے کہ اُسکا کہنا ہے کہ قدرت تو خود اِس

پرعمل پیرا ہے تو انسان کیوں نہ ہو؟

جیسا کہ نک چند نے کہا۔ میں نے ہر وہ شے استعمال کی جسے لوگوں نے پھینک دیا تھا۔ دھاگہ اُدھڑے کپڑے جو کسی کے لیے کسی دلچسپی اور کام کے نہیں تھے۔ مگر وہ میرے لیئے تھے۔ کپڑوں سے بنے یہ گدھے گھوڑے بہت مظبوط ہیں۔ آپ کو نیچے نہیں گرائیں گے۔

نک چند سے پہلی ملاقات میں مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ اگر اپنے اندر کی وجدانی، الہامی اور روحانی قوتوں اور جذبوں سے متاثر تھے تو وہیں ایسی سلطنت بھی کہیں اُ نکے خوابوں میں تھی جسے اُنھوں نے ڈیزائن کیا۔

راک گارڈن تین فیز میں منقسم ہے اور ہر فیز مختلف وقتوں میں مکمل ہوا۔ ہر فیز کا خاکہ اُنکے دماغ میں تھا۔ اُنکے دل میں تھا۔ اُنکی رگ وپے میں اُترا ہوا تھا جسے انہوں نے جذبوں کی بلندیوں سے دیکھا۔ مسرتوں اور حیرتوں کے حصار میں لے کر اُسکا احاطہ کیا۔

کچھ چیمبرز ایسے ہیں جن میں بادشاہ کی عدالت کے منظر ہیں۔ ملکہ کے محل کا کمپلیکس ہے۔ موسیقاروں کیلئے انکے فن کی ادائیگی کیلئے خوبصورت جگہ، کہیں نواب کا شادی بیاہ کی کسی تقریب میں جانے کا اہتمام، اس کے ساتھ ساتھ دیہاتی زندگی کے منظر۔ کہیں کاشت کاری کرتے، کہیں دودھ دھوتے، کہیں جانوروں کا چارہ بناتے لوگ۔

یہ ایک دنیا تھی، دیوی دیوتاؤں کی۔ ایک سلطنت۔ نک چند کا کہنا ہے۔

'' آغاز میں میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ یہ صرف میرے ہاتھ ہیں۔ شاید میری چیزیں میری کھیتی باڑی اور میرے ماحول سے جڑی ہوئی ہیں۔ میں ایک کسان تھا جو ہل چلاتا، بیج بوتا پھر اس میں پھول پھل نکلتے دیکھنے کا آرزو مند رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے یہ شاہکار میرے ماحول کے عکاس ہیں، ان کے نمائندہ

ہیں۔

''میں چاہتاہوں لوگ اپنی تاریخ اور ثقافت کو محفوظ کریں اور انہیں محفوظ کرنا جاری رکھیں۔حتیٰ کہ جب میں زندہ نہ ہوں کسی بھی موقع پر راک گارڈن مجھے زندہ رکھے گا۔

نک چند ایک ایسا پروڈیوسر نہیں جسنے آلات کو بیچنے کے لیے بنایا یا کسی مصرف کیلئے تخلیق کیا۔اُس کی زندگی اور تخلیق کا مقصد بہت روحانی تھا۔وہ ایک سادہ لوح، بہت مذہبی اور عاجز سا انسان ہے۔اُسے اپنے آرٹ پر، اپنے فن پر بات کرنے کا تو کوئی شوق ہی نہیں نہ وقت، نہ شوق۔وہ ابھی بھی اپنے کام میں مصروف ہے۔اسّی سال کی عمر میں بھی۔

فیز اول اور دوم زیادہ تر بھول بھلیوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ پستہ قامت دروازے ایک کے بعد ایک نئی دنیا میں کھلتے اور آپ پر ایک نیا جہاں وا کرتے ہیں۔ یہاں کے کردار شوخ رنگوں سے جھلملاتے آراستہ پیراستہ بلند و بالا دیواروں میں گھرے چہروں پر مختلف تاثرات کی دنیا بکھیرے آپ کو داستانیں سناتے ملتے ہیں۔ایک سے دوسرے تنگ تنگ راستے ٹیڑھی میڑھی صورتوں میں پراسرار سے انداز میں خود مڑتے اور آپ کو موڑتے ،کبھی اُوپر چڑھاتے کبھی نیچے اُتارتے چلے جاتے ہیں۔یہی تنگنائیاں پھر آپکو ایک کشادہ جگہ لے جاتی ہیں جہاں ایک بڑی آبشار آپ کے ہونٹوں کو متحرک کرتے ہوئے کہتی ہے۔

''واہ''۔

ایک فسوں ،ایک خوشگوار حیرت ،ایک اسرار ،ایک تجسس آپ کی آنکھوں میں رقصاں آپکے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

شائقین کیلئے فیز سوم باغ کا سب سے زیادہ دلچسپ حصّہ ہے کہ اسمیں کوئی پچاس کے قریب دیوہیکل قسم کی سیمنٹ کی بنی ہوئی محرابیں ہیں اور ہر محراب میں ایک بڑا فیملی سائز

جھولا ہے۔جسے دیکھتے ہی کیا بچے، کیا بوڑھے، کیا عورتیں اور کیا مرد سب بے چین و بے تاب ہوا ُٹھتے ہیں اور شاعر کے الفاظ میں "غزل اُسنے چھیڑی مجھے ساز دینا" کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔

سکھنا جھیل پر ہم نے بڑا دلچسپ وقت گزارا۔میں اور سیما بہت دیر اسکے پانیوں کو دیکھتے، ناریل کا پانی ڈاب پیتے، عورتوں اور لڑکیوں سے باتیں کرتی رہیں۔عورتیں اور مرد جو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اسکی سیاحت کیلئے آئے ہوئے تھے۔نوجوان لڑکیاں جو دلّی کے کسی کالج سے ٹرپ پر آئی ہوئی تھیں۔

یہ انسانی ہاتھوں کا شاہکار تھی جو تین مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی چندی گڑھ کے شہریوں کیلئے ایک تحفے سے کم نہیں۔جس پر بدلتے موسموں میں پرندوں کی ڈاریں مختلف ملکوں اور علاقوں سے اُڈاریاں مارتے ہوئے آتی ہیں اور اس کے پانیوں پر اُترتی ہیں۔

"ہائے کیسا دل کش سماں ہوتا ہوگا؟"

ہم ہلکے ہلکے ہلکوروں میں بہتے پانی جسپر گرتی سورج کی دھوپ اس پر چلتی کشتیاں، اُن میں بیٹھے لوگ جنکے چہرے خوشیوں اور مسرتوں سے گلال ہوئے پڑتے تھے۔

چاندنی راتوں میں اسکا حُسن کیسا مدہوش کن ہوگا؟ میں نے سوچا۔

تصور میں اس کے کئی رُوپ آئے اور محظوظ ہوئی۔

اگلے دن شملہ جانے کا پروگرام تھا۔ہماچل پردیش کا کیپٹل۔مری کا بھائی کہہ لیجیئے۔سبھوں نے کہا تھا۔مری جیسا ہی ہے۔مگر راستہ بہت ٹیڑھا میڑھا ہے۔بہت بل دار ہے۔پل پل کے زگ زیگ میں اُلجھا ہوا۔بندہ پہاڑی راستوں کا عادی نہ ہو تو اُسکا حشر ہو جاتا ہے۔مگر صنوبر، دیودار اور چیڑ کے درختوں کے دامنوں میں ایک ڈھلوانی ترتیب میں بکھرے دو منزلہ سہ منزلہ گھروں کی رنگین چھتوں کے بکھرے رنگوں کی برسات نے سفر کی

ساری کلفت کو دور کر دیا۔ آنکھیں مسلسل انہیں دیکھتے اور گھورتے مسحور ہوتی رہیں۔

شملہ ایک اہم حوالے سے ہر پاکستانی کیلئے مانوس ہے۔ کہ پاکستانیوں کا محبوب لیڈر اپنے محصور فوجیوں کی رہائی کیلئے مسز گاندھی سے ملنے شملہ آیا تھا۔ شملہ معاہدہ یہیں ہوا تھا۔

ہمالیہ کے جنوب مغربی سلسلے کی پہاڑیوں میں شملہ بھی استنبول، روم، لزبن ٹوکیو اور ماسکو کی طرح سات پہاڑیوں پر تعمیر ہوا ہے۔ ایک خوبصورت پہاڑی اسٹیشن جسکی دل آویزی آنکھوں کو بھلی لگتی تھی۔ جو دل کو پیارا لگتا تھا۔

''ٹاؤن ہال کو دیکھیں۔'' کسی نے کہا تھا۔ فوراً نگاہوں کا مرکز بدلا۔ ایک خوبصورت اور شاندار منظر بصارت سے ٹکرایا۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شاندار ہوٹلوں کے ظاہری روپ دیکھے۔ سڑکوں کو ایک دوسرے سے ملانے کیلئے لفٹیں ہیں۔ ایک کی سیر بھی کی۔ بچوں کی طرح خوش ہوئے۔

انڈین ایڈوانس سٹڈیز کی عمارت گوتھک طرز تعمیر کی حامل خوبصورت، شاندار اور پروقار ہے۔ یہ کبھی وائسرے لاج تھی۔

شملہ کالجوں، سکولوں اور ریسرچ اداروں کیلئے خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں مندروں اور گرجاؤں کی بھی کثرت ہے۔ شاید کوئی مسجد بھی ہو مجھے نظر نہیں آئی تھی۔

شملے کو صرف ہاتھ لگانے والی بات ہوئی۔ مال پر گھومتے گھومتے ہی لنچ برگروں کی صورت کیا۔

ثروت کی فخر زماں سے بحث سُنی کہ جو شملے میں رات گزارنے کیلئے بضد تھی۔ ہم اسکی تائید کرتے تھے کہ ہاں نہ ہم کوئی برگر کھانے تو شملہ نہیں آئے۔ مگر وہاں انکار تھا۔ مال پر سیر کے دوران سکینڈل پوائنٹ بھی دیکھا۔ نام نے حیران سا کیا۔ معلوم ہوا تھا کہ پٹیالہ کے

کسی راجے نے کسی گوری کو یہاں سے اغوا کر لیا تھا۔

''واہ جی واہ۔بڑا جی دار راجہ تھا۔''

دل کھول کر سراہا گیا۔

شملہ میں بچھی ریلوے لائن دیکھ کر دُکھ ہوا۔میرے ملک میں تو ریلوے کا جو حشر ہوا۔ٹرانسپورٹ مافیا کے چکروں اور خودغرضیوں نے جو کھیل کھیلے۔انکی تفصیل بہت ہی گھناؤنی ہے۔خود ریلوے کے ملازموں نے اِس سے محبت نہیں کی اور اسے اُجاڑ دیا۔

اگلے دن امرتسر کیلئے روانگی تھی۔استقبال بی۔بی کے ڈی اے وی کالج کی پرنسپل مسز جے کاکڑیا اور انکے عملے نے کیا۔

لنچ کے بعد شام کا سیکشن ٹورزم اینڈ ڈویلپمنٹ کے اعتبار سے بہت اہم تھا۔ پروفیسر درباری لال جو خود ایک ماہر تعلیم ہیں۔وہ اُن دنوں پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر تھے۔ وہی اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔

اِس سیمینار میں جو بات میرے سامنے کھل کر آئی وہ ہندوستان کی سیاحت کے حوالے سے آگاہی اور شعور تھا۔

مسز کاکڑیا نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے لیے آپ لوگوں کا پنجاب مسلمانوں کے مکے مدینے کی طرح ہے۔آج مذہبی سیاحت صنعت کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔جدید تقاضوں کی روشنی میں اِسے سمجھنے اور شکل دینے کی ضرورت ہے۔''

ایک طرح یہ سیمینار پاک بھارت دوستی کا مظاہرہ بن گیا۔فخر زماں نے اپنے خطاب میں ٹورسٹ ویزہ کے اجرا کی تجویز پیش کی۔انہوں نے سکھوں کے مذہبی مقامات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ راج کٹاس کا بھی ذکر کیا۔جسے اب زیارت گاہ بنایا جا رہا

ہے۔انہوں نے نفرتوں کی سیاست چھوڑ کر محبتوں کے راستے اپنانے پر زور دیا۔

کلچرل شو بہت خوبصورت تھا۔مسز کاکڑیا کی بیٹی پیرول کاکڑیا نوعمری کے باوجود بہت اچھی فنکارہ تھی۔مزہ آیا۔کھانا شاندار تھا۔ہندو اور سکھ مزے سے چکن کھارہے تھے۔

کل سہ پہر دلی کے لئے روانگی تھی۔شتابدی سے سفر کرنا تھا۔ٹرین کا سفر مجھے ہمیشہ بڑا اہانٹ کرتا ہے۔صبح گولڈن ٹمپل گئے۔مگر میں نے تفصیلی سیر واپسی کیلئے اٹھا رکھی۔ کچھ ایسا ہی حال جلیانوالہ باغ کے ساتھ ہوا۔بازار بھی گئے مگر میں نے کچھ نہیں خریدا۔کسی نے کہا تھا کہ واپسی پر امرتسر ٹھہرنا ہے۔

چلو آرام سے سب کچھ کروں گی۔کون سی سوڑ (جلدی) ہے۔

باب نمبر:۳ دلّی اور اس کی یادگاریں

۱۔ دلّی جو اک شہر تھا عالم میں منتخب۔اُسی میں ہمارے ڈولے کا اُترنا۔
۲۔ مردولی کبھی کی مہر ولی فنِ تعمیر اور مسلم ثقافت کا ایک خوبصورت کمپلیکس ہے۔
۳۔ نیشنل میوزیم کو ڈھائی تین گھنٹے میں دیکھنا کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی پیاسے کو صرف گھونٹ پانی نصیب ہو۔

شتابدی کیا مزے کی گاڑی تھی۔ٹرین کا سفر اور وہ بھی دوستوں کے ساتھ۔
افضال شاہد جیسے ہنس مکھ اور مجلسی بندے کا ساتھ ہو تو پھلجھڑیاں پل پل چھوٹتی ہیں۔گاڑی کسی پتی ورتا قسم کی خاتون جیسی تھی جو شوہر کے دل میں اُترنے کیلئے اُسکے معدے میں سے گزرنا پسند کرتی ہے۔شتابدی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ابھی امرتسر سے نکلے ہی تھے کہ گرما گرم چھوٹے چھوٹے سموسے، چائے، کافی اور رس گلے آگئے۔اُن سے دو دو ہاتھ کیئے۔جالندھر، لدھیانہ اور پانی پت گزرے تو کھانا آگیا۔کھانے نے اگر خوش کیا تو وہیں تینوں شہروں نے دل و دماغ میں ہیجان سا پیدا کیا۔
لدھیانہ ڈاکٹر کیول دھیر جیسے پیارے انسان کا شہر ہے۔پانی پت جنگوں کے اعتبار سے کبھی نہیں بھولتا کہ انہیں یاد کرنے کیلئے گھوٹے لگانے پڑتے تھے اور جالندھر سے تو ویسے ہی کوڑا ساک (رشتہ) ہے۔

دلّی کے ریلوے اسٹیشن کی وسعت اور گاڑیوں کے اژدہام نے حیرت میں ڈالے رکھا۔ دلی آنے کی کتنی تمنا تھی۔ آج دلی سامنے تھی گو رات تھی مگر کہیں اجنبیت نہیں تھی۔ ایک جیسا ماحول، زبان کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہی اُردو ۔ تیرے کو میرے کو بولا جا رہا تھا۔

کرول باغ میں پال ریجنسی ہوٹل پہنچے۔ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ مگر دلی جیسے شہر میں ایسا ہوٹل ملنا بھی غنیمت ۔ میں اور سیما حسب معمول اکٹھی تھیں رات تو خوب ڈٹ کر سوئے کہ تھکے ہوئے تھے ۔ ناشتے کے بعد سیر کیلئے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں آگئیں ۔ میں اور سیما نے ایک گاڑی کو قابو کیا اور نکل بھاگیں۔

دلّی جہاں لال قلعہ ہے۔ جہاں جمنا گنگا بہتی ہے۔ جہاں شاہی مسجد اور قطب مینار ہے۔ دلّی جو موجودہ اور ماضی کے حکمرانوں کی راجدھانی ہے۔ مغلیہ شاہوں کی شان و شوکت کی مظہر ہے ۔ محبوب الٰہی اور قطب الدین بختیار کاکی جیسے دیگر بہت سے صوفیائے کرام کی خوابگاہ اور مسلمانوں کی عظمت گم گشتہ کا نشان ۔ دلّی جو اپنی پشت پر تاریخ کی بہت بھاری سی گٹھڑی اُٹھائے ہوئے ہے۔ تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔ مشہور زمانہ وہ شعر بھی یاد آ گیا تھا۔

دلّی جو اک شہر تھا عالم میں منتخب

تو اب ہم اُسی منتخب عالم شہر میں ہیں ۔ دلّی جو منقسم ہے دو حصّوں میں ۔ پرانی اور نئی ۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے سوچا ہے کہ پہلے کہاں چلنا ہے؟ سیماں کہتی ہے ۔ بستی نظام الدین میں ۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر ۔ درست ۔ میں نے بھی سر ہلایا ہے ۔ محبوب الٰہی اُن کا لقب ہے ۔ روحانی سلسلہ خواجہ معین الدین چشتی سے منسلک ہے ۔ پاک پتن والے گنج شکر سے بھی فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہے ۔ انہی کے حکم پر دہلی تشریف آوری ہوئی تھی ۔

خُدا کو بہت محبوب ہوئے۔والدہ کی فرمابرداری پر نوازے گئے۔والدہ کی زبان سے نکلے الفاظ خدا کو پسند آئے۔ماں نے خدا سے بیٹے کو محبوب رکھنے کی التجا کی تھی۔سو سچے رب نے انہیں محبوب کرلیا اتنے کہ لفظ "حرمت" کی علامت بن گئے۔"ہنوز دلّی دور است والی" پُرتاثیر اور کرامت سے بھری کہاوت اِسی حرمت ہی کی غمّاز تھی۔

ذرا مختصر سا پس منظر بھی سن لیں۔غیاث الدین بلبن اور اسکے ولی عہد کی جانب سے پیغام ملتا ہے۔بادشاہ سلامت فتح بنگال سے سرخرو ہو کر دلّی آرہے ہیں۔استقبال کیلئے حاضر ہوں۔جواب میں فرماتے ہیں۔شاہوں کے حضور حاضر ہونا شیوہ فقیری نہیں۔ایسی سرکشی کا اظہار متعدد بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔دھمکی ملتی ہے۔آپ مسکراتے ہوئے فرماتے ہیں۔"ہنوز دلی دور است۔"

بس تو دلّی میں شاہ کو قدم دھرنے نصیب نہ ہوئے۔

وقت یہی کوئی دس ساڑھے دس کا تھا۔رش بھی نہیں تھا۔مگر اُس تنگنائی اور پس ماندگی نے کوفت دی جو گلیوں سے گزرتے ہوئے محسوس ہوئی۔چھوٹی چھوٹی دوکانیں جن میں بیٹھے لوگ یقیناً مسلمان ہی تھے۔سویرے سویرے ہی اگربتیوں،گلاب کے ہاروں اور پتیوں،بتاشوں،سبز چادروں،تسبیح،ٹوپیوں کیلئے آوازوں کی چیخ و پکار شروع ہو چکی تھی۔مانگنے والے بھی بڑے ہوشیار تھے۔صبح صبح ہی بازار گرم کر رکھا تھا۔درگاہ کے صحن میں داخل ہوئے تو سیما نے پلّو کھینچا۔

"پہلے فاتحہ خوانی امیر خسرو کے مزار پر کرنی ہے۔اُدھر چلو۔"

دونوں میں تعلق محبّ اور محبوب والا تھا۔خسرو کی شاعری اگرچہ بہت زیادہ تو نہیں پڑھی تھی مگر جتنی پڑھی اور سُنی تھی اُسی نے جٹ چھا ڈال رکھا ہے۔میری ایک پسندیدہ غزل جو کسی افغانی گلوکارہ نے گائی ہے اور جسے میں کبھی شوق سے سنتی تھی اسوقت مجھے یوں محسوس

ہواتھا جیسے وہ آواز میرے چاروں اور نغمگی کی پھوارس برسا رہی ہے۔

خبرم رسیدہ امشب کہ نگار خواہی آمد

سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم

پس ازاں کہ من نمانم بہ چہ کار خواہی آمد

ترجمہ: خبر ملی ہے کہ آج کی رات وہ محبوب آئے گا

میرا سر اُن راہوں پر نثار جن پر وہ آئے گا

میری جان لبوں پر آگئی ہے۔تو آ کہ میں زندہ ہو جاؤں

بعد میں اگر میں نہ رہا تو اس کا آنا کس کام کا

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم

اِس مصرعے کی نغمگی اور مفہوم مجھے اتنا پسند تھا کہ بے اختیار ہی میری انگلیاں ریکارڈ پلیئر کے ریورس بٹن دبانے لگتی تھیں کہ مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے میرا سانس سینے میں گھٹ گیا ہے۔

محبوب الٰہی کی درگاہ میں صبح کے باوجود خاصے لوگ تھے۔آنکھوں میں عقیدتوں کی شمعیں جلائے ۔یہ شمعیں ہماری آنکھوں میں بھی جلیں۔آنسوؤں نے کونے بھی گیلے کیئے۔

وفات 725ھ میں ہوئی۔روایت ہے کہ جب آپ کو دفن کیلئے لے جایا جارہا تھا۔اُس وقت کہیں قوال سعدی شیرازی کی غزل گا رہے تھے اور وہ اِس شعر پر تھے اور تکرار جاری تھی۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو

تو کجا بہر تماشا می روی؟

کہا جاتا ہے کہ آپ کے جسم مبارک میں لرزش سی ہوئی ۔ آپ نے ہاتھ باہر نکالا اور فرمایا۔

''من نمی روم ۔ من نمی روم''

خدا کی برگزیدہ ہستیوں سے ناممکن بھی ممکن ہے۔

غالب اکیڈمی وہیں بستی نظام الدین میں ہی ہے۔میرے ملک کی لیجنڈری شخصیت حکیم سعید دہلوی نے اگر پاکستان کو اپنی خدمات سے نوازا تو اُنکے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید بھی خدمت کی اسی روش پر گامزن رہے۔موجودہ اکیڈمی کی جگہ پر یہ عمارت بنا کر غالب اکیڈمی کو سونپ دی۔ہمیں محسوس ہوا تھا کہ اُداسی اور ویرانی کا سا تاثر نمایاں تھا۔یقیناً اس میں صبح کے اوقات کا بھی دخل تھا۔

عمارت کے عقبی حصے میں اُس تاجدار اُردو کا مزار تھا۔فاتحہ خوانی کی ۔اکیڈمی شاعر کی شخصیت ،انکی زندگی اور فن کی نئی جہتوں پر کام کرتی ہے۔زینہ بہت تاریک سا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی کمروں میں گئے۔چیرمین خواجہ حسن ثانی نظامی سے بھی ملاقات ہوئی۔اکیڈمی میں میوزیم و آڈیٹوریم کے علاوہ ایک بڑی لائبریری اور کمپیوٹر روم بھی ہے۔

وقت دیکھا اور ایک تیز دوڑ لگائی کہ جامع مسجد دلّی اور لال قلعہ دیکھ لیں کہ تین بجے ہر صورت واپسی تھی۔پنجاب بھون میں ''چھیواں دریا'' کی جانب سے پاکستانی وفد کے اعزاز میں تقریب تھی۔

جامع مسجد مثل شاہی مسجد لاہور ہی ہے۔مسجد کی کرسی لاہور کی جامع مسجد کی طرح ہی بہت اونچی ہے۔سُرخ پتھر کی سیڑھیوں کی ایک لمبی قطار ہے۔مفلوک الحال لوگوں کے ڈھیر یہاں براجمان تھے۔سستی کھانے پینے کی چیزوں کے خوانچے تھال اور ٹھیلے بھی بکثرت

تھے۔تعفن اور بدبو کا ناگوار سا احساس بھی ملتا تھا کہ صفائی ستھرائی کا سخت فقدان تھا۔

مسجد من وعن لاہوری مسجد کی تصویر ہے۔بڑا دروازہ،صحن،تالاب،دیواروں پر بیل بوٹے اور نقاشی۔تصویریں بنائیں،نفل پڑھے۔

دلّی کو اگر بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں۔اللہ کی برگزیدہ ہستیاں قدم قدم پر اس کی دھرتی پر سایہ فگن ہیں۔جامع مسجد کے ساتھ ہی حضرت سرمد شہید اور حضرت ابوالقاسم سبزواری کی درگاہیں ہیں۔سرمد شہید ایران کے آرمینیائی یہودی تھے۔جنہوں نے دیگر مذاہب کے مطالعے کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔

مغلوں کے دور میں ہندوستان آئے۔کہا جاتا ہے کہ ابھے چند نامی ہندو لڑکے کے حسن اور شریں آواز نے بہت متاثر کیا۔اُسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔اپنا علم اُسے دیا۔لوگ بہت مخالف ہو گئے۔آپ نے نقل مکانی کی۔لاہور آئے اور اپنا لباس بھی اُتار پھینکا۔حیدرآباد دکن کے بعد گولکنڈہ میں بھی کچھ وقت رہے پھر دہلی آ گئے۔اور خواجہ ابوالقاسم کے ساتھ رہنے لگے۔اورنگ زیب کو آپ پر بہت اعتراضات تھے۔سرمد صرف لا الہ ہی پڑھتے۔لوگ کافر کہنے لگے تھے۔اورنگ زیب نے قتل کا حکم جاری کیا اور قتل کر دیا۔

جس درگاہ میں ہم کھڑے تھے وہ سرخ رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔چڑھاوے کی چادریں بھی سرخ تھیں اور اندرونی تزئین و آرائش بھی سرخ۔یہ مماثلت ان کے قتل اور خون سے جوڑی گئی۔جس چبوترے پر قتل ہوئے وہیں مزار بنا۔فاتحہ پڑھی اور سید قاسم سبزواری جو ہرے بھرے کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔حاضری دی۔یہ ہستی جو بہت ساری کرامات کی مالک ہستی ہے۔

مانگنے والوں کے ہجوم سے پلّہ چھڑاتے ہوئے لال قلعہ کی جانب لپکے۔لاہوری گیٹ سے داخلہ ہوا۔کتنے گہرے ناطے جڑے ہوئے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ۔پہلا

احساس اسکی وسعت اور ڈیوڑھی سے اگلے حصّے کا لاہور کے قلعے سے قدرے منفرد ہونے کا تھا۔دراصل ہاتھیوں کیلئے ہاتھیوں جیسی گزرگاہیں بھی تو ضروری تھیں۔

ساری راہداری چھوٹی چھوٹی دوکانوں سے سجی پڑی تھی۔مقامی دستکاریاں جن میں غیر ملکیوں کے ساتھ ساتھ ہم جیسوں کیلئے بھی بڑی کشش تھی۔مگر دوکانداری کرتی عورتیں کان کاٹتی تھیں۔ہاؤ ا کا مول بتاتیں اور پھر پیچھے سے ہانکیں لگاتیں۔

خوبصورت عمارتوں کے حوالے سے جمالیاتی ذوق کے اعتبار سے باغات کا شوقین اور طرزِتعمیر میں منفرد شعور رکھنے والے شہنشاہ شاہ جہان کا انمول تحفہ عالیشان بلندو بالا دروازوں اور عظیم الشان دیواروں میں مقید یہ عظیم الشان قلعہ۔یہاں بھی وہی دیوان عام اور دیوان خاص ساتھ ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔یہیں اسی دیوان عام کے ستونوں کے سائے میں وہ تخت طاؤس دھرا تھا جسے نادر شاہ مالِ غنیمت کے طور پر جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ساتھ ہی دیوان خاص ہے یہ اپنی جسامت میں تو دیوان عام سے چھوٹا ہے مگر اپنے نام کی لاج رکھے ہوئے ہے۔خاص ہے تو تعمیری حُسن بھی انتہاؤں کو چھوتا ہے۔سنگ مرمر کی جالیوں کا دیدہ زیب کام متاثر کرتا ہے۔

یہیں کچھ فاصلے پر موتی مسجد بھی ہے۔سفید سنگِ مرمر کی ہے۔لو ہے کے جنگلوں سے گھرے خوبصورت لان آنکھوں کو بھلے لگے۔اس کے نام بھی کتنے مانوس سے تھے۔وہی کہیں دہلی گیٹ اور لاہوری گیٹ جیسے۔

لال قلعے کے اندر میوزیم دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان میں ہندوستان کی زندہ دستاویزی تاریخ محفوظ ہے۔جنگِ آزادی کے ہیرو سب یہاں موجود ہیں۔برصغیر کی پوری تاریخ اپنی تفصیلات کے ساتھ یہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

سچی بات ہے کہ میوزیم کے اُس حصے نے بہت دیر تک ساکت کھڑے رکھا۔

جہاں آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر اور انکی ملکہ زینت بیگم کا شاہی لباس ٹنگا تھا جو شاہی حیثیت کے آخری لمحوں میں انکے تن پر تھا۔ اُنکی اُس شہرہ آفاق غزل نے مزید افسردہ کر دیا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کیلئے
دو گز زمین نہ مل سکی کوئے یار میں

آنکھیں بھیگتی جارہی تھیں۔ ایک عظیم سلطنت کا زوال پھر اپنی بدنصیبی کا نوحہ بھی خود ہی کہہ ڈالا کہ دفن کیلئے وطن میں دو گز زمین نہ نصیب ہوئی۔ یہی کچھ ہوتا ہے کمزوروں کے ساتھ۔

آخری اموی حکمران کو غرناطہ سے، آخری عثمانی خلیفہ کو استنبول سے ایسے ہی دربدر کیا گیا تھا۔ ہماری اپنی کمزوریاں۔ کیا تھا جو اِن قلعوں، اِن مقبروں کی جگہ علم کے مراکز بناتے۔ علم دیتے تو آج مسلمانوں کی وہ زبوں حالی نہ ہوتی۔

سرخ پتھر سے بنا ہمایوں کا مقبرہ بھی اپنی طرز کی منفرد اور عظیم الشان عمارت تھی۔ شہ نشینوں اور خوبصورت جھروکوں میں بنی سنگ مرمر کی جالیوں سے ہوا فراٹے مارتی اندر آتی تھی۔ ہمایوں کی قبر کے تعویز پر قرآنی آیات تحریر ہیں۔ کمرے کے گنبد کی بلندی بہت اونچی ہے۔ مقبرہ بہت اچھی حالت میں ہے۔ جس کی قدرے حیرت بھی تھی۔ ہمارے تعجب کو دیکھتے ہوئے وہاں گھومتے پھرتے ایک نوجوان نے بتایا کہ عالمی ہیرٹیج نے اسے گود لیا ہوا ہے۔ اس کی اِس صورت کا ذمہ دار وہ ادارہ ہے۔

اب ڈھائی بج رہے تھے۔ تھک بھی گئے تھے۔ بُھوک بھی زوروں پر تھی۔ ڈرائیور لڑکا بھی بڑا انس مکھ سا تھا۔ اسی سے کہا تو بولا۔

''پالیکا بازار یہاں سے نزدیک ہی ہے۔''

''ارے تو چلو پھر۔''

پوری بھاجی کھائی۔بوتلیں پیں اور ہوٹل آ ئے۔

پنجاب بھون میں کوئی سو کے لگ بھگ لوگ ہوں گے۔

ڈاکٹر ستیندر نور اس تقریب کی صدارت کر رہے تھے۔ستیندر نور بڑی پیاری اور محبت والی شخصیت تھے۔ان کا انتقال ہوگیا ہے۔یہاں سردار ترلوجن سنگھ کی تقریر پر خوب تالیاں بجیں۔دونوں طرف کی بیوروکریسی کے خوب لتے لیے گئے۔واہگہ بارڈر پر ہر شام کو ہونے والی تقریب کا انداز بدلا جائے۔

کسی نے ٹکڑا لگایا تھا۔دونوں طرف کی سیکورٹی فورسز کو ہدایات دینے کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف نعرہ بازی پر نہ اُکسائیں۔وہ اپنے چہروں کے تاثرات سے جانی دشمنوں کا تاثر دیتے ہیں۔اور یہی چیزیں امن،دوستی کیلئے نقصان دہ ہیں۔

بات تو واقعی سو فیصد درست تھی۔

فخر زمان نے وفد کے ہر ممبر کا تعارف کروایا۔رخشندہ نوید،کنول مشتاق اور افضال شاہد نے اپنی نظمیں،غزلیں سنائیں۔بھارت سے ڈاکٹر ونیتا کور،ڈاکٹر من موہن سنگھ(ڈی آئی جی پولیس) ہرجندر چوہان اور ایس سورن نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔رات کا کھانا چھت پر تھا اور اہتمام پنجابی اکیڈیمی کر رہی تھی۔

ہندوؤں کا معروف تہوار نوراتری شروع ہو چکا تھا۔اگلے روز دسہرہ تھا۔ہم لوگ دلّی کے مرکزی علاقے میں واقع ماتا مندر گئے۔یہاں چراغاں تھا یا آسمان کے ستارے توڑ کر سجا دیئے تھے۔ساری رات پوجا پاٹ ہوتی تھی۔لوگوں کا رش نہیں تھا۔سروں کا سچی بات ہے ایک سمندر تھا۔پٹاخے چھوٹتے اور پھلجھڑیاں قلانچیں بھرتی تھیں۔رات جاگتی تھی۔زندہ

تھی اور جوان تھی۔

دلّی کا مضافاتی علاقہ مرولی کبھی مہرولی۔فن تعمیر اور مسلم ثقافت کا ایک نمائندہ کمپلکس ہے۔ہم ہندوستان کے دوسرے بلندترین اور فنی نظر سے خوبصورت ترین قطب مینار کے سامنے کھڑے اُسکی بلندیوں اور اسکی کندہ کاری کو دیکھتے اور حیران ہوتے تھے۔73میٹر بلند قطب الدین ایبک کی یادگار جسمیں التمش اور علاؤالدین خلجی کا بھی حصّہ ہے۔پانچ منزلوں والا یہ مینار اپنی پہلی تین اور آخری دو میں مختلف طرز تعمیر کا حامل ہے۔وجہ شاید یہی ہے کہ اوپر والا حصّہ فیروز تغلق نے بنوایا تھا۔اسمیں کہیں کہیں دیوناگری رسم الخط بھی استعمال ہوا ہے۔اس پر بھی ایک آدھ حلقے سے یہ دعوٰی سامنے آیا ہے کہ اِسے پرتھوی راج نے بنوایا تھا۔

ہم پاکستانی اور ہندوستانی تاریخ بارے بڑے ہی تھرڈ ڈ ولے اور کمینے ہیں۔جہاں کہیں ذرا سے پور جتنے تعلق یا مماثلت کا شائبہ بھی محسوس ہوا۔اُسے تو فی الفور اٹھا کر اپنے اپنے کھاتوں میں ڈالنے کو ہڑکنے لگے۔

اس میں بھی صداقت نہیں۔ہاں البتہ جذبائیت اور حقائق کو مسخ کرنے کی ایک کوشش کا نام دیا جاسکتا ہے۔پانچ منزلوں میں سے دو کندہ کاری اور قرآنی آیات سے سجی ہوئی ہیں۔بالکونیاں اس کی شان میں اضافہ کرتی ہیں۔یہ انڈو اسلامک فن تعمیر کا نمونہ جسے اب ورلڈ ہریٹیج نے اپنایا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ کہ اس کا حسن گہنانے کی بجائے نکھرا ہوا ہے۔

قطب مینار تھوڑا سا وجہ تنازع بھی ہے کہ اس کے بارے میں بھی دو آرائیں ہیں۔پہلی یہ کہ اس فتح کی یاد میں ہے۔جب ہندوستان میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔دوسری یہ اذان کیلئے ہے کہ ساتھ میں مسجد قوت اسلام ہے۔

یہ دلیل بھی بہر حال دل کو نہیں کھٹکتی۔پانچ بار اذان دینے کیلئے ۳۷۹ سیڑھیاں چڑھنی اور اُترنی کوئی مذاق تھا۔بے چارہ موذن انسان کا بچہ ہی تھا کوئی جن تو نہیں۔یہی بات قرین قیاس ہے کہ یہ فتح کی یاد میں تعمیر ہوا۔مسجد تو اب ٹوٹی پھوٹی چند محرابوں اور خستہ حال دیواروں کی صورت میں نظر آتی ہے۔

یہاں اسی جگہ التمش بادشاہ اور علاؤالدین خلجی کے مقبرے بھی تھے۔یہاں ہم نے فاتحہ پڑھی۔علائی دروازہ کو دیکھا اس کی فنی باریکیوں سے آنکھیں لڑائیں۔جو سمجھ آیا اسے سراہا اور جہاں ناکام ہوئے وہاں ہار مانی۔

بلبن کا مقبرہ شکستہ سا بھی یہیں ہے۔فاتحہ پڑھی۔دعائے خیر کی۔محرابی دروازہ بھی فن کندہ کاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔آہنی سفید جنگلے میں اشوکا مینار ہے۔جمالی کمالی مسجد بھی دیکھی۔

اب یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ وہیں ہو اور ہم اس کی زیارت کو نہ جاتے۔خواجہ نظام الدین کے محبوب جانشین کے حضور پہنچے۔فاتحہ پڑھی۔یہاں قریب ہی وہ شہرہ آفاق باؤلی ہے۔

وقت کی کمی تھی وگرنہ جی چاہتا تھا کہ کچھ دیر یہاں بیٹھا جاتا۔کچھ پڑھا جاتا۔

دلّی کہنا ہے تو دلّی کہہ لیجئے مگر سچ تو یہی ہے کہ نیشنل میوزیم نئی دہلی جو جنپت اور مولانا آزاد روڑ کے سنگم پر ہے۔ایک عظیم الشان عمارت کی صورت میں ہندوستان کا سب سے بڑا میوزیم کہلانے کا حقدار ہے۔یہاں صدیوں پر پھیلی وہ تاریخ جس کا ماڑا موٹا حال احوال کسی نہ کسی رنگ اور صورت میں دنیا کے سامنے آیا موجود اور اس تاریخ سے قبل کا وہ عہد جو آثار قدیمہ کی صورت میں ہے بھی یہاں موجود۔

ہندوستانی قوم اپنے قیمتی ورثے سے مکمل آگاہی کی حامل ہے۔تقسیم سے قبل بھی

اس پر کام ہو رہا تھا۔آزادی کے فوراًبعد اسکی اہمیت کا احساس دوچند ہوتے ہی اسمیں تیزی آگئی۔

شاندار عمارت سے داخلہ ہوا تو تھوڑی سی رہبری ٹکٹ سیکشن پر ہی ہوگئی۔سو با قاعدہ تاریخ سے قبل کی چیزیں فسٹ فلور پر پہلی گیلری کے عمودی صورت شوکیسوں میں ہی دیکھنے کوملیں۔کانسی میں ڈھلی موہنجوداڑو کی رقص کرتی لڑکی کو میں دیر تک دیکھتی رہی۔موہنجو داڑو کے شیر ہاتھی بھی مزے کے تھے۔شیشوں میں سجے ہڑپہ کے پیتل،تانبے کے کلہاڑے، چاقو،تلواریں،تیر بھریں کو دیکھتے ہوئے سوچ تو یہی تھی کہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو سب ہی کا مشترکہ اثاثہ تھا۔قبل مسیح کی یہ مجسمہ سازی کس کمال کی تھی؟میں تو اُس غم زدہ عورت کو دیکھتے ہوئے سوچتی تھی جو اپنے سر کو بازوؤں میں لیئے بیٹھی تھی۔بُدھا کے مجسموں کے نادر شاہکاروں سے بھی کمرے سجے تھے۔

کشادہ گیلری کو چھوڑتے ہوئے آگے بڑھے۔

گپتا آرٹ گیلری میں ہندوستان کا کلاسیکل آرٹ بکھرا ہوا تھا۔اُف گنگا گپتا۔ کھڑے ہونے کے انداز،سٹائل کیا بات تھی فنکاری کی۔ہندوستان کی مذہبی تاریخ،مذہبی کردار۔

مختلف منزلوں پر واقع مختلف گیلریوں میں جو تاریخی ورثہ محفوظ تھا تھوڑے سے وقت میں اتنا کچھ دیکھنا ممکن ہی نہیں نہ تھا۔سو ہم نے پینٹنگ،آرٹ اور جیولری کو چنا۔ان کے علاوہ سوچا کہ اگر کچھ راستے میں آیا اور اُس نے توجہ کھینچی تو اُسے بھی شرف ملاقات سے نوازدیں گے۔

سچ تو ہے کہ گیلری ہندوستانی شاہکاروں سے سجی پڑی تھی۔ Saraswati pata کپڑے پر کی جانے والی پینٹنگ کے نمونے۔پام کے پتوں پر سے آغاز کرتے

ہوئے منی ایچر پینٹینگ جو مغل، راجستھانی، بہاری اور دکنی سٹائلوں کی نمائندہ تھی ہم نے ان کی مختلف صورتوں کو دیکھا۔ داراشکوہ کی شادی، اکبر کے شکار کھیلنے، رانیوں اور محلات کے منظر، کرشنا کو Flute بجاتے، رادھا اور کرشنا کو تو اپرات کا تبادلہ کرتے، کرشنا کو اُس راستے پر Lotus پھیلاتے جس پر رادھا چلتی ہوئی آتی ہے۔ اِن سبھوں کو دیکھنا پُرلطف تھا۔

وسطی ایشیا کی نوادرات کی گیلریاں بھی بھری پڑی تھیں۔ بس ایک دو کمرے دیکھے اور آگے چلے۔ مختلف ملکوں کا سرمایہ بھی یہاں محفوظ تھا۔

ایرانی، انڈونیشی، فلیمش۔ فرنچ آرٹ کو بس سرسری سا دیکھا۔

اور زیورات کی گیلری کمال کی تھی۔ سیما تھی جو تھکی ہونے کے باوجود نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ چاہتی تھی ہر کمرے میں گھسے۔ جھومر نکلیس شاہانہ دستاروں میں سجنے والے بروچ۔ تھیں، ہار کیا بات تھی؟

قلمی نسخے مخطوطے سنسکرت، عربی، فارسی، سعدی کی گلستان، بوستان فولیو Folio بھی دیکھنے والی چیزیں تھیں۔ کوفی رسم الخط میں قرآن پاک کا نسخہ۔ آٹھویں اور نویں صدی کے رکھے کُھلے کُھلے بڑے بڑے لفظوں والے قرآن مجید۔ ڈھائی تین گھنٹے میں کیا خاک دیکھنا تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ لگانے والی بات ہی ہوئی ہو۔ جیسے کسی سمندر سے ایک بوند ملی۔ ہو جیسے کسی پیاسے کو پینے کو صرف گھونٹ نصیب ہوا ہو۔

باب نمبر:۸ امرتسر

۱۔ گرنتھ صاحب کا ہر روز منہ اندھیرے پالکی میں لانے اور شام کو اکال تخت واپس لے جانے کے عمل کا بھی دیکھنے سے تعلق ہے۔

۲۔ دوپہر امرتسر کا لنڈا بازار دیکھنے، گول گپے پاپڑیاں کھانے اور شام اے حمید، منٹو اور عطاالحق قاسمی کے گھر ڈھنڈونے میں گزری۔

یہ میری ہند کیلئے تیسری یاترا تھی اور یہ بھی مفت میں تھی۔امرتسر کی ایک بڑی سماجی اور فلاحی شخصیت ہربھجن سنگھ برار جو میاں میر فاؤنڈیشن امرتسر کے سرگرم اور فعال ممبر ہیں۔حضرت میاں میر صاحب کے حوالے سے ایک پروگرام کر رہے تھے۔ لاہور سے کوئی دس بارہ اور پنجاب سے چالیس کے قریب لوگ مدعو تھے۔مزے کی بات کہ نیلم احمد بشیر کو ویزہ نہیں ملا۔ان کی والدہ مودی بشیر کو مل گیا۔دوست اور وہ بھی نیلم جیسی کے ساتھ سفر کا اپنا ہی مزہ۔سیماں بھی نہیں جا رہی تھی۔سوچا کہ نہ جاؤں۔مگر نیلم کا اصرار۔

''امی جانا چاہتی ہیں۔پلیز تم چلی جاؤ۔مجھے تسلی رہے گی۔''

''تمہیں تو تسلی رہے گی اور میں کیا کروں گی''۔

میں ہنسی۔''تم سیوا کرنا ماسی کی۔سُنی نہیں وہ حدیث۔ماں نہ ہو تو ماسی کا دم غنیمت سمجھو۔'' اُسکے انداز میں ہمیشہ والا لاابالی پن اور تمسخر تھا۔

واہگہ بارڈر پر میں خوشی ومسرت اور دُکھ وتاسف کی دونوں کیفیات سے یکے بعد دیگرے دوچار ہوئی تھی۔نئی نکور لشکارے مارتی کسٹم امیگریشن کی عمارت دیکھ کر رگ رگ

میں طمانیت و سرشاری کی لہروں نے رقص کیا تھا۔جتنی بار بھی ہندوستان گئی پاکستانی کسٹم کی پٹڑی واسوں جیسی عمارت نے تکلیف دی تھی۔چلو خدا کا شکر ہے۔پر جونہی کرنسی ایکسچینج والوں نے سو کے بدلے 58 روپے ہاتھوں میں تھمائے تو جیسے جھٹکا کھا کر تڑپنے والی بات تھی۔

''75 سے 58 پر آ گئے ہیں۔یا اللہ کہاں جا رہے ہم۔''

دُکھ جیسے اندر ہی اندر کھولتے پانی کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

اٹاری بارڈر پر لوگ گاڑیاں اور گیندے کے ہار لیئے استقبال کو موجود تھے۔ڈھول والے بھی تھے۔ڈھول والوں کی صحبت میں آگے بڑھے۔گاڑیوں میں بیٹھے اور پولیس کی چھتر چھاؤں میں سفر شروع ہوا۔

سردیوں کے دن تھے اور امرتسر کی سڑک کے دونوں اطراف میں گندم کے کھیتوں نے تاحدِ نظر گویا سرسبز قالین بچھا رکھے تھے۔دل نے تسلی دی، دلداری کی۔

''گھبراؤ نہیں۔خوش ہونا سیکھو۔تمہاری طرف بھی ایسے ہی لش پش ہے۔''

خفت کا سا احساس ہوا۔''کیا کریں۔ہندوستان سے مقابلے بازی کی عادت نہیں جاتی۔''

قیام برار ہوسٹل میں ہوا۔جو خالصہ کالج اور ریپلک سکول کے بالمقابل امرتسر کی ایک مضافاتی کالونی میں تھا۔

ہوسٹل کے ٹھنڈے ٹھار کمروں نے گویا رگ رگ میں یخ لہروں کی ایک رو سی دوڑا دی تھی۔ میں اور آنٹی ایک کمرے میں بستروں پر سکڑے بیٹھے صورت حال کا جائزہ لیتے تھے۔کو کمبل تھے اور رضائیاں بھی۔مگر ٹھٹھرنے والی بات تھی۔ہم لوگ ہیٹروں کے عادی۔سردی کو ماننے زیادہ لگے تھے۔تاہم یہ بھی بات تھی کہ بوڑھے ہو رہے تھے اور

بڑھاپے میں سردی گرمی دونوں زیادہ محسوس ہوتی ہیں ۔

خدا جانے میزبانوں کے پروگرام کیا تھے ۔عفت علوی سے پوچھا۔اُس نے کندھے اُچکائے ۔محبت سے مسکرائی اور بولی

''آپا ابھی تو مجھے خود بھی نہیں معلوم ۔''

سوچا دفع کرو انہیں ۔چپکے سے اپنی سیر پر نکل چلو ۔گولڈن ٹمپل بھی ابھی تک نہیں دیکھا ۔''

ناشتہ چائے پراٹھے والا تھا ۔پراٹھا تو تھوڑا تھوڑا لیا ۔ہاں چائے پی اور ہم دونوں نکل پڑیں ۔

سائیکل رکشے پر جیسے آنٹی کو بٹھایا گیا ۔اُس کا کریڈٹ مجھ سے زیادہ رکشے والے کو جاتا تھا کہ وہ مخنی سا ہونے کے باوجود اندر سے بڑا مظبوط تھا ۔یا شاید تکنیکی مہارت حاصل کیئے ہوئے تھا ۔اُترائی بھی ایسے ہی ہو گئی ۔

ایک عظیم الشان عبادت گاہ ہمارے سامنے تھی ۔گورو نانک جیسی عظیم ،روحانی ،دینی اور دنیوی علم سے مالا مال ہستی کے پیروکاروں کا مرکز عبادت ۔

موجودہ امرتسر زمانوں پہلے ایک گھنا جنگل تھا ۔ایک بڑا تالاب بھی اسمیں تھا۔ روایت ہے کہ کہیں لارڈ بدھا یہاں سے گزرے اور کچھ وقت یہاں ٹھہرے ۔ماحول دیکھ کر انہوں نے کہا یہ تو بدھ بھکشوؤں کے نروان کیلئے بہترین جگہ ہے ۔گورو نانک بھی کچھ عرصہ یہاں رہے ۔اُن کے اندر بھی ایسی ہی خواہش مچلی تھی ۔

کہہ لیجیئے کہ ایشیا کی عبادت گاہوں وہی درگاہوں اور خانقاہوں والا مخصوص ماحول تھا ۔امرتسر کے بازاری سلسلے دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے ۔سویرے سویرے ہی زائرین کی کثرت نے میلے کا ساسماں پیدا کر رکھا تھا ۔

عبادت گاہ کی بڑی خوبی رضا کارانہ کام کرنے والوں کی بھی تھی ۔ کہ جن کی آنکھوں میں عقیدتوں کے دیئے جلتے تھے ۔ چہرے پر ہر کہ خدمت کردا/مخدوم شد والے اثرات بکھرے تھے ۔ ہاتھوں میں برقی قوت دوڑتی تھی ۔ صفائی ستھرائی انتہا درجے کی ۔ جوتیاں رکھنے اور پرشاد کے برتنوں کی دھلائی سکھائی جیسے سب کام جذبوں اور عقیدتوں کے مرہون منت تھے ۔

ٹمپل میں داخلے سے قبل اُس شفاف بہتے پانی میں پاؤں دھونے پڑتے ہیں جو ایک اتھلے سے نالے کی صورت بہتا ہے ۔ گزرگاہ کے ساتھ ہی مرکزی سکھ میوزیم ہے ۔ جسے دیکھے بغیر ہم آگے بڑھ گئے تھے ۔ صبح خوشگوار میٹھی سی سونے رنگی دھوپ میں ڈوبی ہوئی تھی ۔

ایک وسیع و عریض تالاب میں ہلکورے لیتا سبزی مائل پانی جسکے بیچوں بیچ کھڑی ایک حسین عمارت اور اسکے گنبد یوں لشکارے مارتے تھے کہ جیسے سارے میں سونا ہی سونا بکھرا ہوا ہو ۔ اطراف میں دودھیا عمارتوں کے سلسلے پانیوں میں اپنے عکس چھوڑتے تھے ۔ پورا ماحول ایک الوہی سکون اور تقدس کے رنگ میں ڈوبا پڑا تھا ۔

گرنتھ صاحب کی بانیاں موسیقی کے پروں پر سوار سارے ماحول میں بکھر کر فسوں کی سی کیفیت پیدا کرتی تھیں ۔ سری مندر کو جانے والے راستے پر اگر زائرین کی کثرت تھی تو واپسی کا راستہ بھی اٹا پڑا تھا ۔ پانیوں پر تیرتے یہ راستے دل کش نظر آتے تھے ۔ بڑا خوبصورت، من موہ لینے اور فسوں خیزی والا ماحول تھا ۔

گرنتھ صاحب پوجا پاٹھ کا عمل جاری تھا ۔ لوگوں میں نظم و ضبط تھا ۔ سونے کے گنبد تلے زائرین گرنتھ پاٹھ کو تھوڑی دیر سنتے اور پھر دوسری جانب سے نکل جاتے ۔

میں نے آنٹی سے لنگر کھانے کا پوچھا ۔

میرا تو پراٹھا ابھی سینے پر دھرا ہے ۔ تھوڑا سا پرشاد کھالیں گے ۔

اُن کے قدموں میں مجھے تھکاوٹ واضح محسوس ہوئی تھی۔

گولڈن ٹمپل میں اکال تخت کی عمارت بڑی اہم سمجھی جاتی ہے کہ یہاں ایک شاندار کنوپی جو ہیرے جواہرات سے سجی ہوئی ہے۔رکھی ہوئی ہے۔گرنتھ صاحب سکھوں کی مذہبی کتاب اسی اکال تخت میں رکھی جاتی ہے۔جسے ہر روز منہ اندھیرے خوبصورت پالکی میں عقیدتوں اور محبتوں کے جلو میں یہاں لایا جاتا ہے۔شام کو اسی انداز میں اسکی واپسی اکال تخت کی طرف ہوتی ہے۔اِس رسم کا بھی دیکھنے سے تعلق ہے۔میں نے اوقات معلوم کیئے تو وہ ایسے تھے کہ بغیر کسی کی مدد کے اس منظر کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

گوروارجن سنگھ کا یہ ہری مندر اب گولڈن ٹمپل ہے۔

گولڈن ٹمپل پر لٹریچر پڑھتے ہوئے مجھے اِس مندر کی حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہی کی داستانوں نے ملول کیا۔بریلیو سٹار آپریشن اور بابری مسجد کی شہادت جیسے واقعات کی یادوں نے تسلی دی کہ انسانی فطرت کا وحشیانہ پن کب اِس فلسفے پر دھیان دیتا ہے کہ جنگی مذاہب تعلیم دیتے ہیں۔فاتح مصر حضرت عمر بن العاص کو خلیفہ وقت حضرت عمر کی جانب سے پیغام ملا تھا کہ ایک بھی درخت نہیں کٹنا چاہیے۔

تو اب جلیانوالہ باغ بھی دیکھنا ضروری تھا۔امرتسر کے شہر میں آپ ہوں اور اِسے نہ دیکھیں کیسے ممکن ہے۔آنٹی کچھ پس وپیش کی کیفیت میں تھیں۔میں نے ہلا شیری دی ذرا حوصلہ، ذرا سی دلیری۔

’’ارے احمد بشیر جیسے جرنلسٹ اور لکھاری کی بیوی آزادی کی اِس عظیم یادگار کو دیکھے بغیر چلی گئیں تو انکی سرفروشی کو بٹہ لگنے والی بات ہوجائے گی۔چلیئے چلیئے۔

تاریخ بھی کیسی ظالم ہے۔دنوں، ہفتوں، سالوں چھوڑ گھنٹوں اور منٹوں کا بھی حساب رکھ لیتی ہے۔واقعات اور شخصیات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔اُسے کوئی

غرض نہیں کون کیسا تھا۔ جنرل ڈائر جیسا ظالم یا غریب ہندوستانیوں جیسے غریب مظلوم لوگ ۔دن تو بہت خوبصورت تھا یوں اسے خوفناک بھی کہا جا سکتا ہے۔

13اپریل 1919۔ بیساکھی کا موسم تھا۔ خوشیوں بھرا ۔کسانوں نے اپنے پھڑولے بھر لیئے تھے اور کچھ ابھی بھر رہے تھے۔ میلے ٹھیلوں کے رنگ آنکھوں میں روشن تھے ۔کیسے یہ رنگ بُجھے ۔بڑی المناک داستان تھی جو جلیانوالہ باغ کے درودیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔

شہدا کی یاد میں جلنے والے شعلے کو دیکھتے ہوئے ماحول پر نگاہ ڈالی ۔دروازے کے ساتھ ہی بورڈوں پر تفصیلات درج تھیں۔اُنہیں پڑھا۔

انڈین گورنمنٹ نے اُس جگہ ایک شاندار کالم بنایا ہے۔جہاں لوگوں کے ایک ہجوم نے آزادی کی جنگ لڑی۔اپنے حق کیلئے آواز بلند کی۔اپنے دیش کی غلامی پر احتجاجی آوازیں اُٹھائیں ۔یہی ان پر گولی چلی تھی ۔یہیں مظلوم لوگوں کا خون بہا تھا۔یہیں تاریخ بنی تھی جسے مجھ جیسی آج دیکھنے آئی تھی۔

دو رویہ درختوں اور آہنی باڑھ میں سے گزر کر وہاں پہنچے۔دیوار پر گولیوں کے واضح نشان دیکھے۔شہدا کا کنوئیں جسمیں چھلانگیں لگائی گئی تھیں۔آزادی کے رہنماؤں کی تصویریں شہدا گیلری میں سجی ہوئی تھیں۔اُدھم سنگھ،بھگت سنگھ جیسے جیالے یہی وہ ہیں جو مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔

یادگار سے نکل کر وہیں ہم نے گرم گرم سموسے کھائے جلیبیوں سے منہ میٹھا کیا۔ واپس آئے تو ہوسٹل ویران پڑا تھا۔

آنٹی تو تھک کر لیٹ گئیں۔پر میں بے چین رُوح ۔نہ لیٹ سکوں نہ کمرے کے یخ بستہ سے ماحول میں بیٹھ سکوں ۔وضعداری پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔گروپ کے لوگ

میرے خیال میں کانفرنس میں تھے۔کھانے پینے کا بھی وہیں انتظام تھا۔انہیں رضائی اوڑھا کر میں نے کچن میں جا کر چائے بنائی۔انہیں پلائی۔انکے خراٹوں کی آواز آئی تو ہوسٹل سے نکل کر مرکزی شاہراہ پر آ گئی۔

سامنے خالصہ کالج تھا۔سرسبز لانوں اور قدیم گیروے رنگی عمارت کے سر پر کھڑا سجا سنورا آنکھوں کو کتنا بھلا لگا تھا۔اندر گئی۔کسی نے روکا نہیں،ٹوکا نہیں۔آگے بڑھتی گئی۔کمروں کو دیکھا۔امرتسر کی خوشبو میں سانس کھینچتی رہی۔

دیر بعد سڑک پر آکر آٹو رکشے پر بیٹھی۔یہ ہمارے ہاں کے چنگ چی جیسا ہی تھا۔آمنے سامنے چھ سواریوں،ہر سٹاپ پر رکنے،سواریاں بٹھانے اور اتارنے والا۔ایک نوجوان لڑکی ایک سٹاپ سے بیٹھی۔کسی ٹیوشن سینٹر میں شاید پڑھنے جارہی تھی۔آگے سٹاپ سے ایک نوجوان لڑکا سوار ہوا۔وہ لڑکی والی سائیڈ پر بیٹھ گیا۔میری آنکھوں میں جیسے سوکن کی سی آنکھ فٹ ہوگئی تھی۔دیکھوں تو سہی ہمسائیوں کے ہاں گھورنے اور چھیڑ خانیوں کی شرح کیا ہے؟مجال ہے جو اُس نے لڑکی پر ٹوٹی پھوٹی بھی نگاہ ڈالی ہو۔دو سٹاپ بعد لڑکا اُتر گیا۔

اب اگلے سٹاپ سے مزید دو افراد ایک لڑکا اور ایک مرد بیٹھے۔عجب بات تھی انہوں نے بھی ہم دونوں کو قطعی توجہ کے قابل نہ سمجھا۔لڑکی اُتری۔بس ریلوے اسٹیشن تک یہی سلسلہ چلا۔بڑی رجی پچی نظریں ہیں ہمسائیوں کے چھوکروں اور مردوں کی۔کہنے کو ہم مسلمان ہیں جنکا مذہب مردوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ہم اپنے مردوں کی آنکھوں کا کیا علاج کریں؟ اُنکا بس چلے تو آنکھوں کی راہوں سے ہی نوخیز بچیوں کو سمولچا نگل جائیں۔

مجھے اب یاد نہیں کہ وہ کونسی جگہ تھی جہاں میں اُتری تھی۔شاید آخری سٹاپ تھا۔یہاں بہت بڑی عوامی مارکیٹ دیکھنے کو ملی۔یہاں لنڈا زوروں پر تھا۔گول گپے اور دہی

بھلے والی ریڑھیوں پر رش تھا۔

لنڈے کو دیکھتے ہی میری تو آنکھوں میں جیسے ستارے ناچ اٹھے۔ کئی ریڑھیوں پر ٹھہری۔ ٹھیٹ پنجابی بولتے ہوئے پھولا پھرولی کی۔ بھاؤ تاؤ کیئے۔ کسی کو بھنک بھی نہ پڑی کہ یہ جو اتنا ٹر ٹر بول رہی ہے۔ سرحد پار کی عورت ہے۔ کئی دکانوں میں گھسی۔

لنڈے نے جب مجھے رجا دیا۔ پھر میں نے پاپڑیاں والے دہی بھلے کھائے۔

حفظان صحت کے اصولوں پر دو حرف لعنت کے بھیجے یہ کہتے ہوئے کہ ارے اِس ہیپا ٹائٹس کے وہم میں اُلجھ کر یہ پاپڑیوں والے دھی بھلّے نہ کھاؤں تو خود پر کتنا ظلم ہوگا؟ یہ تو ایسا ہی ہے کہ بازار جاؤں اور چاٹ کھائے بغیر لوٹ آؤں۔ بھئی یہ نہیں ہوگا۔ اللہ مالک ہے۔ مولا مالک ہے۔ یوں بھی ہم کونسا ہائی فائی قسم کے لوگ ہیں۔ ساری عمر گند بلا ہی کھاتے رہے ہیں۔ چلو شکر ہے اُس کا یہاں تک آ ہی گئے ہیں۔

وہاں سے قریبی مندر میں گئی۔ عبادت کے رونق میلے دیکھے۔ کچھ وقت وہاں گزارا۔

زمانوں سے امرتسر کو دیکھنے، اُسکی ہواؤں کو سونگھنے، اسکے نظاروں کو لوٹنے کیلئے بے تاب تھی۔ سو ہر خواہش گھومتے پھرتے، یہاں وہاں، بیٹھتے اٹھتے پورا کر رہی تھی۔ چیزوں کی قیمتوں سے دونوں ممالک میں مہنگائی کی شرح زیرِ غور تھی۔ حساب کتاب نے مجھے سمجھایا تھا کہ پاکستان مقابلے میں کچھ اتنا مہنگا نہیں۔ چیزوں کا اُتار چڑھاؤ ہر جگہ ہوتا رہتا ہے۔

مغرب کے وقت واپسی ہوئی۔

اگلے دن صبح کا سیشن اٹینڈ کیا۔ اور شام کو پرانے امرتسر کے گلی کوچوں میں گھومتی، اے حمید منٹو اور عطاالحق قاسمی کو یاد کرتی رہی کہ اُنکے گھر کہاں تھے؟

تیسرا دن ہم نے مدھو کے گھر گزارا۔ ریلوائی میں ملازم مدھو اسکا شوہر اسکے دو بچے جنہوں نے ہندو ہونے کے باوجود ہمیں چکن کڑاھی کھلائی اور خود بھی کھائی۔

اگلے دن میں نے اور آنٹی نے میزبانوں سے اجازت لیکر واپسی کی۔ مدھو نے کسی کی گاڑی میں ہمیں اٹاری تک ڈراپ کیا۔ مدھو جیسے محبت کرنے والے لوگ جب بھی یاد آتے ہیں۔ آنکھیں بھگو دیتے ہیں۔

باب نمبر:۵ دلّی میں سارک لٹریچر فیسٹیول

۱۔ اجیت کور کو ہندوستانی اور پاکستانی دونوں پنجابیوں سے سخت شکایت تھی کہ وہ اپنی مادری زبان کیلئے مخلص نہیں۔

۲۔ افغانستان کے مندوبین کے ساتھ خصوصی شفقت بھرا برتاؤ کچھ سیاسی رجحانات کی بھی عکاسی کرتا تھا۔

۳۔ جوگندر پال کو دیکھنا، اُن سے ملنا، اُن سے باتیں کرنا گویا میری ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل تھی۔

چوتھی ہند یاترا مارچ 2011 میں ہوئی۔سارک لٹریچر فیسٹیول کے مہمان بنے۔یہ مہمان جس کی روح ورواں اجیت کور ہے ۔اجیت کور پنجابی ادب کا ایک بڑا نام۔دلّی کی ایک بڑی ادبی شخصیت ۔پاکستان میں اِس تنظیم کے نمائندے لاہور میں عائشہ ذی خان، نثار احمد خان عرف سنی تھے۔اسلام آباد میں احمد سلیم اور فرحین چودھری تھے۔

آجکل تو تین چوتھائی کاموں کی تکمیل انٹرنیٹ پر ہوتی ہے۔دوستوں کا ایک ٹولہ اس بار بھی لسٹ پر یادری کا منتظر تھا۔نیلم اور میرے کاغذات کی خانہ پُری آخری دن ہی ہوئی۔

واہگہ بارڈر پر بہت سارے لوگ تھے۔فیصل آبادیوں کی تو بھار لگی پڑی تھی۔

طاہرا قبال ،انجم سلیمی ،نوعمر شاعرات جن میں ناز فاطمہ نامی خوبصورت لڑکی بڑی نمایاں تھی ۔خوبصورت ،سنجیدہ افسانہ نگار اور ناول نگار طاہرہ اقبال جو حمیرا راحت جیسی پیاری شاعرہ کے ساتھ واہگہ بارڈر پر موجود تھیں ۔طاہرہ فیصل آباد اور حمیرا راحت کراچی سے تشریف لائی تھیں ۔

رخشندہ نوید، نیلم اور میں نے ہنسی ہونٹوں پر بکھیری اور ایک دوسرے سے کہا ''چلو مزہ آئے گا۔''

سنی اونچا لمبا خوبصورت نوجوان ہے جو راہبر کے طور پر سامنے آیا تھا۔مگر سچی بات ہے سلیقے طریقے کا بڑا فقدان نظر آتا تھا۔امرتسر سے دلی کیلئے ٹرین بذریعہ سفر تھا۔اپریل کا مہینہ اے سی کے بغیر کمپارٹمنٹ خاصا گرم مگر وہ جو کہتے ہیں کہ دوزخ بھی ہے قبول اگر یار لوگ ساتھ ہیں کی سچی تفہیم آج سمجھ آئی تھی ۔

طاہرہ اقبال ایک بیوروکریٹ کی بیگم گرمی اور کھڑکی کے راستے آتی گرد وغبار سے کبھی کبھی پریشان ہو اٹھتی ۔

ہم ہنستے ہوئے کہتے ۔''طاہرہ صبر ،صبر بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

گانے گاتے ،گندے مندے لطیفے سُنتے ،سُناتے ،ہنستے کھیلتے رات کے نو بجے دلّی جا پہنچے۔

اسٹیشن پر ساتھیوں کے مختلف ہوٹلوں میں بٹوارے کے بعد ہمارا داخلہ سائیں دھام انٹرنیشنل گیسٹ ہاؤس میں ہوا۔بس ایویں سا تھا۔میں تو کمرے میں جا کر اطمینان سے لم لیٹ ہو گئی ۔

نیلم احمد بشیر میرے خراٹوں سے الرجک رخشندہ نوید کے ساتھ جا جڑی اور گیسٹ

ہاؤس کے منتظمین سے کمرہ بدلنے کیلئے دونوں بحث مباحثہ میں رات گئے تک اُلجھی رہیں۔صبح مجھے تازہ دم کچن کے ڈائننگ ہال میں دیکھ کر نیلم تیکھے اور غصیلے لہجے میں بولی۔

''بڑی فریش لگ رہی ہو۔ہماری تو بک بک جھک جھک کرتے ساری رات گزری ہے۔سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔''

چائے کا کپ میرے ہونٹوں سے چپکا ہوا تھا اور میری ہنستی آنکھیں اُس کے کناروں کے پار سے اُسے دیکھتی تھیں۔

''تو کس نے تمہیں اس سیاپے میں پڑنے کو کہا تھا۔آرام کرتیں۔''

اور وہ چیخی۔

''کمبخت تیرا کیا ہے؟پوستی کہیں کی۔کوڑے کے ڈھیر پر بھی سر رکھے تو پل جھپکتے میں خراٹے گونج اٹھتے ہیں۔کمرے کی دیواروں کا حال دیکھنا تھا۔باتھ روم میں گویا کاکروچوں کی بارات اُتری ہوئی تھی۔''

میرا قہقہ گونجا۔

''چل بھگت پھر۔''یوں میں جانتی تھی نیند اُس کا مسئلہ ہے۔بہر حال فرحین چودھری بہت اچھی روم میٹ ثابت ہوئی تھی۔میٹھے بول بولنے اور تعاون کرنے والی۔اُسے نہ میرے خراٹوں سے کوئی شکایت ہوئی، نہ صبح نور پیر کے ویلے اٹھ جانے سے۔

یہ حوض خاص کا علاقہ تھا۔اِس ریسٹ ہاؤس کے سامنے سری فورٹ آڈیٹوریم تھا۔اور ساتھ چند قدم کی واک پر ہوٹل جہاں کانفرنس کا انعقاد ہو رہا تھا۔

خوبصورت عمارت،خوبصورت ماحول،پھولوں سے لدے پھندے برآمدے۔

نیپالی اور سری لنکن اپنے اپنے ملکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے خاصے پرجوش نظر آئے تھے۔افغانی بھی تھے،بنگلہ دیشی بھی۔بڑا بھرپور سیشن تھا۔سردارنی گرشارن کور مہمان

خصوصی کی نشست پر متمکن تھیں۔

صدارتی خطبہ اور روایتی تقریروں کے مرحلے نپٹے۔ایوارڈز کی تقسیم میں ہماری دلچسپی کا محور جوگندر پال تھے۔جوگندر پال کو دیکھنے کی کتنی تمنا تھی۔چلیے وہ پوری ہوئی۔باتیں واتیں بھی کیں۔چائے پر بہت لوگوں سے ملاقات ہوئی۔اگلے سیشن میں حاضرین کی تعداد گھٹ گئی۔تین دن کی اس کانفرنس کی نمایاں باتیں درج ذیل تھیں۔

افغانستان کا مندوب پرنادنادری جو دراز قد خوبصورت نوجوان تھا۔بنگلہ دیش کی روبینا حق بیس اکیس سال کی دھان پان سی جینز اور ٹی شرٹ میں ہمہ وقت ملبوس اور رمالدیپ کا ابراھیم وحید زیادہ چھائے ہوئے نظر آئے۔خصوصی توجہ کے بھی یہی حقدار تھے۔

البتہ محبت اور پیار کی بانٹ کا جو اظہار و اہتمام افغانیوں کے ساتھ ہو رہا تھا اور جس طرح انتظامیہ کے اہم لوگ انکے آگے پیچھے پھرتے تھے۔وہ کچھ سیاسی رجحانات کی بھی عکاسی کرتے تھے۔

اجیت کور بغیر اُس بڑے بدمعاش کا نام لیے کہ آخر اُسے وسط ایشیا کی ریاستوں میں کیا چاہیے؟ کیوں اُس نے دنیا کا امن داؤ پر لگایا ہوا ہے۔ایسے دکھ بھرے اظہار کی بار بار ادائیگی ان کے اندرونی کرب کو ظاہر کرتی تھی اور یہ سمجھ آتی تھی کہ آخر اِس سے اُنکا مدّعا کیا ہے؟

اُن کے ہاں ایک اور دکھ کا شدید اظہار تھا اور یہ بھی گاہے بگاہے اُن کی زبان سے ادا ہوتا تھا کہ ہندوستان کا مشرقی پنجاب ہی نہیں پاکستان کا پنجاب بھی اپنی مادری زبان کے بارے میں بہت بے حسی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔انگلش میڈیم میں پڑھنے والے بچے اپنی مادری زبان کو صحت کے ساتھ بول ہی نہیں پاتے۔یہاں بے چارے بچوں کی کیا خطا؟ انہیں تو جس راستے پر ڈالا جائے گا انہوں نے اسی پر چلنا ہے۔والدین مادری زبان کو

پر کاہ برابر اہمیت نہیں دیتے ۔ریڑھی بان تک اس خواہش میں مرے جارہے ہیں کہ بچہ فر فر انگریزی بولے، انگریزی پڑھے اور انگریزی میں ہی سوچے۔

یہ ایک لا حاصل سی بحث تھی ۔زبان کی سرپرستی حکومتی سطح پر نہیں ہوگی اور بڑے لوگ اِسے نہیں اپنائیں گے تو یہ یونہی خجل خوار ہوتی رہے گی ۔ہمارے ہاں کے پنجابی دانشور، لکھاری اور شاعر لوگ بھی ایسے ہی خودساختہ اندیشوں اور فکروں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

ہم برصغیر کے لوگ تو یوں بھی دوہرے معیار اپنائے ہوئے ہیں۔تعلیم سے لیکر صحت اور دیگر امور میں امیروں اور غریبوں میں نا قابل یقین حد تک فاصلے حائل رکھنے کے خواہش منداور اس کیلئے ہمہ وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔

پاکستانی مرد لکھاری تو جیسے بس سیر سپاٹوں کیلئے ہی آئے تھے۔علی اکبر ناطق تو کہیں نظر ہی نہیں آتا تھا۔کچھ اس سے کم کم حال اجمل کمال کا تھا جو آڈیٹوریم میں نہیں البتہ برآمدوں میں ضرور دیکھا جاتا تھا۔

یہ کہنا پڑے گا کہ کمپیرنگ کرنے والی شخصیت آلوک بھلّہ کی تھی ۔۔بے حد سمارٹ ،بے حد دلکش اور انگریزی میں رواں اور بذلہ سنج قسم کی ۔اُنہیں سُننے میں لُطف آتا تھا۔مقرر کیلئے بس دس منٹ ضروری تھے پر وہ مقرر ہی کیا جو سٹیج پر چڑھے اور اس پابندی پر عمل پیرا ہو جائے۔

شاعری میں جن موضوعات پر اظہار خیال ہوا۔وہ ٹیگور، فیض اور نذرل اسلام کی شاعری کے حوالوں سے تھا۔اچھے تجزیئے سُننے کو ملے۔بنگلہ دیش کے مسٹر بمل گوہا نے نذرل اسلام اور ٹیگور کی شاعری کے بنیادی فرق پر بات کی۔

یہ موضوع میرے لیے خصوصی دلچسپی کا حامل تھا کہ 1969 اور 70 میں ڈھا کہ

یونیوسٹی کے گرلز ہوسٹل رقیہ ہال میں میری شامیں اکثر و بیشتر پوکھر (تالاب) میں کشتی رانی کرتی لڑکیوں سے ٹیگور اور نذرل کے گیتوں کو سُنتے اور دونوں کی شاعری کے موازنوں میں گزرتی تھیں۔مسلسل اک تواتر کی اس مشق اور تبادلہ خیال کے نتیجے میں مجھے دونوں شاعروں میں فرق کرنا آ گیا تھا۔کہیں ریڈیو پر سُنتے یا ٹی وی پر کسی کو گاتے دیکھ کر میں جان جاتی تھی کہ یہ رابندر وشنگیت ہے۔ ٹیگور کی شاعری میں غنایت اور موسیقی کا ایک دریا سا رواں رہتا ہے۔

نئی شاعرات نے خوب رنگ جمایا۔ایسی خوبصورت شاعری سُننے کو ملی کہ مزہ آ گیا۔اب چشم غزال اور گیسوئے دراز کے علاوہ بھی زندگی اور اس کے طرز سلوک سے متعلق ان گنت موضوعات ہیں۔

برصغیر کے سیاسی اور سماجی ٹکراؤ میں تخلیقی ادب کا ناقدانہ جائزہ، پاکستان سے عائشہ ذی خان نے اس پر جامع مضمون پڑھا۔

گیتوں اور نغموں نے اچھی رونق لگائی۔ہماری نیلم احمد بشیر تو پھر رنگ جمانے میں بڑا امام رکھتی ہیں۔محفل جھومنے لگی۔

کلدیپ نائر کی زیرِ صدارت جس سیشن میں سب سے زیادہ باتیں اور گفتگو ہوئی۔وہ تقسیم میں ہونے والی دہشت گردی اور تشدد کی سیاست تھی۔

کھانے مزے دار تھے۔مقالے معلومات افزا تھے۔بہت لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں جن میں نور ظہیر، جوگندر پال، خواجہ محمد اکرم، اختر واسع، شیخ دہلوی، رخشندہ جلیل وغیرہ۔نور ظہیر سے ملنے کا لطف آیا۔انہوں نے حال میں ہی چھپنے والی اپنی کتاب "میرے حصّے کی روشنی" دی۔

اجیت کور کو بہت اچھی اور سخت منتظم کا کریڈٹ ضرور جاتا ہے۔کامیابی سے اِس

سہ روزہ کانفرنس کو بھگتایا۔ سیر سپاٹے کیلئے صرف ایک دن عنایت ہوا۔ شام کو گاڑی پر چڑھ جانے کا حکم تھا۔

مجھے ڈاکٹر خواجہ اکرام جو نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں سے ملنا تھا۔ سو دوستوں سے اپنا راستہ الگ کیا۔ یونیورسٹی بہت خوبصورت ہے۔ جب ڈپارٹمنٹ پہنچی تو علی اکبر ناطق اور فیصل آباد کی شاعرہ ناز فاطمہ کو بیٹھے دیکھا۔ مختصر سے وقت میں خواجہ صاحب نے طلبہ کے ساتھ ہماری بات چیت کا اہتمام کروایا۔ کھل کر باتیں ہوئیں۔ ہندوستان میں اُردو کے مستقبل پر بحث ہوئی۔ امید افزا باتیں سُننے کو ملیں۔

رکشے میں بیٹھی اور سیدھی مینا محل پہنچی۔ مینا محل میں کھانے پینے کا خاصا اہتمام ہے۔ حلوائیوں کی دکانوں پر ہی ہمہ وقت ہمارے ہاں کی طرح پوریاں بھاجی دستیاب ہوتی ہیں۔ چپو بھر آٹے کی پوریاں پر لُطف آیا۔ سیر ہو کر باہر نکلی۔ شاپنگ میں مجھے صرف شال خریدنی تھی۔ موتی بازار شالوں کی مارکیٹ ہے۔ وہاں کوئی دس کے قریب دوکانوں میں گھسی۔ ڈھیروں ڈھیر شالوں کا پوسٹ مارٹم کیا۔ مجال ہے جو کسی کو بھنک بھی پڑی کہ خیر سے بی بی بیگم پاکستانی ہیں۔ اکیلے گھومنے میں بڑا مزہ آیا۔ بالکل رنگ محل اور کشمیری بازار جیسا ماحول تھا۔

اُردو بازار جانا چاہتی تھی کہ کتابیں دیکھوں اور خریدوں۔ مگر چار بج رہے تھے واپسی کی۔

جب ہم نے گاڑی میں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں خاصی خجل خواری کے بعد اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں اور پرسکون ہوئے تو جن باتوں پر تبصرے کیئے اُن میں سرفہرست پاکستانیوں سے سلوک کچھ کچھ سوتیلوں جیسا ہی تھا۔ اجیت کور کا رویہ بھی امتیازی سا تھا کے ساتھ ساتھ اُن غلطیوں پر بھی حاشیہ آرائی ہوئی جو وفد کے اراکین نے کیں۔ اس میں ایک تو

اُن آپ پھدرے قسم کے فیصل آبادی نوجوانوں کی تھی کہ جنھوں نے افتتاحی سیشن میں مہمان خصوصی کو اپنے جٹ جُتّھے میں گھیر کر چا دراوڑھائی اور نتیجے میں اجیت کور سے جھڑکیاں کھائیں۔

اس پر زوردار بحث ہوئی کہ آخر کرایہ بھاڑا کیوں ادا نہیں کیا گیا۔اندر کی باتیں اللہ جانتا ہے کہ ادا ہی نہیں ہوا یا بیچ کے لوگ کھا پی گئے۔ویسے عجیب سی بات تھی کہ جب بلایا گیا تھا تو کرائے کی ادائیگی لازمی تھی۔سب نے اپنا اپنا کرایہ خود ادا کیا تھا۔

واپس آ کر نیلم نے اس پر بحث مباحثے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔انٹرنیٹ پر جو اعتراض اور باتیں ہوئیں وہ ایک اور دلچسپ اپی سوڈ تھا۔اجمل کمال اس میں سرگرمی سے شامل ہوا۔بہتوں نے اپنا اپنا حصّہ ڈالا۔کہیں سنی زیر بحث آیا کہ وہ کس حسابوں سٹیج پر چڑھا اور سیشن کی صدارت کی۔وہ بزنس مین اُس کا قلم کتاب سے تعلق؟ سنی کو بھی تپ چڑھی۔وہ بھی خم ٹھونک کر میدان میں اُترا۔عائشہ زی خان نے تھوڑی سردی گرمی دکھائی۔طاہرہ اقبال اور حمیرا راحت نے چُپ سادھی اور اچھی رہیں۔ہاں البتہ میرے اور نیلم پر خوب پھٹکار برسی۔

اِس سفر کی ایک اور خوبصورت یاد جو میرے پلّو سے بندھ گئی ہے وہ امرتسر ریلوے اسٹیشن کی ہے۔رات بھر کے سفر کے بعد صُبح سویرے اپنے اٹیچی کیس کے ساتھ پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھنا کس قدر دشوار کام تھا کہ گوڈے اب بیمار شمار رہنے لگے ہیں۔اور پھر صُبح صُبح بغیر چائے پانی کے۔بڑھاپے کی مڈھالی چال سے لیکر صورت تک ہویدا تھی۔جی چاہتا تھا کہ پچیس تیس سیر کا یہ اٹیچی کیس اٹھا کر سامنے ریلوے کی پٹڑیوں پر پھینک دوں اور سبک سر ہو کر سیڑھیاں چڑھتی جاؤں۔

تبھی میری پشت سے ایک ہاتھ آیا اور اس نے اٹیچی کیس میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ کیسا لمحہ تھا؟ بس لگا جیسے میرا بیٹا کہیں سے آیا اور اپنی ماں کو پھول کی طرح ہلکا کر دیا۔

جیتا رہے وہ۔ سلامت رہے وہ جس کا نام اجمل کمال ہے۔

سلمٰی اعوان

0301-4038180

www.salmawam.com

انڈیا کا سفرنامہ

چوتھی ہند یاترا مارچ 2011 میں ہوئی۔سارک لٹریچر فیسٹیول کے مہمان بنے۔یہ مہمان جس کی روح وروان اجیت کور ہے ۔اجیت کورپنجابی ادب کا ایک بڑا نام۔پاکستان میں اِس تنظیم کے نمائندے لاہور میں عائشہ ذی خان،نثار احمد خان سنی،اسلام آباد میں احمد سلیم فرحین چودہری۔اب تو تین چوتھائی کاموں کی تکمیل انٹرنیٹ پر ہوتی ہے۔دوستوں کا ایک ٹولہ اس بار بھی لسٹ پر یاوری کا منتظر تھا۔نیلم اور میرے کاغذات کی خانہ پُری آخری دن ہی ہوئی۔واہگہ بارڈر پر طاہرہ اقبال فیصل آباد اورحمیرا راحت کراچی سے ساتھ تھیں۔رخشندہ نوید، نیلم اور میں نے ہنسی ہونٹوں پر بکھیری۔اور ایک دوسرے سے کہا کہ چلومزہ آئے گا۔

سنی اونچا لمبا خوبصورت نوجوان تھا۔جوراہبر کے طور پر سامنے آیا تھا۔مگر سلیقے طریقے کا بڑا فقدان نظر آتا تھا۔امرتسر سے دلی کیلئے ٹرین بذریعہ سفر تھا۔اپریل کا مہینہ اے سی کے بغیر کمپارٹمنٹ ۔اُس محاورے کہ دوزخ بھی ہے قبول اگر یار لوگ ساتھ ہیں کی سچی ماہیت اب سمجھ آئی تھی۔گانے گاتے،گندے لطیفے سُناتے،ہنستے کھیلتے رات کے نو بجے دلّی جا پہنچے۔

اسٹیشن پر بٹوارے کے بعد سائیں دھام انٹرنیشنل گیسٹ ہاؤس آئے۔بس ایویں ساتھا۔میں تو کمرے میں جا کر اطمینان سے لم لیٹ ہوگئی۔نیلم احمد بشیر میرے خراٹوں سے الرجک رخشندہ نوید کے ساتھ جاجڑی اور گیسٹ ہاؤس کے منتظمین سے کمرہ بدلنے کیلئے بحث مباحثے میں رات گئے تک اُلجھی رہی۔صبح مجھے تازہ دم کچن کے ڈائننگ ہال میں دیکھ کر غصّے سے بولی۔بک بک جھک جھک کرتے رات گزری۔سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔

چائے کا کپ میرے ہونٹوں سے چپکا ہوا تھا اور میری ہنستی آنکھیں اُس کے کناروں کے پار سے اُسے دیکھتی تھیں ۔فرحین چودہری بہت اچھی روم میٹ ثابت ہوئی تھی ۔

یہ حوض خاص کا علاقہ تھا ۔اِس ریسٹ ہاؤس کے سامنے سری فورٹ آڈیٹوریم تھا ۔اور ساتھ چند قدم کی واک پراجیت کا قائم کردہ
جہاں کانفرنس کا انعقاد ہو رہا تھا ۔

خوبصورت عمارت ،خوبصورت ماحول پھولوں سے لدا پھندا ۔نیپالی اور سری لنکن اپنے ملکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے خاصے پر جوش نظر آئے تھے ۔افغانی بھی تھے ۔بنگلہ دیشی بھی ۔بڑا بھرپور سیشن تھا ۔سردارنی گرشارن کور مہمان خصوصی کی نشست پر متمکن ہوئیں ۔

روایتی تقریریں صدارتی خطبہ ہوا ۔ایوارڈز کی تقسیم اور پھر چائے ۔اگلے سیشن میں حاضرین کی تعداد گھٹ گئی ۔تین دن کی اس کانفرنس کی نمایاں باتیں بس درج ذیل تھیں ۔

افغانستان کا مندوبین پرتاونادری جواونچا لمبا خوبصورت نوجوان تھا ۔بنگلہ دیش کی روبینا حق بیس اکیس سال کی دھان پان سی جینز اور ٹی شرٹ میں ہمہ وقت ملبوس اور مالدیپ کا ابراھیم وحید زیادہ نظر آئے ۔خصوصی توجہ کے بھی یہی حقدار تھے ۔ہاں البتہ جو اہتمام افغانیوں کے ساتھ ہو رہا تھا وہ کچھ سیاسی رجحانات کے عکاس تھے ۔پاکستانی مرد لکھاری تو جیسے بس سیر سپاٹوں کیلئے ہی آئے تھے ۔علی اکبر ناطق تو کہیں نظر ہی نہیں آتا تھا ۔کچھ اس سے کم کم حال اجمل کمال کا تھا جو آڈیٹوریم میں نہیں البتہ برآمدوں میں ضرور نظر آتا تھا ۔یہ کہنا پڑے گا کہ کمپرنگ والی شخصیت آلوک بھلّہ کی تھی ۔۔بے حد سمارٹ ،بے

حد دلکش اور انگریزی میں رواں اور بذلہ سنج ۔انہیں سُننے میں لُطف آتا تھا۔مقرر کیلئے دس منٹ ضروری تھا پروہ مقرر ہی کیا جوسٹیج پر چڑھے اور اس پابندی پرعمل پیرا ہوجائے ۔

شاعری میں جن موضوعات پر اظہار خیال ہوا ۔وہ ٹیگور،فیض اور نذرل اسلام کی شاعری کے حوالوں سے تھا ۔اچھے تجزیے سُننے کو ملے ۔بنگلہ دیش کے سٹر بمل کوہانے نذرل اسلام اور ٹیگور کی شاعری کے بنیادی فرق پر بات کی ۔یہ موضوع میرے لیے خصوصی دلچسپی کا حامل تھا کہ 1969 اور 70 میں ڈھاکہ یونیوسٹی کے گرلز ہوسٹل رقیہ ہال میں میری شامیں اکثر و بیشتر پوکھر(تالاب)میں کشتی رانی کرتی لڑکیوں سے ٹیگور اور نذرل کے گیتوں کو سُنتے ہوئے گزری تھیں۔مسلسل اک تواتر کی اس مشق اور تبادلہ خیال کے نتیجے میں مجھے دونوں شاعروں میں فرق کرنا آگیا تھا۔ٹیگور کی شاعری میں غنایت اور موسیقی کا ایک دریا سا رواں رہتا تھا۔

برصغیر کے سیاسی اور سماجی ٹکراؤ میں تخلیقی ادب کا ناقدانہ جائزے پاکستان سے عائشہ ذی خان نے اس پر جامع مضمون پڑھا۔

گیتوں اور نغموں نے اچھی رونق لگائی ۔ہماری نیلم احمد بشیر تو پھر رنگ جمانے میں بڑا نام رکھتی ہیں ۔محفل جھومنے لگی۔

کلدیپ نائر کی زیرصدارت جس سیشن میں سب سے زیادہ باتیں اور گفتگو ہوئی ۔تقسیم میں ہونے والی دہشت گردی، voilence کی سیاست ۔

کھانے مزے دار تھے ۔مقالے معلومات افزا تھے ۔بہت لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں جن میں نورظہیر، جوگندر پال،خواجہ محمد اکرم،اختر واسع، شیخ دہلوی، رخشندہ جلیل سے ملنا تھا۔

پاکستانیوں کوتھوڑی سی شکایت بھی رہی کہ انہیں اہمیت کم ملی ۔ اجیت کور کا رویہ کچھ

امتیازی سا تھا۔

کرایہ بھاڑا بھی ادا نہیں کیا گیا۔اندر کی باتیں اللہ جانتا ہے کہ ادا ہی نہیں ہوا یا بیچ کے لوگ کھا پی گئے۔ویسے عجیب سی بات تھی کہ جب بلایا گیا تھا تو کرائے کی ادائیگی لازمی تھی۔واپس آ کر نیلم نے اس پر ایک بحث مباحثے کا سا سماں باندھ دیا تھا۔انٹرنیٹ پر جو اعتراض اور باتیں ہوئیں وہ بھی ایک دلچسپ

لیجئے بھگواڑا آ گیا۔گاڑی میں اُبھرتی آواز نے بے اختیار ہی ہونٹوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا کہ کچھ یاد آیا تھا۔کسی انڈین چینل پر تھرکتا شور مچاتا ایک اشتہار جو بھگواڑہ کی بنی ہوئی ساڑھی سے متعلق تھا۔سارے پنڈ وچ پہ گیا ساڑا (سارے گاؤں نے جلنا اور حسد کرنا شروع کر دیا جونہی میں نے بھگواڑہ کی ساڑھی پہنی)۔

چندی گڑھ انڈیا کے شمالی حصہ میں پنجاب اور ہریانہ کا کیپٹل سٹی فرانسیسی، ماہر تعمیر لئی کوربیسر Le. Corbusier کا ڈیزائن کردہ شاہکار۔ہریالیوں میں گھرا پھولوں میں ہنستا اشجار میں سے مسکراتا اور اپنی چھب دکھلاتا۔اپنے اسلام آباد جیسا تاثر دیتا۔ایک خوبصورت شہر گل لالہ سے سماپیشوائی کر رہا تھا۔تھکن تو ساری اُڑنچھو ہو گئی تھی۔شوالک دیو ہوٹل شوالک پر بت مالا جیسا حُسن لیئے ہوا تھا۔خوبصورت ٹی وی لاؤنج میں ہی بتا دیا تھا کہ تیار ہو کر نیچے آنا ہے۔کہ دیو سماج کالج میں وفد کے اعزاز میں تقریب تھی۔استقبالیہ کیسا رنگا رنگ تھا۔ڈھول کی تھاپ تھی۔دل کش اور من موہنی لڑکے لڑکیوں نے رنگوں کی برسات میں جو رقص کیا اُسنے مسحور کیا۔کالج کے آڈیٹوریم کی سٹیج پر پنجاب کے وزیر اعظم شری ہرنام داس جوہر کالج کی پرنسپل مسز ڈھلوں اور پٹیالہ یونیورسٹی کے رجسٹرار پرم بخشیش سنگھ فخر زماں کے

ساتھ بیٹھے خوب سج رہے تھے ۔برقی روشنیوں میں نوخیز بچیاں بھی بڑی دلکش لگتی تھیں ۔وزیر تعلیم کی تقریر میں بڑا والہانہ پن تھا ۔اچھا لگا اگر اچھا نہیں لگا تو اُس نوخیز بچی کا انداز گفتگو جو بڑے میٹھے لہجے میں سوال کرتی تھی کہ ایک کلچر ایک جیسی ریتل اور ایک جیسی وسیب کے ہوتے ہوئے بھلا الگ ہونے کی کوئی ضرورت تھی ۔کچھ اسی سے ملتا جلتا انداز وزیر تعلیم کا تھا۔ جو ہمیں بھارتی پنجاب کے اناج کا گھر ہونے کا مژدہ سُناتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ویزہ کی پابندیاں نرم ہونی چاہئے تاکہ جب اور جس وقت پاکستانی پنجاب کے لوگ بے شک سائیکلوں پر امرتسر آئیں اور گندم کے توڑے اپنے کیئریئر پر رکھ کر لے جائیں ۔پاکستانی تو ان کی گندم لے جائیں اور ہندوستانی لاہور سے کیا لے کر آئیں اسکا کہیں ذکر نہیں تھا۔افضال شاہد مرحوم کا ایک گیت بو ہے کھول دیو جسے شوکت نے کمپوز کیا تھا ۔سُنوایا گیا ۔بہر حال اعزاز احمد آذر نے سٹیج پر آ کر ہمارے اندر کے مچلتے جذبات کو زبان دی کہ سرحدیں تو اب بن گئی ہیں ۔سلامتی امن قائم کرنے اور اچھے ہمسائیوں جیسے تعلقات رکھنے میں ہے ۔چلو شکر کوئی تو کلمہ حق بولا ۔کلچر شو دیکھا اور واپسی ہوئی ۔

میں بہت سویرے اُٹھنے کی عادی ہوں نماز سے فارغ ہو کر باہر نکل آئی ۔چندی گڑھ اسلام آباد سے بہت ملتا جلتا شہر ہے ۔

نو بجے سے بارہ تک تقاریر تجاویز کی بھرمار سُنی ۔دونوں ملکوں کی فوج اور بیوروکریسی ویزہ پالیسیاں نرم کرنے کی راہ میں مائل تھیں ۔یقیناً دونوں کے مفادات تھے ۔

سیما اور میں راک گارڈن دیکھنے کے لئے مری جا رہی تھیں ۔جونہی لنچ سے فارغ ہوئے اور سیر سپاٹے کے لئے گاڑی لی بگٹٹ اس کی طرف بھاگے ۔نک چند کا عظیم الشان کارنامہ 1924ء پیدا ہونے اور ایک متوسط کسان برادری تعلقات رکھنے والے نک چند سینی جسنے اٹھارہ سال کی عمر میں میٹرک کیا ۔جسکا گاؤں لاہور سے کوئی چھپن میل پر بریاں

کلان تھا۔ 1947ء کی تقسیم میں نقل مکانی ہوئی او رجب شوالک سلسلہ ہائے کوہ کے دامن میں چندی گڑھ شہر بسانے کا فیصلہ ہوا اُسے چندی گڑھ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ میں روڈ انسپکٹر کی نوکری مل گئی سچ تو تھا کہ وہ پہاڑوں اور فطرت کی خوبصورتیوں سے سحر زدہ تھا۔

مرکزی دروازے پر رُک گئے تھے۔سنگِ مرمر کی تختی پر لکھے ہوئے کو پڑھنے کیلئے۔

اس عظیم کارنامے کا ۷ جولائی 1988ء کو افتتاح ہوا تھا۔ایک سادہ عام سے انسان کا عظیم کارنامہ ایک دیسی بندے کا تخلیقی شاہکار جس کی دھوم دنیا میں مچی تھی۔ پستہ قامت دروازوں کا ایک سلسلہ تھا۔قدرے جھک کر ایلس ان ونڈر لینڈ کی طرح ایک نئی دنیا سامنے آتی تھی ۔یہ پستہ قامتی کیا قصداً اپنائی گئی تھی کہ انسان کو عاجزی انکساری اور حلیمی کا درس دینا بھی نک چند کا موٹو تھا کہ وہ بذات خود ایسا ہی ہے۔

ہر پل ایک نئی دنیا میں داخل ہوتے ہوئے میں سوچتی تھی کہ نک چند ایک خود ساختہ فنکار ہیں ۔ایک خیال پرست مصور جسنے اپنی تخلیقات کو روپ دیا ۔نا کارہ اور دھتکاری ہوئی چیزوں سے مگر ضروری تفصیلات جن میں نفاست اور باریک بینی آتی ہیں انہیں اپنانے سے انکار کر دیا۔

سائیکلوں کے ناکارہ حصے،ٹوٹی ہوئی چوڑیوں ،بلب ،ٹیوبیں ،بوتلوں کے ڈھکن ،ٹوٹی پیالیوں ،ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتن ،جلی ہوئی اینٹوں ،نائیوں کی دوکانوں کے باہر پھینکے ہوئے بال اِس جگہ پر بنے گاؤں کو مسمار کرتے اور رنئے خوبصورت شہر کی تعمیر کے دوران فالتو سامان سیمنٹ پتھر جنہیں وہ اپنی سائیکل پر جتنوں سے لادتا اور اِس خفیہ جگہ پر جو تب ایک جنگل تھی لاتا

اِس جگہ پر اُسکا آنا بھی ایک معجزہ ہی تھا۔کام کے دوران وہ اِس مضافاتی جگہ پر

آنکلا تھا۔ پرسکون درختوں اور سبزے گھری آبشاروں سے کبھی نیلے چمکتے آسمان کی رعنائیوں بھری چھت سے ڈھپی اُس جیسے مذہبی آدمی کو بھگوان ہی متحد روپ میں نظر آیا تھا۔ یوں بھی چندی گڑھ کی تعمیر نے اُن سب لوگوں کو جو یہاں کاشت کار تھے جو یہاں رہتے تھے۔ نئے شہر نے انہیں بے گھر کردیا تھا۔ انکے بین اور آہوں نے اُسے بھی متاثر کیا تھا۔ اُس نے خود بھی دربدری کا مزہ چکھا تھا۔ یہاں اُسے سکون ملا تھا۔

اب یوں ہوا۔ وہ کام سے فارغ ہوتا۔ سائیکل کے پیڈلوں سے کشتی کرتا یہاں آجاتا۔ تا کا رہ ٹائی جلاتا اور انکی روشنی میں کام کرتا رہتا حتیٰ کہ صبح ہوجاتی۔ اُس کے لیے یہ کام ایک عبادت تھی اور یہ جگہ مقدس ترین۔ آغاز میں یہاں اُس نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنائی جو ایک ندی کے کنارے تھی۔ نہ اُسے جنگل کے مچھروں کا ڈر نہ اُسے سانپوں کا ڈر............ اور نہ اُسے جنگل کے بھیڑیے اژدھوں کا کوئی احساس۔ وہ مجسمے بناتا جاتا۔ اپنے تصور کی سرزمین سے نکال کر انہیں حقیقی دنیا میں لاتا۔ جانوروں، پرندوں انسانوں کے مجسمے انکے چہروں پر اپنے ذہن کے مطابق احساسات بکھیرتا جاتا۔ ہر ایک دوسرے سے مختلف، تاثرات میں منفرد، قدرت کے عناصر، تبدیلی کے نمائندہ، پانی، جانور، پرندے سب اُسکے تخلیقی دوست تھے۔ ایک جہان تخلیق ہورہا تھا۔ دنیا سے چوری چُھپے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ راز فاش ہوگیا۔ گورنمنٹ کی ایک سروے ٹیم اتفاقیہ اِس طرف آنکلی۔ ٹیم کے افراد گنگ کھڑے اِس رنگ و بو کو دیکھتے تھے۔ جسکی خوبصورتی اور حُسن نے انہیں سحر زدہ کردیا تھا۔

جیسا کہ نک چند نے کہا۔ میں نے ہر وہ شے استعمال کی جسے لوگوں نے پھینک دیا تھا۔ دھاگہ اُدھڑے کپڑے جو کسی کے لیے کسی دلچسپی اور کام کے نہیں تھے۔ مگر وہ میرے لیئے تھے۔ کپڑوں سے بنی یہ گدھے گھوڑے، بہت مظبوط ہیں۔ آپ کو نیچے نہیں گرائیں گے۔

نواب ایک شادی میں جاتے ہوئے جب اُسے لیبر میسر آ گئی تو اُسنے ایک بڑا مجسمہ تین چار دنوں میں مکمل کیا۔

دیوتاؤں اور دیویوں کی سلطنت۔میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا جو اسوقت میرے سامنے ہے۔یہ صرف میرے ہاتھ ہیں۔شاید میری چیزیں کھیتی باڑی سے جڑی ہوئی تھیں۔میں ایک کسان تھا۔جو ہل چلاتا ،بیج بوتا اور پھر اسمیں پھول پھل نکلتے دیکھنے کا آرزو مند تھا۔

ایک دیہاتی اپنی بھینس کا دودھ دوہتا۔

میں چاہتاہوں لوگ خود کو محفوظ کریں۔اور انہیں کرتا جاری رکھیں۔حتیٰ کہ جب میں زندہ نہ ہوں کسی بھی موقع پر راک گارڈن مجھے زندہ رکھے گا۔

نک چند ایک ایسا پروڈیوسر نہیں جسنے آلات کو بیچنے کے لیے بنایا یا کسی مصرف کیلئے تخلیق کیا۔اُس کی زندگی اور تخلیق کا مقصد بہت روحانی تھا۔وہ ایک سادہ لوح ،بہت مذہبی اور عاجز سا انسان ہے۔اُسے اپنے آرٹ پر اپنے فن پر بات کرنے کا تو کوئی شوق ہی نہیں نہ وقت نہ شوق۔وہ ابھی بھی اپنے کام میں مصروف ہے اسی سال کی عمر میں بھی۔

کھوج کیا پتہ چلا ایک سادہ سے عاجز سے بندے کا عظیم کام۔

''یہ غیر قانونی حرکت ہے''

گورنمنٹ کی زمین پر ناجائز طور پر قبضہ کیا ہوا ہے۔اِسے مسمار کر دینا چاہیے۔بعض سازشی اور حاسد چلاّئے تھے۔

لیکن بھگوان سے پیار کرنے والے اُسے اپنے من میں بسانے والے کی مدد خود بھگوان نے کی کہ بیچ میں سے ہی اُسکے حامی لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے نہ صرف اُسے بلا شیری

دی بلکہ ہر سہولت بھی مہیا کی۔

حاسدی بیوروکریٹ، سازشی وکلاءاُسے عدالت میں بھی گھسیٹ کر لے گئے ۔مگر وہ جیتا اُسکا عزم جیتا، اُسکی لگن جیتی اُسکی کاوشیں سرخرو ہوئیں ۔اُس نے دنیا کو بتا دیا کہ نا کارہ چیزیں کارآمد ہوسکتی ہیں ۔اور یہی اُسکا آرٹ ہے کہ اُسکا کہنا ہے کہ قدرت تو خود اِس پرعمل پیرا ہے تو اِنسان کیوں نہ ہو۔

نک چند سے پہلی ملاقات میں مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ اگر اپنے اندر کی وجدانی، الہامی اور روحانی قوتوں اور جزبوں سے متاثر تھے تو وہیں ایسی سلطنت بھی کہیں اُنکے خوابوں میں تھی ۔جسے انہوں نے ڈیزائن کیا۔راک گارڈن تین فیز میں منقسم ہے اور ہر فیز مختلف وقتوں میں مکمل ہوا۔ہر فیز کا خاکہ اُنکے دماغ میں تھا۔اُنکے دل میں تھا۔اُنکی رگ و پے میں اُترا ہوا تھا جسے انہوں نے جزبوں کی بلندیوں سے دیکھا۔مسرتوں اور حیرتوں کے حصار میں لے کر اُسکا احاطہ کردیا۔کچھ چیمبرز میں بادشاہ کی عدالت کے منظر ہیں ۔ملکہ کے محل کا کمپلیکس۔موسیقاروں کیلئے انکے فن کی ادائیگی کیلئے خوبصورت جگہ۔اور اس کے ساتھ ساتھ دیہائی زندگی کے منظر۔

فیز اول اور دوم زیادہ تر بھُول بھلیوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔پستہ قامت دروازے ایک کے بعد ایک نئی دنیا میں کھلتے اور آپ پر ایک نیا جہاں کھولتے ہیں ۔شوخ رنگوں سے جھلملاتے آراستہ پیراستہ بلند و بالا دیواروں میں گھرے چہروں پر مختلف تاثرات کی دنیا بکھیرے آپ کو داستانیں سناتے ملتے ہیں ۔ایک سے دوسرے تنگ تنگ راستے ٹیڑھی میڑھی صورتوں میں پراسرار سے انداز میں خود مڑتے اور آپ کو موڑتے کبھی اُوپر چڑھاتے کبھی نیچے اُتارتے چلے جاتے ہیں ۔یہی تنگنائیاں پھر آپکو ایک کشادہ جگہ لے جاتی ہیں جہاں ایک بڑی آبشار آپ کے ہونٹوں کو متحرک کرتے ہوئے کہتی ہے واہ۔ایک فسوں

ایک خوشگوار حیرت، ایک اسرار، ایک تجسس آپکے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

فیز سوم باغ کا سب سے زیادہ شائقین کیلئے دلچسپ حصّہ ہے کہ اسمیں کوئی پچاس کے قریب دیوہیکل قسم کی سیمنٹ کی بنی ہوئی محرابیں ہیں اور ہر محراب میں ایک بڑا فیملی سائز جھولا ہے۔ جسے دیکھتے ہی کیا بچے کیا بوڑھے کیا عورتیں اور مہاجر بے چین و بے تاب ہو اُٹھتے ہیں اور شاعر کے الفاظ میں غزل اُسنے چھیڑی مجھے ساز دینا کی تصویریں

سکھنا جھیل پر میں نے بڑا دلچسپ وقت گزارا۔ میں اور سیما بہت دیرا سکے پانیوں کو دیکھتے ناریل پیتے لوگوں سے باتیں کرتی رہیں۔ جو اپنے بچوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اسکی ساحت کیلئے آئے ہوئے تھے۔ تین مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی یہ جھیل بھی چندی گڑھ کے شہریوں کیلئے ایک تحفے سے کم نہیں۔

ہلکے ہلکے ہلکوروں میں بہتے پانی جسپر گرتی سورج کی دھوپ اس پر چلتی کشتیاں اُن میں بیٹھے لوگ جنکے چہرے خوشیوں اور مسرتوں سے گلال ہوئے پڑتے تھے۔ چاندنی راتوں میں اسکا حُسن کیسا مدہوش کن ہوگا۔ میں نے سوچا اور تصور کیا۔

اگلے دن شملہ جانے کا پروگرام تھا ہماچل پردیش کا کیپٹل۔ مری کا بھائی کہہ لیجیے۔ سبھوں نے کہا تھا۔ مری جیسا ہی ہے۔ مگر راستہ بہت ٹیڑھا میڑھا ہے۔ بہت بل دار ہے۔ پل پل کے زگ زیگ میں اُلجھا ہوا۔ بندہ پہاڑی راستوں کا عادی نہ ہو تو اُسکا حشر ہو جاتا ہے۔ مگر صنوبر، دیودار اور چیڑ کے درختوں کے دامنوں میں ایک ڈھلوانی ترتیب میں بکھرے دومنزلہ سہ منزلہ گھروں کی رنگین برسات نے سفر کی ساری کلفت کو دور کر دیا۔ آنکھیں مسلسل انہیں دیکھتے گھورتے مسحور ہوتی رہیں۔ شملہ ایک اہم حوالے سے ہر پاکستانی کیلئے مانوس ہے۔ کہ پاکستانیوں کا محبوب لیڈر اپنے محصور فوجیوں کی رہائی کیلئے مسز گاندھی سے ملنے شملہ

آیا تھا۔

شملے کو صرف ہاتھ لگانے والی بات ہوئی۔مال پر گھومتے گھومتے ہی لنچ برگروں کی صورت کیا۔ثروت کی فخر زماں سے بحث سُنی کہ جو شملے میں رات گزارنے کیلئے بضد تھی۔ہم اسکی تائید کرتے تھے کہ ہاں نہ ہم کوئی برگر کھانے تو شملہ نہیں آئے۔مگر وہاں انکار تھا۔ٹاؤن ہال دیکھا۔سڑکوں کو ایک دوسرے سے ملانے کیلئے لفٹیں ہیں۔

انڈین ایڈوانس سٹڈیز کی عمارت کو ٹھک طرز تعمیر کی خوبصورت اور پر وقار عمارت جو کبھی وائسرے رج تھی۔

شملہ کالجوں، سکولوں اور ریسرچ اداروں کیلئے خصوصی شہرت رکھتا ہے۔یہاں مندروں اور گرجاؤں کی بھی کثرت ہے۔شاید کوئی مسجد بھی ہو مجھے نظر نہیں آئی۔

ہمالیہ کے جنوب مغربی سلسلے کی پہاڑیوں میں شملہ استنبول اوم اور روم، استنبول کی طرح یہ بھی سات پہاڑیوں کی چوٹیوں پر تعمیر ہوا ہے۔ٹاؤن ہال کا اعلان ہوا۔گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شاندار ہوٹلوں کے ظاہری روپ دیکھے۔

شملہ میں بچھی ریلوے لائن دیکھ کر دُکھ ہوا۔میرے ملک میں تو ریلوے کا جو حشر ہوا۔ٹرانسپورٹ مافیا کے چکروں اور خود غرضیوں نے جو کھیل کھیلا انکی تفصیل بہت ہی گھناؤنی ہے۔جو ریلوے کے ملازموں نے اِس سے محبت نہیں کی اور اسے اُجاڑ دیا۔

اگلے دن امرتسر کیلئے روانگی تھی۔استقبال بی بی کے ڈی رے وی کالج کی پرنسپل مسز جے کاکڑیا اور انکے عملے نے کیا۔

لنچ کے بعد شام کا سیکشن ٹورزم اینڈ ڈویلپمینٹ کے اعتبار سے بہت اہم تھا۔

پروفیسر درباری رل جو خود ایک ماہر تعلیم ہیں۔اُن دنوں پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر

تھے۔اِس سیمینار میں جوبات میرے سامنے کھل کر آئی وہ ہندوستان کی سیاحت کے حوالے سے آگاہی اور شعور تھا۔مسز کاکڑیا نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ہمارے لیے آپ لوگوں کا پنجاب آپ لوگوں کے مکے مدینے کی طرح ہے۔آج مذہبی سیاحت صنعت کا درجہ اختیار کرگئی ہے۔اِجدید تقاضوں کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ایک طرح یہ سیمینار پاک بھارت دوستی کا مظاہرہ بن گیا۔فخر زماں نے اپنے خطاب میں ٹورسٹ ویزہ کے اجرا کی تجویز پیش کی۔انہوں نے سکھوں کے مذہبی مقامات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ راج کٹاس کا بھی ذکر کیا۔جسے اب زیارت گاہ بنایا جارہا ہے۔انہوں نے نفرتوں کی سیاست چھوڑ کر محبتوں کے راستے اپنانے پر زور دیا۔

کلچرل شو بہت خوبصورت تھا۔مسز کاکڑیا کی بیٹی بیڑول کاکڑیا نوعمری کے باوجود بہت اچھی فنکارہ تھی۔مزہ آیا کھانا شاندار تھا۔ہندو اور سکھ مزے سے چکن کھا رہے تھے۔

کل سہ پہر دلی کے لئے روانگی تھی۔شتہ بدی سے سفر کرنا تھا۔ٹرین کا سفر مجھے ہمیشہ بڑا اہانٹ کرتا ہے۔صبح گولڈن ٹمپل گئے۔جلیانوالہ باغ دیکھا۔بازار بھی گئے مگر میں نے کچھ نہیں خریدا کسی نے کہا تھا کہ واپسی پر امرتسر ٹھہرنا ہے۔چلو پھر دیکھوں گی۔شتابدی کیا مزے کی گاڑی تھی۔ٹرین کا سفر اور وہ بھی دوستوں کے ساتھ۔ساتھ افضال شاہد جیسے ہنس مکھ اور مجلسی بندے کا ساتھ۔گاڑی کسی پتی ورتا قسم کی خاتون جیسی تھی جو شوہر کے دل میں اُترنے کیلئے اُسکے معدے میں سے گزرنا پسند کرتی ہے۔شتابدی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ابھی امرتسر سے نکلے ہی تھے۔گرما گرم چھوٹے چھوٹے سموسے،چارے،کافی اور رس گلے آگئے۔اُن سے دو دو ہاتھ کیئے۔جالندھر،لدھیانہ اور پانی پت گزرے تو کھانا آگیا۔تینوں شہروں نے دل و دماغ میں ہیجان سے پیدا کیا۔لدھیانہ ڈاکٹر کیول دھیر جیسے پیارے انسان کا شہر ہے۔پانی پت جنگوں کے اعتبار سے کبھی نہیں بھولتا کہ انہیں یاد کرنے کیلئے

گھوٹے رگانے پڑتے تھے۔دلی کا ریلوے اسٹیشن کی وسعت اور گاڑیوں کے اژدہام نے حیرت میں ڈالے رکھا۔دلی آنے کی کتنی تمنا تھی۔آج دلی سامنے تھی۔رات تھی۔کہیں اجنبیت نہیں تھی۔ایک جیسا ماحول،زبان کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔وہی اُردو تیرے کو میرے کو بولا جا رہا تھا۔کرول باغ میں پال ریجنسی ہوٹل پہنچے۔درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔مگر دلی جیسے شہر میں ایسا ہوٹل ملنا بھی غنیمت تھی۔میں اور سیما حسبِ معمول اکٹھی تھیں۔گاڑیوں کا انتظام تھا۔میں اور سیما نے ایک گاڑی کو قابو کیا اور نکل بھاگیں۔

یہ میری ہند کیلئے تیسری یاترا تھی اور یہ بھی مفت میں تھی۔امرتسر کی ایک بڑی سماجی اور رفاحی شخصیت ہربھجن سنگھ برار جو میاں میر فاؤنڈیشن امرتسر کے سرگرم اور فعال ممبر ہیں۔حضرت میاں میر صاحب کے حوالے سے ایک پروگرام کر رہے تھے۔ لاہور سے کوئی دس بارہ اور پنجاب سے چالیس کے قریب لوگ مدعو تھے۔مزے کی بات کہ نیلم احمد بشیر کو ویزہ نہیں ملا۔ان کی والدہ مودی بشیر کو مل گیا۔دوست اور وہ بھی نیلم جیسی کے ساتھ سفر کا اپنا ہی مزہ۔سیماں بھی نہیں جا رہی تھی۔سوچا کہ نہ جاؤں۔مگر نیلم کا اصرار۔امی جانا چاہتی ہے۔پلیز تم چلی جاؤ۔مجھے تسلی رہے گی۔"تمہیں تسلی رہے گی اور میں کیا کروں گی"۔ میں ہنسی۔تم سیوا کرنا ماسی کی۔سُنی نہیں وہ حدیث ماں نہ ہو تو ماسی کا دم غنیمت سمجھو۔اسکے انداز میں ہمیشہ والا لاابالی پن تھا۔

واہگہ بارڈر پر میں خوشی و مسرت اور دُکھ و تاسف کی دونوں کیفیات سے یکے بعد دیگرے دوچار ہوئی تھی۔نئی نکور لشکارے مارتی کسٹم امیگریشن کی عمارت دیکھ کر رگ رگ میں طمانیت و سرشاری کی لہروں نے رقص کیا تھا۔جتنی بار بھی ہندوستان گئی پاکستانی کسٹم کی پڑی ہوئی سی جیسی عمارت نے تکلیف دی تھی۔چلو خدا کا شکر ہے۔پر جونہی کرنسی ایکسچینج والوں نے سو کے بدلے 58 روپے ہاتھوں میں تھمائے تو جیسے جھٹکا کھا کر تڑپنے والی بات تھی۔75 سے 58 پر آ گئے ہیں۔"یا اللہ کہاں جا رہے ہم" دُکھ جیسے اندر ہی اندر کھولتے پانی

کی طرح پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ اٹاری بارڈر پر لوگ گاڑیاں اور گیندے کے ہار لیئے استقبال
کو موجود تھے۔ ڈھول والے بھی تھے۔ ڈھول والوں کی صحبت میں آگے بڑھے۔ گاڑیوں
میں بیٹھے اور پولیس کی چھتر چھاؤں میں سفر شروع ہوا۔

سردیوں کے دن تھے اور امرتسر کی سڑک کے دونوں اطراف میں گندم کے کھیتوں
نے تا حدِ نظر گویا سرسبز قالین بچھا رکھے ہوں۔ دل نے تسلی دی گھبراؤ نہیں خوش ہونا
سیکھو۔ تمہاری طرف بھی ایسے ہی لش پش ہوگی۔

خفت کا سا احساس ہوا۔ کیا کریں۔ ہندوستان سے مقابلے بازی نہیں جاتی۔

قیام یار ہوسٹل میں ہوا۔ جو خالصہ کالج اور پبلک سکول کے بالمقابل امرتسر کی
ایک مضافاتی کالونی میں تھا۔

ہوسٹل کے ٹھنڈے کمرے میں اور آنٹی ایک کمرے میں۔ کمبل تھے اور
رضائیاں بھی۔ مگر ٹھٹھرنے والی بات تھی۔ ہم لوگ ہیٹروں کے عادی ہیں۔ سردی کو ماننے
زیادہ لگے تھے تاہم یہ بھی بات تھی کہ بوڑھے ہو رہے تھے اور بڑھاپے میں سردی گرمی
دونوں زیادہ محسوس ہوتی ہیں۔ خدا جانے میزبانوں
کے پروگرام کیا تھے۔ عفت علوی سے پوچھا۔ اُس نے کندھے اُچکائے۔ سرنفی میں ہلایا کہ
ابھی تو وہ بھی کچھ نہیں جانتی۔ سوچا دفع کرو انہیں۔ چپکے سے اپنی سیر پر نکل چلو گولڈن ٹمپل بھی
ابھی تک دیکھا نہیں۔ گرنتھ صاحب کی باپناں موسیقی کے پروں پر سوار سارے میں بکھر کر
فسوں کی سی کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ ہری مندر کو جانے والے راستے پر اگر زائرین کی کثرت
تھی تو واپسی کا راستہ بھی اٹا پڑا تھا۔ پانیوں پر تیرتے یہ راستے دل کش نظر آتے تھے۔ بڑا
فسوں خیزی والا ماحول تھا۔ ناشتہ چائے پراٹھے والا تھا۔ پراٹھا تو تھوڑا
تھوڑا لیا۔ ہاں چائے پی اور ہم دونوں نکل پڑیں۔ سائیکل رکشے پر جیسے آنٹی کو بٹھایا گیا۔ اُس

کا کریڈٹ مجھ سے زیادہ رکشے والے کو تھا کہ وہ منحنی سا ہونے کے باوجود اندر سے بڑا مظبوط تھا ۔یا شاید تکنیکی مہارت حاصل کیئے ہوئے تھا ۔اُترائی بھی ایسے ہی ہوگئی ۔ایک عظیم الشان عبادت گاہ ہمارے سامنے تھی ۔گورونانک جیسی عظیم روحانی اور دینوی علم سے مالا مال ہستی کے پیروکاروں کا مرکز عبادت ۔

موجودہ امرتسر زمانوں پہلے ایک گھنا جنگل تھا ایک بڑا تالاب بھی اسمیں تھا۔ روایت ہے کہ کہیں لارڈبُدھا یہاں سے گزرے اور کچھ وقت یہاں ٹھہرے ۔ماحول دیکھ کر انہوں نے کہا یہ تو بدھ بھکشوؤں کے نروان کیلئے بہترین جگہ ہے ۔گورونانک بھی کچھ عرصہ یہاں رہے ۔

کہہ لیجیئے کہ ایشیا کی عبادت گاہوں وہی درگاہوں خانقاہوں ،والا مخصوص ماحول تھا ۔امرتسر کے بازاری سلسلے دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے ۔سویرے سویرے ہی زائرین کی کثرت نے میلے کا سا سماں پیدا کر رکھا تھا ۔عبادت گاہ کی بڑی خوبی رضاکارانہ کام کرنے والوں کی بھی تھی ۔صفائی ستھرائی انتہا درجے کی ۔جوتیاں رکھنے ،پرشاد کے برتنوں کی صفائی جیسے سب کام جذبوں اور عقیدتوں کے مرہون منت تھے ۔ٹمپل میں داخلے سے قبل اُس شفاف بہتے پانی میں پاؤں دھونے پڑتے ہیں جو ایک اتھلے سے نالے کی صورت بہتا ہے ۔گزرگاہ کے ساتھ ہی مرکز ہی سکھ میوزیم ہے ۔جسے دیکھے بغیر ہم آگے بڑھ گئے تھے ۔صبح خوشگوار
میٹھی سی سونے رنگی دھوپ ۔

ایک وسیع وعریض تالاب میں ہلکورے لیتا سبزی مائل پانی جسکے بیچوں بیچ کھڑی ایک حسین عمارت اور اسکے گنبدیوں لشکارے مارتے تھے کہ جیسے سارے میں سونا ہی سونا بکھرا ہوا ہو ۔اطراف میں دودھیا عمارتوں کے سلسلے پانیوں میں اپنے عکس چھوڑتے تھے ۔

پورا ماحول ایک الوہی سکون اور تقدس کے رنگ میں ڈوبا پڑا تھا۔پوجا پاٹھ کا عمل جاری تھا۔لوگوں میں نظم وضبط تھا۔سونے کے گنبد تلے گرنتھ پاٹھ کو تھوڑی دیر سنتے اور دوسری جانب سے نکل جاتے۔

میں نے آنٹی سے لنگر کھانے کا پوچھا۔میرا تو پراٹھا ابھی سینے پر دھرا ہے۔تھوڑا سا پرشاد کھالیں گے۔

گولڈن ٹمپل میں اکال تخت کی عمارت بڑی اہم سمجھی جاتی ہے کہ یہاں ایک شاندار رکنوبی جوہیرے جواہرات سے سجی ہوئی ہے۔گرنتھ صاحب سکھوں کی مذہبی کتاب اسی اکال تخت میں رکھی جاتی ہے۔جسے مہرزور منہ اندھیرے خوبصورت پالکی میں عقیدتوں اور محبتوں کے جلو میں یہاں لایا جاتا ہے۔شام کو اسی طرح سے اکال تخت لے جاتا ہے۔اِس رسم کا بھی دیکھنے سے تعلق ہے۔

گوروارجن سنگھ کے اس مندر کو ہری مندر کہا جاتا تھا۔اب یہ گولڈن ٹمپل ہے۔

گولڈن ٹمپل پر لٹریچر پڑھتے ہوئے مجھے اِس مندر کی مغل حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہی کی داستانوں نے ملول کیا۔پربلیوسٹار آپریشن اور بابری مسجد کی شہادت جیسے واقعات کی یادوں نے تسلی دی کہ انسانی فطرت ایسی ہی خباثتوں والی ہے۔شہر میں اُتھرنے کیلئے مری جاتی ہے۔اُس فلسفے سے منکر ہو جاتی ہے جسکی مذاہب اُسے تعلیم دیتے ہیں۔

تو اب جلیانوالہ باغ بھی دیکھنا ضروری تھا۔امرتسر کے شہر میں آپ ہوں اور اِسے نہ دیکھیں کیسے ممکن ہے۔آنٹی کچھ پس وپیش کی کیفیت میں تھیں۔میں نے ہلا شیری دی تھیں۔تاریخ بھی کیسی ظالم ہے۔دنوں،ہفتوں،سالوں چھوڑ گھنٹوں اور منٹوں کا بھی حساب رکھ لیتی ہے۔واقعات اور شخصیات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔اُسے کوئی غرض نہیں جنرل ڈائیر جیسا تھا۔دن تو وہ بہت خوبصورت تھا یا اسے خوفناک بھی کہا جاسکتا ہے۔

13 اپریل 1919 ۔کوئی مہربان تھا ۔ہمدرد اور غم گسار تھا۔کوئی ظالم تھا۔جابر تھا۔بیساکھی کا موسم تھا۔خوشیوں بھرا۔کسانوں نے اپنے پھڑولے بھر لیئے تھے اور کچھ بھرا رہے تھے ۔میلے ٹھیلوں کے رنگ آنکھوں میں روشن تھے ۔کیسے یہ رنگ بُجھے ۔بڑی المناک داستان تھی جو جلیانوالہ باغ کے درو دیوار پر پھیلی ہوئی تھی ۔

شہدا کی یاد میں جلنے والے شعلے کو دیکھتے ہوئے ماحول پر نگاہ ڈالی۔دروازے کے ساتھ ہی بورڈوں پر تفصیلات درج تھیں۔اُنہیں پڑھا۔انڈین گورنمنٹ نے اُس جگہ ایک شاندار کالم بنایا ہے۔جہاں لوگوں کے ایک ہجوم نے آزادی کی جنگ لڑی۔اپنے حق کیلئے آواز بلند کی۔اپنے دیش کی غلامی پر احتجاجی آوازیں اُٹھائیں۔یہی ان پر گولی چلی تھی ۔یہیں مظلوم لوگوں کا خون بہا تھا۔یہیں تاریخ بنی تھی جسے مجھ جیسی آج دیکھنے آئی تھی ۔دورویہ درختوں اور آہنی باڑھ میں سے گزر کر وہاں پہنچے ۔دیوار پر گولیوں کے نشانات دیکھے ۔شہدا کا کنوئیں جسمیں چھلانگیں لگادی تھیں ۔آزادی کے رہنماؤں کی تصویریں شہدا گیلری میں سجی ہوئی تھیں ۔اُدھم سنگھ ،بھگت سنگھ جیسے جیالے یہی وہ ہیں جو مر کر بھی زندہ رہتے ہیں ۔

وہ تو تھک کر لیٹ گئیں ۔پر میں بے چین رُوح ۔نہ لیٹ سکوں نہ کمرے کے یخ بستہ سے ماحول میں بیٹھ سکوں ۔وضعداری پاؤں پکڑے بیٹھی تھی ۔گروپ کے لوگ میرے خیال میں کانفرنس میں تھے ۔کھانے پینے کا بھی وہیں انتظام تھا۔انہیں رضائی اوڑھا کر میں نے کچن میں جا کر چائے بنوائی انہیں پلائی اور پھر باہر نکلی ۔

ہوسٹل سے نکلی تو مرکزی شاہراہ پر آگئی ۔سامنے خالصہ کالج تھا۔سرسبز لانوں اور قدیم گیروے رنگی عمارت کے سر پر کھڑا سجا سنورا آنکھوں کو کتنا بھلا لگا تھا۔اندر گئی ۔کسی نے

روکا نہیں ٹوکا نہیں ۔آگے بڑھتی گئی ۔کمروں کو دیکھا۔امرتسر کی خوشبو میں سانس کھینچتی رہی ۔پھر سڑک پر آ کر آٹو رکشے پر بیٹھی ۔یہ ہمارے ہاں کے چنگ چی جیسا ہی تھا۔آمنے سامنے چھ سواریوں والا۔سٹاپ پر رکنے سواریاں بٹھانے اور اتارنے والا۔ایک نوجوان لڑکی ایک سٹاپ سے بیٹھی ۔کسی ٹیوشن سینٹر پر پڑھنے جارہی تھی ۔آگے سٹاپ سے ایک نوجوان لڑکا سوار ہوا۔وہ لڑکی والی سائیڈ پر بیٹھ گیا ۔میری آنکھوں میں جیسے سوکن کی سی آ مکھ فٹ ہوگئی تھی ۔دیکھوں تو سہی ہمسائیوں کے ہاں گھورنے اور چھیڑخانیوں کی شرح کیا ہے؟مجال ہے جو اُس نے لڑکی پر ٹوٹی پھوٹی بھی نگاہ ڈالی ہو۔دو سٹاپ بعد لڑکا اُتر گیا اور وہاں سے مزید دو فرد ایک لڑکا اور ایک مرد بیٹھے ۔عجب بات تھی انہوں نے بھی ہم دونوں کو قطعی توجہ کے قابل نہ سمجھا ۔لڑکی اُتری ۔بس ریلوے اسٹیشن تک یہی سلسلہ چلا۔بڑی رجی پچی نظریں ہیں ہمسائیوں کے چھوکروں اور مردوں کی ۔کہنے کو ہم مسلمان ہیں جنکا مذہب مردوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیتا ہے ۔مگر ہمارے مردوں کی آنکھوں کا اگر پتا چلے تو وہ صنف نازک کو سمولچا نگل جائیں۔

مجھے اب یاد نہیں کہ وہ کونسی جگہ تھی جہاں میں اُتری ۔بہت بڑی عوامی مارکیٹ ۔لنڈا زوروں پر ۔کول گپے اور دہی بھلے والی ریڑیوں پر رش ۔لنڈے کو دیکھتے ہی میری تو آنکھوں میں جیسے ستارے ناچ اٹھے ۔کئی ریڑیوں پر ٹھہری ۔کئی دو کانوں میں گھسی ۔لنڈے نے جب مجھے رجا دیا ۔پھر میں پاپڑیاں والے دہی بھلے کھائے ۔حفظان صحت کے اصولوں کو لعنت بھیجو دفع کرو جیسے خطابوں سے نوازا ۔زمانوں سے امرتسر کو دیکھنے اُسکی ہواؤں کو سونگھنے اسکے نظاروں کو لوٹنے کیلئے بے تاب تھی ۔اب یہ پاپڑیوں والے دہی بھلے بھی نہ کھاؤں ۔کچھ نہیں ہوتا ۔ہم کونسا ہائی فائی قسم کے لوگ ہیں ۔ساری عمر گند بلا ہی کھاتے رہے ہیں ۔وہاں ایک مندر میں گئی ۔کچھ وقت وہاں گزارا۔

مغرب کے وقت واپسی ہوئی۔

اگلے دن صبح کا سیشن اٹینڈ کیا۔اور شام کو پرانے امرتسر کے گلی کوچوں میں گھومتی
اور اے حمید منٹو اور عطاالحق کو یاد کرتی رہی کہ اُنکے گھر کہاں تھے؟

تیسر دن ہم نے مدھو کے گھر گزارا۔ریلوائی میں ملازم مدھو اسکا شوہر اسکے دو بچے
جنہوں نے ہندو ہونے کے باوجود ہمیں چکن کڑاھی کھلائی اور خود بھی کھائی۔اگلے دن میں
نے اور آنٹی نے میز بانوں سے اجازت لیکر واپسی کی۔مدھو نے کسی کی گاڑی میں ہمیں
اٹاری تک ڈراپ کیا۔مدھو جیسے محبت کرنے والے لوگ جب بھی یاد آتے ہیں۔
آنکھیں بھگو دیتے ہیں۔